# خاموشی جُرم ہے

محمد حنیف خان

محمد حنیف خان کی تحریریں پڑھ کے مجھے از حد خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ خاص طور سے اس لئے کہ ان کی تحریروں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جو وہ لکھتے ہیں اعتماد سے، سمجھ کر اور حسن تحریر کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ عبارت پرکشش بھی ہوتی ہے لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قصداً پرکشش بنانے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ از خود ان کے قلم سے اسی طرح نکلتی ہے جو قدرتی لگتی ہے، یہ خوبی بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے اور یہ اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب لکھتے وقت اس بات کا احساس رہے کہ ہماری تحریر اس لئے بھی پڑھی جائے کہ اس سے معلومات کے علاوہ لذت کا بھی احساس ہو۔ ابھی حال ہی میں ان کا افسانوی مجموعہ "مجسموں کا شہر" منظر عام پر آیا ہے، اس پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ضرورت ہے کہ اس میں بعض افسانے چونکا دینے والے ہیں، اس سے یہ احساس جاں گزیں ہوتا ہے کہ لکھنے والا تحریر کی اہمیت اور تخلیق کا مقصد پیش نظر رکھ کر ہی قلم چلاتا ہے۔ یہ خوبی آج کل کے لوگوں میں بالکل نہیں پائی جاتی ہے۔

**احمد ابراہیم علوی**

سابق ایڈیٹر روزنامہ "آگ" لکھنؤ

وقتاً فوقتاً لکھے جانے والے مضامین کے مجموعے کی اشاعت خوش آئند ہے، زیادہ تر مضامین میری نظر سے گذر چکے ہیں، محمد حنیف خان کے یہ مضامین اس لئے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں دنیا جہان کی معلومات کے ساتھ ہی صالح وصحت مند فکر نمایاں ہے۔ ان کے مضامین میں دور جدید کے فکری رجحانات پر واضح رد عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ جمہوریت اور ملک کی سالمیت ان کے پیش نظر رہتی ہے، آئین کی بالادستی اور انسانوں کے بنیادی حقوق پر کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ متعدد مضامین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور سرسید کی تحریک کے حوالے سے ہیں، وہ قوم کی فلاح تعلیم میں دیکھتے ہیں اور یہی سرسید کا مطمح نظر بھی تھا۔

**پروفیسر محمد علی جوہر**

صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ محمد حنیف خان کو نہ صرف ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کا واضح ادراک ہے بلکہ ان کے ذہن میں صحافت اور سیاست کے تئیں ادیب کی ذمہ داری کا بھی نقش موجود ہے، اردو صحافت کی تاریخ مولانا آزاد، ظفر علی خان، سعید ملیح آبادی، عثمان فارقلیط، حیات اللہ انصاری، عشرت علی صدیقی اور خواجہ باقی جیسے ناموں سے عبارت ہے ان بزرگوں نے جس طرح اردو صحافت کو باثروت کیا اور دنیا کی بڑی زبانوں کی صحافت سے آنکھیں ملانے کے قابل بنایا۔ حالیہ اردو صحافت اسی کا عطایا ہے۔ محمد حنیف خاں کے مضامین اسی تابندہ سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ (پیش لفظ سے ماخوذ)

**ڈاکٹر خالد علوی**

ذاکر حسین کالج (دہلی یونیورسٹی)

# خاموشی جرم ہے

(دوٹوک/ سیاسی وسماجی مضامین)

# خاموشی جرم ہے

(دوٹوک/ سیاسی وسماجی مضامین)

محمد حنیف خان



ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

**KHAMOSHI JURM HAI**

**by**

**Mohammed Haneef Khan**

**Year of Edition 2020**

**ISBN 978-93-90100-45-3**

**Price Rs. 400/-**

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | خاموشی جرم ہے |
| مصنف | : | محمد حنیف خان |
| قیمت | : | 400روپے |
| سن اشاعت | : | 2020 |
| صفحات | : | 275 |
| تعداد | : | 500 |
| مطبع | : | روشان پرنٹرس، دہلی۔٦ |
| سرورق | : | طارق عزیز، لاہور (پاکستان) |
| رابطہ | : | کمرہ نمبر 71، سرسید ہال، ساؤتھ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ |
| مستقل پتہ | : | پھلوریا معافی، پوسٹ بھوپت پور چوکی، ضلع بہرائچ (یوپی) |
| موبائل نمبر | : | 09359989581 |
| ای میل | : | haneef5758@gmail.com |

***Published by***

**EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE**

**H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002(INDIA)**

**B.o.3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)**

**Ph : 45678285, 45678286, 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540**

**E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com**

**website: www.ephbooks.com**

# انتساب

استاد محترم

مولانا محمد سلیم ندوی

کہ دی ہے میرے قلم کو گویائی

میرے کرم فرما

پروفیسر بدر الدجیٰ خاں کے نام

جن کی کرم فرمائیوں کا کوئی شمار نہیں

اور

اس قاری کے نام جسے ہر سنیچر کی صبح انتظار رہتا تھا

# فہرست

## دستاویز

# پیش لفظ

مجھے بہت خوشی ہے کہ محمد حنیف خان کے سیاسی وسماجی مضامین کا مجموعہ ''خاموشی جرم ہے'' زیور طبع سے آراستہ ہو رہا ہے۔ محمد حنیف خاں بنیادی طور سے ایک افسانہ نگار ہیں اور ان کا افسانوی مجموعے بھی شائع ہو چکا ہے اس لئے ادب اور صحافت کے تعلق سے ان کی فہم ہم سنوں اور ہم عصروں میں کافی بہتر اور نمایاں ہے۔ بظاہر اخباری اور صحافیانہ مضامین لکھنا بہت آسان ہے ہے لیکن حقیقت میں تازہ موضوعات پر اظہار خیال کرنا توازن اور بلوغت کا مطالبہ کرتا ہے سیاست اور ہنگامی حالات ہر ذہن و دل پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں، اس صورتحال میں میں تمام واقعات و حادثات کو مخصوص فاصلے سے دیکھ کر کر اظہار خیال کرنا اور عدم توازن کا شکار نہ ہونا، بڑی کامیابی ہے۔

اردو صحافت کی تاریخ، ہندوستانی صحافت کا ایک زریں باب ہے اردو صحافت کو یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس کے صحافی مولانا باقر کو اپنی حق گوئی کے لیے جان کی قربانی دینی پڑی تھی۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ محمد حنیف خان کو نہ صرف ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کا واضح ادراک ہے بلکہ ان کے ذہن میں صحافت اور سیاست کے تئیں ادیب کی ذمہ داری کا بھی نقش موجود ہے، اردو صحافت کی تاریخ مولانا آزاد، ظفر علی خان، سعید ملیح آبادی، عثمان فارقلیط، حیات اللہ انصاری، عشرت علی صدیقی اور خواجہ باقی جیسے ناموں سے عبارت ہے ان بزرگوں نے جس طرح

اردو صحافت کو باثروت کیا اور دنیا کی بڑی زبانوں کی صحافت سے آنکھیں ملانے کے قابل بنایا۔ حالیہ اردو صحافت اسی کا عطایا ہے۔ محمد حنیف خاں کے مضامین اسی تابندہ سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ کہ اگر انہوں نے اسی طرح کھلی آنکھوں کے ساتھ ساتھ یہ ریاضت جاری رکھی تو ان کا نام بھی ملک کے ذمہ دار صحافیوں میں لیا جائے گا۔

ان کے کچھ مضامین میں جو میری نظر سے گزرے ہیں ان میں مجھے ایک ادبی چاشنی بھی محسوس ہوئی'' فکری پسماندگی اور تحریک سر سید کی معنویت، سازشوں بھرا حب الوطنی کا نیا بیانیہ، قیام امن کے نام پر انسانیت کی پامالی، ملک میں میں نسل پرستی اور نسلی امتیاز'' ایسے مضامین ہیں جن سے محمد حنیف خان کی انسان دوستی اور ملکی سیاست پر ان کے احساسات کا ادراک ہوتا ہے اور وہ صاف الفاظ اور موثر انداز میں اپنی بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ آج کل اردو اخبارات زبان و بیان کی طرف سے جس طرح بے نیازی کا رویہ اپنا رہے ہیں وہ اس کا حصہ نہیں بنیں گے اور زبان پر خصوصی توجہ دیتے رہیں گے انگلش یا دوسری زبانوں کے ان الفاظ سے گریز لازم رکھیں گے جن کے بہتر متبادل اردو میں موجود ہیں میں ''خاموشی جرم ہے'' کی اشاعت پر ان کو مبارکباد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر خالد علوی

ذاکر حسین کالج (دہلی یونیورسٹی)

# پیش گفتار

قلم اس صوتی گویائی سے بھی بڑھ کر ہے جس میں چیخ وپکار ہوتی ہے،آواز ہوا میں تحلیل ہوجاتی ہے لیکن تحریر زندہ رہتی ہے۔یہ تحریر ہی انسان کی زندگی کی علامت ہے۔اس میں تاریخ بھی محفوظ ہوتی اور تہذیب بھی۔خود کو زندہ رکھنا ہے،قوم کو زندگی دینا ہے،تہذیب اور تاریخ کو زندہ رکھنا ہے تو لکھنا ضروری ہے۔آواز بہت دور تک نہیں جاسکتی،اس کی طاقت محدود ہے لیکن اگر لکھتے ہیں تو اس کی طاقت بھی لامحدود ہے اور رسائی بھی۔ماضی میں کھڑے ہوکر مستقبل کو آوز دے سکتے ہیں،جیسے ہم کوئی تحریر پڑھ کر ماضی میں جی لیتے ہیں۔یہ صرف آواز دینا اور جینا نہیں ہے بلکہ ماضی کا حال سے اور حال کا استقبال سے انضمام وادغام ہے۔اگر ہماری زندگی کی مشعل کو ماضی سے روشنی ملتی ہے تو آنے والی نسلوں کو ہمارے حال سے روشنی ملے گی،اس لئے بھی لکھنا ضروری ہے۔یوں بھی ظلم کے خلاف خاموشی جرم ہے اور آج مسلمانوں سے زیادہ کون مظلوم ہے؟

آج کی اس ٹیکنالوجی کے دور میں اب جنگیں تلواروں،توپوں اور ٹینکوں سے بہت بعد میں لڑی جاتی ہیں،اس کا سب سے پہلا میدان یہ قلم ہے،جو قومیں یہاں شکست سے دوچار ہوجاتی ہیں ان کیلئے دوسرے میدان میں جگہ ہی نہیں ہوتی۔فکری ترفع اور پسماندگی اسی قلم سے وابستہ ہے،جس کے بغیر نہ تو ذہن سازی کی جاسکتی ہے اور نہ ہی ذہنی تربیت۔یہاں اقدامی رہنا ہے دفاعی نہیں ،کیونکہ دفاع کرنے والے لوگ اکثر شکست سے دوچار ہوتے ہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد 20 کروڑ سے زیادہ ہے۔اس کے باوجود قومی سطح پر ان کے پاس کوئی میڈیا ہاؤس نہیں ہے۔ایسے میں کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ ان سے متعلق درست خبریں سامنے آئیں گی۔آج ہندستان بلکہ دنیا میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کا ایک سب سے بڑا سبب ان کے پاس میڈیا ہاؤس اور خبر رساں ایجنسیوں کی کمی ہے۔عرب ممالک میں اگر میڈیا ہاؤس ہیں تو ان کے پاس خبر رساں ایجنسیاں نہیں ہیں جس کی وجہ سے درست خبروں تک رسائی نہیں ہوپاتی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ میڈیا ہاؤس اور خبر رسان ایجنسیوں کے

ساتھ ایسے صحافی بھی پیدا کئے جائیں جو سچی خبریوں کی ترسیل میں یقین رکھتے ہوں، جن میں حال سے استقبال کا اندازہ لگانے کی صلاحیت ہو۔ یہی وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اس بدنما داغ کو مٹا دیں جو میڈیا نے ہمارے چہروں پر لگایا ہے۔ ظالم کا پنجہ نہیں مروڑ سکتے لیکن چیخ تو سکتے ہیں؟ اس لئے ظلم پر چیخئے چلائے، دوسروں کو متوجہ کریئے، یہ بھی زندگی کی علامت ہے، خاموش نہ رہئے، کیونکہ خاموشی جرم بھی ہے اور خود پر ظلم بھی، اس لئے خاموش نہیں رہنا ہے، جو جس جگہ ہے، وہاں سے آواز بلند کرنا ہے۔

''خاموشی جرم ہے'' میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو میں اپریل 2019 سے جون 2020 تک بطور ہفتہ وار کالم شائع ہوئے۔ ان میں بعض مضامین روزنامہ ''آگ''، لکھنؤ میں بھی شائع ہوئے۔ ان مضامین میں بیشتر کا تعلق سیاست اور سماجی امور سے ہے۔ صحافت کا کام چونکہ صرف توصیف نہیں ہے بلکہ حقائق سے آگاہ کرنا ہے، درپیش خطرات کا ادراک کرانا ہے، کوشش اسی بات کی کی گئی ہے، حالات و واقعات کا غیر جانبدارانہ محاکمہ کیا جائے، اس لئے ان مضامین میں ان فکری دھاروں کی نشاندہی پر خصوصی طور توجہ مرتکز کی گئی ہے جن کی وجہ سے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔

آخر میں اپنے والدین اور بھائیوں کا شکریہ ادا کرنا اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ انہوں نے مجھے ہر طرح کی ذمہ داریوں سے فارغ رکھا ہے جس کی وجہ سے میں آزادانہ طور پر کچھ لکھ پا رہا ہوں۔ مشرف عالم ذوقی صاحب جتنے اچھے افسانہ نگار ہیں اتنے ہی وہ صاحب نظر صحافی بھی ہیں، ان کے لئے اظہار تشکر کے میرے پاس الفاظ نہیں، بس اتنا کہوں گا کہ خورد نوازی میں ان کی وسیع القلبی کا کوئی کنارہ نہیں۔ صدر شعبہ ترسیل عامہ اور استاد محترم پروفیسر شافع قدوائی صاحب نے ہمیشہ رہنمائی کی، جس کے لئے میں دل کی گہرائیوں سے ممنون و مشکور ہوں۔

میرے سپروائزر استاد محترم پروفیسر محمد علی جوہر صاحب کی عنایتوں اور مشوروں کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا تھا، انہوں نے ہمیشہ نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ افسانوی مجموعہ ''مجسموں کا شہر'' کے

ساتھ ہی اس کتاب کے لئے بھی فلیپ لکھا جس کے لئے تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ ڈاکٹر خالد علوی صاحب جن سے میری ابھی تک کوئی ملاقات نہیں لیکن اخبارات میں ان کی تحریروں کے قدیم وجدید کے حسین امتزاج نے متاثر کیا۔ فلیپ کے لئے اپنا قیمتی وقت صرف کیا جس کے لئے شکریہ نہ ادا کرنا کفران نعمت میں شمار ہوگا۔ روزنامہ "آگ" لکھنو کے سابق مدیر احمد ابراہیم علوی صاحب جہاں بیباک صحافی اور مدیر ہیں، وہیں ان کی خدمت میں رہ کر تقریباً چار برس تک صحافت کی بنیادی باتیں سیکھنے کا موقع ملا، جن کا شکر گذار ہوں۔ کسی بھی کتاب کا سرورق اس کے ظاہری حسن کا اہم سبب ہوتا ہے، میری کتاب کو خوبصورت سرورق دینے والے طارق عزیز صاحب (لاہور۔ پاکستان) کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنو کے سابق یونٹ ہیڈ اور روزنامہ عوامی سالار کے مدیر قطب اللہ صاحب کی محبتوں اور عنایتوں کے ساتھ ان کی معیت کا کوئی بدل نہیں، اسی اخبار کے سرپرست محترم ظفریاب جیلانی اور مالک محترم مسعود جیلانی کا ہمیشہ دست شفقت رہا، تہہ دل سے مشکور ہوں۔ روزنامہ "آگ" کے موجودہ مدیر ڈاکٹر اکبر علی صاحب سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور ان کی حوصلہ افزائی نے ہمیشہ اگلا قدم پانی میں رکھنے کی ہمت دی، صحافتی لفظیات سے لے کر اہم امور تک ان سے تبادلہ خیال خوشگوار تجربہ رہا ہے، جس کے لئے صمیم قلب سے ان کا شکر گذار ہوں۔ شعبہ اردو کے استاد اور میرے کرم فرما ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی صاحب سے ہر وقت کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، ان کے مشورے نہایت کارآمد ہوتے ہیں۔ راشٹریہ سہارا کے موجودہ مدیر اسماعیل ظفر خان اور اس سے وابستہ جناب فخر عالم صاحب، جناب خاور حسن صاحب اور محترمہ زرین خان صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح میرے دوست اور کلاس فیلو کے ساتھ دفتر کے ساتھی محمد ارقم، رضی الدین اور احسان الحق، ندوۃ العلما لکھنو سے علی گڑھ تک کے ساتھی محمد عمران اور محمد ثاقب، احسن ایوبی وغیرہ کے علاوہ ساتھ میں پی ایچ ڈی کرنے والے دوست واحباب جن کی ایک کثیر تعداد ہے ان سب کے حوصلہ افزا کلمات بھی میرے لئے بہت اہم ثابت ہوئے۔ ان سبھی دوستوں کا بھی شکر گذار ہوں۔

محمد حنیف خان

روم نمبر 71، سرسید ہال (جنوبی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

# ''نیوانڈیا میں'' تاریکی کا شکار بچوں کا مستقبل

''عوام آپ کے قصیدے گا رہے ہیں، ملک میں شہد اور دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں، قیمتیں گر رہی ہیں، آبادی کم ہو رہی ہے، لوگوں کی رگوں میں جانثاری کا وہ جذبہ ہے کہ ہر ریاست سے لوگ اپنی جان حکومت پر نثار کرنے کے لئے اپنے بھیجے نذر کے لئے لا رہے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ایسا منظر انسانی تاریخ نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ عوام نے کبھی کسی شہنشاہ کو اتنا پیار نہیں دیا۔ بے مثال، انوکھا، بے نظیر''۔ (ضحاک)

یہی حالت آج ہندستان کی ہے، بس فرق اتنا ہے کہ ضحاک سے نوشابہ نے جب دلائل کے ساتھ یہ بات کہی تھی تب اس کو یقین آیا تھا لیکن یہاں شاہ وقت خود یہی مانے ہوئے ہے کہ ہر طرف دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں، ہر طرف اجالا ہے، ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ جب روشنی زیادہ تیز ہوتی ہے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں جس میں سامنے کی چیزیں بھی نہیں دکھائی دیتی ہیں، حکومت کو نیوانڈیا کے 'وکاس' کی روشنی میں وہ بچے نہیں دکھائی دیتے ہیں جو اس کی نگرانی میں چلنے والے اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔ بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں، اگر ان کی زندگی تاریکی کا شکار ہو جائے تو ملک و قوم کا مستقبل تاریکی کا شکار ہو جائے گا۔ ہندستان نے یوں تو آزادی کے بعد سے اندھیرے سے اجالے کی طرف سفر شروع کر دیا تھا لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ سفر اسی کی دہائی کے بعد سے تیزی کے ساتھ شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم ایسے دور میں آ گئے جب ہندستان دنیا کے نقشے پر نہ صرف ترقی پذیر ملک کے طور پر سامنے آ گیا بلکہ اس کے 'وشو گرو' بننے کا بھی خواب دیکھا جانے لگا۔ 2014 میں مرکز میں گجرات کے وزیر اعلی نریندر مودی کی قیادت میں بھاجپا کی حکومت بنی تھی تو بلند بانگ دعوے کئے گئے تھے، یہ سب جانتے

ہیں کہ بھاجپا ترقی کے معاملے کو لے کر ہی الیکشن کے میدان میں آئی تھی اور اسی کو مسئلہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا تھا، اس نے کچھ اس طرح سے خود کو پیش کیا تھا گویا اس کے پاس ہر درد کا درماں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام نے اس پر بھروسہ کیا اور اکثریت کے ساتھ وہ اقتدار میں آ گئی۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے ہر موقع پر دعویٰ کیا کہ ان کی حکومت سماج کے ہر طبقے کے لئے کام کر رہی ہے۔ وزیر اعظم نے بڑے طمطراق کے ساتھ دین دیال اپادھیائے گرام جیوتی یوجنا شروع کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ اب کوئی گاؤں اندھیرے میں نہیں رہے گا، ہر طرف اجالا ہی اجالا ہوگا۔ پھر انہوں نے لال قلعے کی فصیل سے اعلان کیا کہ ہندستان کے ہر گاؤں تک بجلی پہنچ گئی ہے اور پورا ملک روشن ہو گیا ہے، انہوں نے 28 اپریل 2018 کو ٹوئٹ کیا تھا ''دیش کے ہر گاؤں تک بجلی پہنچ گئی۔ اہم بات یہ رہی کہ وزیر اعظم نے ایک ہزار وہ مزعومہ گاؤں جہاں آزادی کے بعد پہلی بار بجلی پہنچی تھی وہاں کے عوام کے ساتھ براہ راست ایک مکالمہ کیا جس کی ابتدا میں خود انہوں نے کہا تھا ''جنہوں نے اجالے میں آنکھیں کھولی ہیں وہ اندھیرے کا مطلب نہیں جانتے، اور اپنشد کا ایک اشلوک سنایا ''کمسو ما جیوتر گوایائے'' یعنی اندھیرے سے اجالے کی طرف چلو۔

وزیر اعظم اندھیرے سے اجالے کی طرف اس طرح چلے کہ بچوں کا مستقبل اندھیرے کی نذر ہو گیا۔ اتنے بلند بانگ دعووں کے باوجود اس وقت صرف یوپی کے 55 ہزار پرائمری اور ثانوی اسکول ایسے ہیں جہاں بجلی کے کنکشن نہیں ہیں۔ یہاں بچے آج بھی گرمیوں میں 44 ڈگری ٹارچر سیل میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یوپی کے یہ اسکول ہیں یا بھٹی جہاں بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ حقیقت پارلیمانی الیکشن کے اعلان کے بعد اس وقت سامنے آئی جب یوپی چیف الیکشن کمشنر نے اعلیٰ افسران کے ساتھ میٹنگ کی، جس میں پرائمری اور ثانوی اسکولوں کو پولنگ بوتھ بنائے جانے سے متعلق گفتگو ہوئی۔ اندازہ لگائیے جس ملک میں صرف ایک ریاست میں 55 ہزار اسکول بجلی جیسی بنیادی سہولت سے محروم ہوں تو وہاں پانی اور دیگر سہولیات کا کیا انتظام ہوگا۔ یہی

وجہ ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو پرائمری اسکولوں میں داخلہ دلانے کے بجائے پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھانے کو ترجیح دیتے ہیں جبکہ کسی بھی ملک کے انفراسٹرکچر میں اسکولوں کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ ادارہ ہے جو ملک کی نیو رکھتا ہے جس پر اس کے ملک کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔سرکاری اسکول رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہاں اس کے برعکس ہے۔

مرکزی حکومت نے برق کاری کے لئے صرف دین دیال کے نام پر ہی اسکیم شروع نہیں کی بلکہ اس نے 'سوبھاگیہ' کے نام سے بھی اسکیم شروع کی تھی تاکہ عوام کو بجلی فراہم کرائی جاسکے، ریاستی حکومت کے سربراہ یوگی آدتیہ ناتھ نے بھی اپنی حکومت کے سو دن پورے ہونے پر کہا تھا کہ جو لوگ بجلی کے لئے ترستے تھے آج ان کے گھر روشن ہیں، پھر ایک برس ہونے پر انہوں نے کہا ایک برس پورے ہونے پر ہماری حکومت نے 47 لاکھ کنبوں کو مفت بجلی دی۔ان سب کے درمیان اگر کوئی محروم رہا تو وہ سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے تھے، 'سوبھاگیہ' سے بھی ان کی قسمت کے تالے نہیں کھلے بلکہ وہ بند ہی رہے۔ان سب دعووں کے درمیان 'دی ہندو' نے ایک رپورٹ شائع کر کے مرکزی و ریاستی حکومت کی قلعی اسی وقت کھولی تھی۔اس نے تیس ایسے گاوں اسی وقت تلاش کر لیا تھا جہاں بجلی نہیں پہنچی تھی، جب اس سلسلے میں افسران سے گفتگو کی تو انہوں نے کہا تھا کہ کھمبے اور تار دیکھ کر ان گاووں کو اس فہرست میں شامل کر لیا گیا تھا۔برق کاری کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ سرکاری عمارت مثلاً اسکول اور پنچایت گھر میں اگر بجلی پہنچ گئی ہے تو اس گاوں کو بجلی پانے والے گاوں میں شمار کیا جائے گا۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب یوپی کا محکمہ بجلی الیکشن کمیشن کو خود بتاتا ہے کہ ہمارے یہاں 55 ہزار پرائمری و ثانوی اسکول ایسے ہیں جہاں بجلی کنکشن نہیں ہے تو پھر کیسے مان لیا گیا کہ ہر گاوں اور ہر گھر تک بجلی پہنچ گئی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ حکومتیں اعداد و شمار کے گورکھ دھندے کر رہی ہیں، ان کو کسی کی فکر نہیں ہے، وہ تو

صرف کاغذات پر کام کرتی ہیں جس کی زمینی حقیقت صفر ہوتی ہے، ایسے میں نقصان اگر ہوتا ہے تو وہ صرف عوام ہے۔ جن اسکولوں میں ابھی تک بجلی نہیں پہنچی ہے اندازہ لگائے وہاں بچے کیسے پڑھتے ہوں گے؟ ان کی ذہنی وجسمانی پریشانی کا کیا عالم ہوگا؟ کیا اسکولوں کو بجلی و پانی سے محروم رکھ کر ہندستان وشوگرو بن سکے گا؟ کیا وزیر اعظم نریندر مودی کا یہی نیوانڈیا ہے؟

پارلیمانی الیکشن کا اعلان ہو چکا ہے، لیڈر آپ کے پاس ووٹ مانگنے آئیں گے۔ جب وہ اپنا رپورٹ کارڈ آپ کے سامنے رکھیں تو ان سے ضرور سوال کیجئے گا اور پوچھئے گا کیا یہی نیوانڈیا ہے، جہاں سرکاری اسکول بھی بجلی و پانی سے محروم ہیں؟ یہ سوال صرف مرکز میں حکمراں جماعت سے نہیں کرنا ہے بلکہ اپوزیشن سے بھی پوچھنا ہے کہ جب ہمارے بچے سخت گرمی میں اسکولوں میں جل بھن رہے تھے تو آپ کیا کر رہے تھے؟ آپ نے حکومت کو کیوں مجبور نہیں کیا کہ وہ ان اسکولوں کو بھی بنیادی سہولیات سے آراستہ کریں۔ اسکولوں کی تباہی اور بچوں کے تاریک مستقبل کیلئے جتنی ذمہ دار مرکز و ریاست کی حکومتیں ہیں اتنی ہی ذمہ دار اپوزیشن پارٹیاں بھی ہیں۔ یہ وقت احتساب کا ہے۔ جس نے قوم کا مستقبل تاریکی کے حوالے کیا ہے اس سے سوال ضرور کیا جانا چاہئے۔

# مذہبی تنافر کے سلیپنگ ماڈیول

آئینی عہدوں پر پہنچ کر کوئی بھی شخص ذات پات، مذہب اور علاقائیت سے بالاتر ہوجاتا ہے۔اگر کوئی عہدے دار ایسا نہیں کرتا ہے تو اس کی قیمت ملک وقوم دونوں کو چکانی پڑتی ہے۔صدر جمہوریہ، گورنر، وزیر اعظم اور وزیر اعلی کا عہدہ قومی وریاستی سطح پر سب سے بڑے آئینی عہدے ہوتے ہیں، ان عہدوں پر بیٹھا اگر کسی نظریے کا چشمہ لگالے تو بڑے منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ آئین کا تحفظ کرتے ہوئے جمہوریت کو فروغ دیں لیکن ارجن کی طرح ان کی بھی نگاہیں صرف اور صرف کرسی پر ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک گورنر جہاں کھلے عام نریندر مودی کو وزیر اعظم کی کرسی دوبارہ بٹھانے کی اپیل کرتا ہے، اور پارٹی ورکر ٹکٹ کے لئے اس کی گاڑی کے سامنے لیٹ جاتے ہیں وہیں دوسری طرح وزیر اعظم اور وزیر اعلی الیکشن کے پہلے ہی فیز میں ترقیات کے بجائے ہندوتو کو اپنا محور بنا لیتے ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ یہ بات پہلی بار معلوم ہوئی ہے کہ ان موجودہ وزیر اعظم اور اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ نے ایک خاص نظریے کا چشمہ لگالیا ہے، یہ تو بہت پہلے سے معلوم ہے کہ ان دونوں لیڈران کی آنکھوں پر بہت موٹا چشمہ لگا ہوا ہے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ دوسروں پر مذہبی منافرت کا الزام لگانے والے ہی مذہبی منافرت کو ہوا دیتے ہیں، ترقیات کی بات اور دعویٰ کرنے والے اب ترقیات کو مسئلہ بنا کر الیکشن کے میدان میں نہیں آئے ہیں بلکہ ان کے ہاتھ میں وہی مذہب کا پرانا جھنجھنا ہے ہیں،۔لیکن رنگ اور آہنگ ذرا مختلف ہے، پہلے رام مندر پر براہ راست بات ہوتی تھی، ان کے ایجنڈے میں شامل ہوتا تھا لیکن اس بار وہ اس طرح ہندوتو کو سامنے نہیں لا رہے ہیں بلکہ پری پلان سلیپنگ ماڈیول مذہبی تنافر کو ہوا دے رہے ہیں۔ان کو معلوم ہے کہ مذہبی تنافر ہی وہ واحد راستہ ہے جو دوبارہ اقتدار کی کرسی تک پہنچا سکتا ہے۔

بی جے پی کا مذہبی سلیپنگ ماڈیول کیا ہے، سب سے پہلے ہم اس کو جان لیتے ہیں۔کانگریس

کے دور میں جب ٹھاکر پرگیہ سنگھ، کرنل پرساد پروہت اور اسیمانند اجمیر، مالیگاؤں اور مکہ مسجد بم دھماکہ میں گرفتار ہوئے اور انہوں نے اقبال جرم کیا تو ''بھگوا آتنکواد'' کی اصطلاح سامنے آئی ۔دراصل یہ اصطلاح مسلم دہشت گردی کے متوازی وضع کی گئی تھی۔اس وقت سب چھٹپٹائے کہ اس اصطلاح کو روکا جائے لیکن یہ سچائی تھی کہ ان تینوں نے جرم کیا تھا، جس کا اقبال بھی کیا، ایسے میں وہ بہت زیادہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔بی جے پی آر ایس ایس کی سیاسی ونگ ہے، اس کے پاس آر ایس ایس کا نظریہ ہے اس لئے جب وہ اقتدار میں آئی تو اس نے رام مندر کی تعمیر پر توجہ دینے کے بجائے ان تینوں اقبالی مجرمین کی طرف توجہ دی۔یہی وجہ ہے کہ اس نے عدلیہ اور اس سے وابستہ افراد کو اپنا ٹارگٹ بنایا۔سپریم کورٹ کے چار ججوں نے پریس کانفرنس کر کے اعلان کیا تھا کہ عدالت میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔دباؤ کے بعد ہی ممبئی کی وہ وکیل نے اعلان کیا تھا کہ مجھ پر دباؤ بنایا جا رہا ہے کہ مقدمے کو کمزور کروں، جب امت شاہ کو راحت ملی تھی تبھی سے قیاس آرائی ہو رہی تھی اب پرگیہ ٹھاکر، کرنل پروہت اور اسیمانند بھی چھوٹ جائیں گے اور یہی ہوا بھی۔اس سلیپنگ ماڈیول کا مقصد ہندو دہشت گردی کے لیبل کو ہٹانا تھا۔اس کو معلوم تھا کہ رام مندر کے مسئلے کو وہ اتنی آسانی سے حل نہیں کر سکتی ہے لیکن وہ اس راستے سے دو نشانے حاصل کر سکتی ہے۔اول تو اس کے پیشانی پر لگا داغ مٹ جائے گا اور دوسرے بیک ڈور سے وہ پھر مذہبی منافرت کو ہوا دے کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اسیمانند جب سے عدالت سے بری ہوا ہے، وزیر اعظم نریندر مودی اپنے پرانے تیور میں آگئے ہیں۔جب وہ کہتے ہیں کہ کانگریس نے ہندوؤں کو دہشت گرد کہنے کا پاپ کیا تھا تو بین السطور یہ بھی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ میں نے اس پاپ کو دھو دیا ہے اور دہشت گرد ہندو نے صرف مسلمان ہوتے ہیں۔وزیر اعظم ایک تیر سے دو نشانے لگانے میں بہت ماہر ہیں۔بی جے پی کی سیاست کا محور ہندو اور مسلمان ہیں، پورا الیکشن اسی کے ارد گرد گھومتا ہے۔اس لئے جب وہ اعلان کرتے ہیں کہ ہندو دہشت گرد نہیں ہوتا تب وہ اس بات کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ دہشت

گردصرف مسلمان ہوتا ہے۔ہندستان کی سب سے بڑی اقلیت کواسٹیج سے اس طرح طعن وتشنیع کرناوزیراعظم کے لئے زیب نہیں دیتا۔وردھامیں وزیراعظم نریندرمودی نہیں بول رہے تھے بلکہ بلکہ ایک منصوبہ بند ذہن بول رہاتھا،ان کاایک مائنڈ سیٹ اپ ہے اس سے باہر نکل کر نہ وہ سوچ سکتے ہیں اور نہ ہی بول سکتے ہیں۔

برسوں سے جوڑتوڑ کے بعداس وقت اسیمانندکواسی لئے رہائی دلائی گئی تاکہ الیکشن میں وزیراعظم اس کوبی جے پی کے حق میں بھناسکیں اوروہ یہی کرر ہے ہیں،وہ ہندوؤں کو باور کرار ہے ہیں کہ کانگریس نے ہندوؤں پردہشتگرد ہونے کاالزام لگاکرپاپ کیاتھالیکن میں نے یہ پاپ دھل دیا ہے۔ہندوؤں کے ماتھے سے یہ داغ میں نے مٹادیا ہے۔اگروہ ایسانہ کہناچاہتے تووردھا میں اس طرح کی تقریرنہ کرتے۔وزیراعظم نریندرمودی اوراترپردیش کےوزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے الیکشن کاٹریک وکاس سے بدل کرمذہب کوبنادیا ہے۔وزیراعلیٰ کی مغربی اترپردیش کی تقریرسن لیجیےدونوں لیڈرایک ہی ٹریک پرچلتے ہوئےنظرآتے ہیں۔

ان دونوں کی پریشانی کانگریس کاسافٹ ہندوتو ہے،جب سے پرینکا گاندھی کانگریس کی جنرل سکریٹری کے عہدے پرفائز ہوئی ہیں،انہوں نے نہ صرف تندہی سے کام شروع کیا ہے بلکہ وہ راستے میں پڑنے والے مندوں میں بھی جاتی ہیں،جس سے ہندوتو کی ٹھیکیدار بی جے پی سکتہ میں آگئی ہے اوراب وزیراعظم کےساتھ وزیراعلیٰ بھی میدان میں آگئے ہیں،وہ بھی مذہب کی ہی ڈگڈگی بجارہے ہیں۔ان کی ڈگڈگی بھی بین السطوروالی ہی ہے۔مظفرنگر میں جوتقریر انہوں نے کی تھی اس میں وزیراعظم کاہی اندازتھا کہ اب یہاں سے کوئی نقل مکانی نہیں کرتا،اس کامطلب بھی صاف ہے۔

مجموعی طورپراگردیکھاجائےتوبی جے پی نے اس الیکشن کومذہب کےٹریک ڈال دیا ہے

،اس نے اپنے ترقی کے ایجنڈے کو کچھ دنوں کے لئے سرد خانے میں ڈال دیا ہے اور اب جوں جوں الیکشن قریب آتا جائے گا، سلیپنگ موڈ میں ملی کامیابیاں سامنے آتی جائیں گی اور منافرت کی خلیج بڑھتی جائے گی۔ کوئی بعید نہیں کہ ان لوگوں کی تقریروں سے ماحول خراب ہو جائے اس لئے اولاً الیکشن کمیشن کو ہندو مسلم، اور دہشت گرد جیسی لفظیات کے استعمال پر ہی پابندی لگا دینی چاہئے۔ ثانیاً اس کو ان لوگوں سے جواب طلب کرنا چاہئے، ثالثاً ہمیں بحیثیت ہندستانی ملک کی ہم آہنگی اور گنگا جمنی تہذیب کے تحفظ کے لئے کسی کی باتوں میں نہیں آنا چاہئے اور نہ وقتی طور پر جذباتی ہونا چاہئے بلکہ بہتر یہ ہے کہ سنجیدگی سے گذشتہ پانچ برسوں کے کام کاج کا جائزہ لے کر یوم احتساب کو اپنی مہر سے فیصلہ سنانا چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ گہرائی سے جائزہ لیا جائے اور ووٹوں کو بکھرنے سے ہر ممکن بچایا جائے تبھی ملک کی گنگا جمنی تہذیب کا تانا بانا بچایا جا سکتا ہے۔

# غریب جمہوری نظام حکومت سے باہر کیوں؟

جسے ہم ڈیموکریسی کہتے ہیں، وہ اصل میں بڑے بڑے تاجروں اور زمینداروں کا راج ہے اور کچھ نہیں، چناؤ میں وہی بازی لے جاتا ہے جس کے پاس روپیہ ہے، روپئے کے زور سے اسے بھی آسانیاں مل جاتی ہیں، بڑے بڑے پنڈت، بڑے بڑے مولوی اور بڑے بڑے لکھنے والے اور بولنے والے جو قلم اور زبان سے پبلک کو جدھر چاہیں موڑ دیں، سبھی سونے کے دیوتا کے پیروں پر ناک رگڑتے ہیں۔ (گئودان/ پریم چند)

سیاست انسانی سماج کا ایک لازمی جز بن چکا ہے، دنیا میں دو ہی طرز حکومت رائج ہیں، اول بادشاہت، دوم جمہوریت، بادشاہت کے دن چلے گئے، اب جہاں بھی بادشاہت ہے وہاں بھی نیم جمہوریت ہے۔ ہندستان نے آزادی کے بعد جمہوری طرز حکومت کو اختیار کیا۔ جمہوری طرز حکومت میں عوام کی حکومت عوام کے لئے ہوتی ہے۔ اس میں سب کو یکساں مواقع حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں دکھانے کے اور، آزادی سے دس برس قبل ہندستانی تہذیب وثقافت کے سب سے بڑے علمبردار پریم چند نے اپنے مشہور زمانہ ناول ''گئودان'' میں اس کی حقیقت کھول کر رکھ دی تھی۔ ان کے ذریعہ کی گئی جمہوریت کی تعریف کا اطلاق جب ہم آج کی جمہوریت پر کرتے ہیں تو بعینہ اس پر صادق آتی ہے۔ رائج جمہوریت دراصل سرمایہ کاروں کا راج ہے، زبان اور قلم کے دھنی یعنی ذرائع ابلاغ ان ہی کے حق میں آواز بلند کرتا ہے اور رائے عامہ کو جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ ہندستانی سیاست میں کے مرکز میں عوام اور غریب بالکل نہیں ہیں بلکہ امیر ہی اس کا محور کل تھے اور آج بھی ہیں، ان کو اگر کچھ ملتا ہے تو صرف وعدے اور جھڑکیاں۔ ہم وعدوں کو ہی جمہوریت میں اپنا حق تصور کرتے ہیں، جس نے سبز باغ دکھائے وہی ہمارا مسیحا ہے۔ ووٹ دینے کے بعد غریب عوام کے پاس کچھ نہیں بچتا ہے، اب اس کو برداشت کرنا اور جھیلنا عوام کا مقدر ہوتا ہے۔ پورے الیکشن میں آپ دیکھ لیں

غریب کہاں ہے؟ الیکشن سے پہلے اور الیکشن کے بعد ہر جگہ غریب سیاست کے مرکز سے باہر ہوتا ہے۔صرف ووٹنگ کے حق کو جمہوریت نہیں قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ اقتدار میں شمولیت کو جمہوریت قرار دیا جانا چاہئے۔

کتنے ایسے غریب، کسان اور مزدور ہیں جو جمہوری دستور سے نالاں ہیں کیونکہ ان کو ان کا حق نہیں مل رہا ہے بلکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے لیکن وہ جمہوری نظام حکومت میں داخل ہو کر اس کو تبدیل نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے، جس سے وہ الیکشن لڑ سکیں، حالانکہ ہمارے آئین نے ہر شہری کو یہ حق دیا ہے کہ وہ جمہوری نظام حکومت کا حصہ بنے لیکن صرف حق دینے سے زمینی سطح پر حقوق نہیں مل جاتے ہیں۔ میں اس کی صرف دو مثالیں دینا چاہوں گا جس سے واضح ہو جائے گا کہ الیکشن لڑنے کا حق ملنے کے باوجود لوگ اپنا حق نہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

دہلی میں اپنے حقوق کے لئے تحریک چلانے والے کسانوں کو اپنی کسمپرسی اور بدحالی واضح کرنے کے لئے چوہے کھانا پڑا، وہ مہینوں کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہے، کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا، انہوں نے اعلان کیا کہ وہ وزیر اعظم نریندر مودی کے پارلیمانی حلقہ بنارس سے الیکشن لڑیں گے، لیکن اپنی بدحالی اور غربت کی وجہ سے ان میں سے کوئی ہمت نہ کر سکا کہ وہ الیکشن کے میدان میں آئے۔ بی ایس ایف کے برخاست جوان تیج بہادر یادو نے نہ صرف وزیر اعظم مودی کے سامنے الیکشن لڑنے کا اعلان کیا بلکہ انہوں نے پرچہ نامزدگی بھی داخل کرا دیا لیکن ان کو اپنی شکست کا بھی اسی طرح یقین ہے جس طرح یہ معلوم ہے کہ وہ فوج کی ملازمت سے برخاست کر دیئے گئے ہیں۔اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے پرچہ نامزدگی سے قبل اے این آئی اور دیگر خبر رساں ایجنسیوں کو دیا تھا۔وہ کہتے ہیں: میں ایک بے حد عام انسان ہوں، مودی جی بہت بڑے لوگ ہیں، میں ان سامنے شاید جیت نہ پاؤں کیونکہ میرے پاس وسائل و ذرائع کی کمی ہے لیکن میرے پاس ایک چیز ضرور ہے

،میرے ساتھ لوگوں کا پیار ہے۔ یہ وہی فوجی جوان ہیں جنہوں نے جب فوج میں غیر معیاری کھانے کے خلاف آواز اٹھائی تو اس کی جانچ ہوئی، کورٹ مارشل ہوا اور پھر وہ برخاست کر دیئے گئے۔ آج وہ وزیر اعظم مودی کے خلاف میدان میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اصلی اور نقلی چوکیدار/ امیر اور غریب کی لڑائی ہے۔ جھوٹ کو ہرانا ہے، جھوٹے جملوں کو ہرانا ہے، جھوٹے وعدوں کو ہرانا ہے۔ جو لوگ بدعنوانی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں وزیر اعظم ان ہی کو ملازمت سے برخاست کر کے برباد کر دیتے ہیں۔

تیج بہادر یادو کو یقین ہے کہ ان کی شکست ہوگی کیونکہ ان کے پاس وسائل نہیں ہیں، کیا جمہوری نظام کے نفاذ میں آئین ساز بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے وسائل کو بھی لازمی قرار دیا تھا؟ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ تو اب سوال اٹھتا ہے کہ اس بات کا کون ذمہ دارا ہے، جس نے غریبوں کو جمہوریت کی مرکزی سیاست سے نکال کر نعرے لگانے اور کرسیاں سیدھی کرنے تک محدود کر دیا ہے؟ ایسوسی ایشن فار ڈیموکریٹک ریفارمس امپروونگ اینڈ اسٹرینتھنگ (اے ڈی آر) کی رپورٹ کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ غریب کسی بھی ریاست میں مرکزی سیاست میں نہیں ہیں۔ اسمبلی الیکشن میں تو کہیں کہیں کوئی ایسا امیدوار جس کے پاس وسائل کی کمی ہوتی ہے جیت کر اسمبلی پہنچ جاتا ہے لیکن لوک سبھا الیکشن میں صرف بڑے بڑے لوگ ہی جیت حاصل کر پاتے ہیں۔ جس کی وجہ وسائل کی بہتات اور رقم کی فراہمی کے ساتھ ہی بڑے بڑے قلم اور ذرائع ابلاغ کی خریداری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج فوج کے ایک جوان کو الیکشن سے قبل یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی کہ وہ اس کے پاس وسائل کی کمی ہے اس لئے وزیر اعظم نریندر مودی کے سامنے اس کی شکست یقینی ہے۔

جمہوری نظام حکومت سے غریبوں کے باہر رہنے کیلئے سب سے زیادہ ذمہ دار ریاست اور الیکشن کمیشن ہے۔ ایک طرف جہاں حکومت میں رہتے ہوئے حکمراں پارٹی قومی وسائل کا

استعمال اپنی پارٹی کو فروغ دینے اور کیڈر کو مضبوط کرنے کے لئے کرتی ہے، وہیں دوسری طرف الیکشن کمیشن اعلان تو خوب کرتا ہے کہ ناجائز رقم کا استعمال نہیں ہونے دیا جائے گا لیکن وہ اس بات کو کبھی یقینی نہیں بنا سکی ہے۔ اتنا ہی نہیں متعدد بار الیکشن کمیشن پر اس بات کے الزامات بھی عائد ہوئے ہیں کہ وہ حکمراں پارٹی کے حق میں کام کرتی ہے۔ ابھی حال ہی میں کرناٹک اور مدھیہ پردیش میں الیکشن کمیشن کی ایما پر ای ڈی نے چھاپے ماری کی جس کے بعد اس پر انگلیاں اٹھنے لگیں جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حکمراں پارٹی کے ایک لیڈر نے چھاپے ماری سے قبل ہی ٹوئٹ کر کے بتا دیا تھا کہ چھاپے ماری میں کتنی رقم برآمد ہوئی ہے۔

الیکشن کمیشن نے الیکشن میں خرچ ہونے والی رقم کا یقینی طور پر تعین کر دیا ہے، جس کی جانچ وہ بہی کھاتہ کی طرح کرتی ہے حالانکہ اس کو بھی معلوم ہے کہ الیکشن کے بعد کاغذات میں جتنا صرفہ دکھایا گیا ہے وہ شاید ایک میٹنگ/ جلسہ پر خرچ ہوئی ہے، اس کے باوجود وہ خاموش رہتا ہے، ۔ایسے میں غریب یقینی طور پر جمہوری نظام حکومت کے مرکز سے باہر رہ کر صرف نعرے بازی کریں گے اور کرسیاں سیدھی کریں گے۔ اس کو تو کرنا یہ چاہئے تھا کہ اپنے طور پر امیدواروں کے اخراجات کا جائزہ لیتا اور ضابطے کی خلاف ورزی پر دوران الیکشن ہی امیدوار کے خلاف قانونی کارروائی کرتا بلکہ اس کو نااہل قرار دے دیتا۔

غریب صرف امیروں اور سرمادارں کو ووٹ دینے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ اس کو بھی موقع ملنا چاہئے لیکن جب تک جمہوری نظام کو دستاویز تک محدود رکھا جائے گا اور ذاتی مفادات کے لبادے میں اس کو لپیٹ کر رکھا جائے گا اس وقت تک جمہوریت کا فائدہ عام لوگوں تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

# یہ شکست خوردگی کی انتہا ہے

یہ نظریات کا دور ہے، اس لئے ہر سطح پر اور ہر طریقے سے اس کی نشر و اشاعت کی جاتی ہے تا کہ اس کو قبول عام حاصل ہو سکے۔ اس سطح پر اگر کوئی قوم شکست سے دو چار ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو فتح و کامرانی سے ہمکنار نہیں کر سکتی ہے۔ دراصل نظریات کا سیدھا تعلق نفسیات سے ہے، سماج میں جن نظریات کو قبول عام حاصل ہوگا، اسی کے تابع نفسیات بھی تشکیل پائے گی۔ اس لئے اگر کامیابی حاصل کرنا ہے تو نظریاتی سطح پر مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے۔ زندہ قومیں سطحی کامیابی اور عروج کے بجائے دیرپا کامیابی کو اپنے وجود کا شناخت نامہ تصور کرتی ہیں۔

ہندستان میں تقریبا ایک صدی قبل ایک منصوبہ کے تحت ایک تنظیم کھڑی کی گئی جس کی بنیاد تعصب اور فرقہ پرستی پر رکھی گئی تھی، اس تنظیم نے خود کو مضبوط کرنے کے لئے سب سے زیادہ توجہ تعلیم پر دی، آگے چل کر اپنے نظریاتی دشمنوں کو زیر کرنے کے لئے ان کے اداروں کو نشانہ بنایا، مجموعی طور پر ان کی نظر اپنی تعلیم، دوسروں کی تعلیمی اور دیگر علمی اداروں پر ہی رہی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایسے نظریات کے حامل لوگ ہر شعبہ میں راہ پا گئے جو ان کی فیکٹری سے نکلے ہوئے تھے۔ آج آپ کسی بھی شعبہ میں چلے جایئے ہر جگہ یہ جو دملیں گے۔

سیکولر نظریہ کے خلاف لام بند ہونے والوں نے سہ سطحی منصوبہ تیار کیا تھا۔ زمینی کام ، نئی نسل کی تیاری اور اپنے نظریات کا نفاذ ۔ وہ اپنے دو مقاصد حاصل کر چکے، تیسرے مقصد کی طرف تیزی سے گامزن ہیں۔ اب انہوں نے ایک نیا قدم اٹھایا ہے، پہلے وہ اپنے گھروں اور اداروں میں اپنے نظریات کی نئی پود تیار کرتے تھے لیکن اب ان کا رخ ہمارے اداروں کی جانب ہو گیا ہے۔ اس کی بھی دو سطحیں ہیں۔ پہلی وہ ادارے جن کا تعلق اقلیتی کمیونٹی سے ہے لیکن ان پر سرکاری کنٹرول ہے، دوسری سطح وہ ادارے جو اقلیتی کمیونٹی کے ہیں اور ان ہی کے کنٹرول میں ہیں۔ انہوں نے ایک ساتھ دونوں جانب پیش قدمی کی لیکن دوسری سطح پر پروہ ناکام ہو گئے

ہیں کیونکہ اس کی باگ ڈور علما کے ہاتھ میں ہے جن کے پیش نظر نہ حب جاہ ہے اور نہ ہی خوف ستم ، بلکہ وہ رضاء الٰہی میں یقین رکھتے ہیں، اس لئے وہ دین حنیف کی تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں۔ انہوں نے مخالف نظریات کے حاملین کو ذرہ برابر موقع نہیں دیا کہ وہ اس میں دخیل ہو سکیں حالانکہ پے در پے ان کو نشانہ بنایا جاتا رہا لیکن وہ سینہ سپر رہے اور امید ہے کہ وہ اپنے موقف پر قائم رہیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو اپنے نصاب میں تبدیلی کر کے اس کو زمانے سے ہم آہنگ کرنا ہوگا ورنہ بہت زیادہ دیر تک وہ ان حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

اپنے نظریات کو تھوپنے کی کوششیں پہلے بھی کی گئی تھیں لیکن وہ بند بند تھیں مثلاً نصاب تعلیم میں تبدیلی، آئین اور تاریخ سے چھیڑ چھاڑ، سوریہ نمسکار وغیرہ۔ اس پر ان کے اسکولوں سے پڑھ کر اور ان کا نظریہ لے کر نکلنے والے ایسے لوگ کام کر رہے تھے جو اعلیٰ عہدوں تک پہنچے۔ لیکن اب وہ قیادت میدان میں آگئی ہے جو منصوبہ ساز تھی۔ جس کی سب سے بڑی وجہ ان کے سیاسی بازو کا اکثریت کے ساتھ اقتدار میں ہونا ہے۔ وہ برسوں سے اسی موقع کی تلاش میں تھے اور آج ان کو مل گیا ہے۔ وہ کھلے عام اقلیتوں سے متعلق سرکاری کنٹرول والے قومی سطح کے اداروں اور ان کے پروگراموں میں آ رہے ہیں اور پروچن دے رہے ہیں۔ اگر سرکاری یا آئینی عہدے کا کوئی شخص آتا اور اس میں اصلاح کے ساتھ قوانین کے نفاذ پر گفتگو کرتا تو کوئی بات نہیں تھی خواہ وہ ان ہی کے نظریات کا حامل ہی کیوں نہ ہوتا اور ان ہی کی فیکٹری سے نکل کر ہی کیوں نہ آیا ہوتا، تب بھی ان کے پاس اور ان اداروں کے سربراہوں کے پاس بھی جواز ہوتا لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ آئینی عہدوں پر بیٹھے افراد یا منتظمہ کی ذمہ داری ادا کرنے والے اشخاص کے بجائے ایسے افراد ان اداروں میں آ رہے ہیں اور اندرون خانہ ان چلا رہے ہیں/ چلانے کی کوشش کر رہے ہیں جو سیکولر نظریات کے خلاف تعصب کی فیکٹری چلاتے ہیں۔

یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ہندستان کو سیکولر اسٹیٹ کے بجائے ہندو راشٹر بنا نا ہے۔ جب ان کی سیاسی ونگ اقتدار میں آئی تو انہوں نے ایسے اداروں کونشان زد کرلیا بلکہ ان کو ہائی جیک کرنے کا منصوبہ تیار کرلیا تا کہ ان کو اپنے نظریات کے قبول عام ہونے کا سر ٹیفکٹ مل سکے اور آئندہ ان کو جواز بنا کر نئی نسل کے ذہنوں کو مسموم کر کے اپنے مقاصد حاصل کرسکیں ورنہ ان کے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ وہ قومی سطح کے ادارے ہیں جن کے گہرے اثرات اقلیتی طبقے پر مرتب ہوتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ ان اداروں کے زیر اثر ہی مسلم کمیونٹی کی نفسیات تشکیل پاتی ہے۔ان کی آمد سے بظاہر تو بہت زیادہ نقصان نظر نہیں آرہا ہے لیکن جس طرح اس تنظیم کے قیام کے 80 برس بعد اس کے اثرات دکھائی دیئے اسی طرح برسوں بعد ان کی آمد کے اثرات سماج میں نظر آئیں گے۔ سیکولر نظریات کے مخالف غیر آئینی عہدوں کے افراد کو مسلم کمیونٹی سے سے تعلق رکھنے والے قومی سطح کے اداروں میں آنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے ، ایسے میں ایک طرف جہاں وہ اپنے نظریہ کو قبول عام کا سر ٹیفکٹ دینے لگیں گے وہیں دوسری طرف نفسیاتی طور پر ہمارے نوجوان احساس کمتری کا شکار ہوں گے۔ ابتدا میں تو یہ لوگ کھل کر اپنے نظریات کا اظہار نہیں کریں گے لیکن وہ چاندی کے ورق میں ملفوف ایسی گولی ضرور دے جائیں گے جس سے نئے ذہنوں میں کلبلاہٹ پیدا ہوگی۔

قومی سطح کے حامل مسلم کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے اداروں کے ذمہ داران یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی کی آمد کو نہیں روکا جاسکتا ہے کیونکہ یہ سرکاری ادارے ہیں لیکن یہ جواز مسکت نہیں ہے، اول وہ لوگ آئینی نہیں ہیں جن کی آمد ضروری ہو۔ دوم آمد اور دعوت میں فرق ہوتا ہے۔ مدعوان کو کیا جاتا ہے جو ہماری نظر میں مکرم ومحترم ہوں ، جو ہمارے بہی خواہ ہوں، جو یہ چاہتے ہیں کہ ہندستان کی سب سے بڑی اقلیت کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آئے ،لیکن یہاں تو معاملہ بالکل

برعکس ہے اس لئے نتائج بھی امید کے برعکس ہی آئیں گے۔ان کی جگہ پر اگر غیر مذاہب کے علماء کو مدعو کرلیا جائے تو کم از کم بین مذاہب توافق اور تعاون میں اضافہ ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ سازشی ذہن کے حامل نہیں ہوتے لیکن اگر نظریاتی سطح کے افراد کو مدعو کیا جاتا ہے تو وہ زہر بوئیں گے۔ان اداروں میں ان کی آمد و دعوت اور ان میں ان کا دخیل ہونا ہماری شکست خوردگی اور قعر مذلت کے آخری حدوں میں پہنچ جانے کے مرادف ہے۔ہم اتنے شکست خوردہ تو بالکل نہ تھے کہ جو ہمارے وجود کو ہی کوڑھ سمجھتا ہو،جس نے ہماری تباہی کے منصوبے بنا رکھے ہوں،جس نے ہمیں سوئم درجے کا شہری بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو،اسی کو ہم بلائیں اور موقع دیں کہ ہمیں بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟ ظاہری بات ہے وہ احساس کمتری میں ہماری نسل کو مبتلا کر کے اپنے مقاصد کی طرف قدم بڑھائے گا۔اس لئے اگر ہمیں اپنی نسل کو بچانا اور بقائے دوام دینا ہے تو ایسے افراد کو مسلم کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے اداروں می ں مدعو نہیں کیا جانا چاہئے ،ورنہ ہم تو چلے جائیں گے لیکن اس کی مار آنے والی نسلیں جھلیں گی جس کے ذمہ دار ہمارے علاوہ کوئی اور نہ ہوگا۔

# اردو خبارات، ریڈرشپ اور اشتہارات

اردو اخبارات کی ایک روشن تاریخ رہی ہے، آزادی سے قبل اور آزادی میں ملک وقوم کی ترقی میں جو خدمات اردو اخبارات نے انجام دی ہیں وہ کسی دوسری زبان کے اخبارات نے انجام نہیں دیں۔ آزادی کے بعد اردو صحافت پر ادبار کی ہوا چلی اور وہ اس کی زد میں آگیا چونکہ آزادی کے بعد اردو زبان ہی معتوب قرار پائی تو ظاہر سی بات ہے کہ اخبارات کہاں محفوظ رہ سکتے تھے۔ اس کے باوجود ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایسا اخبار ضرور رہا جس نے اقلیتوں، دبے کچلے اور محروم طبقات کی آواز کو اٹھایا۔ 1997 تک قومی آواز نے یہ فریضہ انجام دیا 1998 میں ملٹی ایڈیشن راشٹریہ سہارا شائع ہوا جس کی غیر جانبداری آج تک مسلم ہے، یوں بھی کوئی بھی اخبار اپنی غیر جانبداری، سیاسی تجزیے اور سبھی طبقات کی آواز بلند کرنے سے ہی اپنی شناخت قائم کرتا ہے اور قارئین کو بیدار کرنے کا کام کرتا ہے، جس میں راشٹریہ سہارا کا کوئی ثانی نہیں۔ کچھ اخبارات علاقائی ہوتے ہیں جن کا دائرہ محدود ہوتا ہے، جن کی اپنی افادیت ہے۔ لیکن کچھ پاکٹ اخبارات ہوتے ہیں جن سے نہ صرف اردو صحافت کو نقصان پہنچا ہے بلکہ اس سے ہماری صحافت شرمسار بھی ہو رہی ہے۔ متعدد اردو اخبارات ایسے ہیں جن کو کسی نے دیکھا بھی نہیں ہے لیکن ان کے ایک ایک ایڈیشن کی اشاعت کی تعداد ستر اور اسی ہزار ہے۔ ابھی حال ہی میں انڈین ریڈرشپ سروے کی ایک رپورٹ جاری ہوئی ہے، جس میں ہندستان میں مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات کی ریڈرشپ کے اعتبار سے ریٹنگ کی گئی ہے، جس پر سوالیہ نشان ہے۔ ایجنسیاں دعوی تو کرتی ہیں زمینی حقائق کا لیکن ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر سرکاری اعداد و شمار یا پھر اثر و رسوخ کے تحت ریٹنگ کر دیتی ہیں اردو کا شائد ہی کوئی ایسا ریڈر ہو جو یہ بتا سکے ”کہ انڈین ریڈرشپ سروے“ کے نمائندے نے اس سے بات کی ہو۔ اس لئے ہمیں اعداد و شمار کے گورکھ دھندے میں نہیں پڑنا چاہئے اور نہ ہی اس پر اعتبار کرنا چاہئے۔ ابھی حال ہی میں دہلی میں اردو کی ایک عالمی کانفرنس ہوئی تھی جس میں ایک مقالہ نگار نے کثیر الاشاعت اخبارات کے

ناموں اوران کی تعداداشاعت کا ذکر کیا تھا۔میں حیرت زدہ تھا کہ انہوں نے زمینی حقائق کے بجائے سرکاری اعدادوشمار پیش کئے اور حوالہ دیا کہ وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند کے ادارہ ڈی اے وی پی کی ویب سائٹ پر یہ اعدادوشمار درج ہیں۔لیکن اس ویب سائٹ پر درج اعدادو شمار نہ صرف غلط ہیں بلکہ زمینی حقائق سے کوسوں دور ہیں۔

رجسٹرار آف نیوز پیپرس فار انڈیا کی ویب سائٹ پر جہاں اخبارات کا رجسٹریشن ہوتا ہے جس سے کسی بھی زبان میں اخبار نکالنے کے لئے کوئی بھی شہری مجاز ہوجاتا ہے وہیں ڈی اے وی پی کے تحت رجسٹرڈ اخبارات کو سرکاری اشتہارات جاری کئے جاتے ہیں۔یہ اشتہارات اخبارات کو ان کی اشاعت کی تعداد اور ریڈرشپ کے اعتبار سے دیئے جاتے ہیں۔جن اخبارات کی تعداداشاعت زیادہ ہوتی ان کوزیادہ اشتہارات ملنے کے ساتھ ہی اسکوائرفٹ کے اعتبار سے ان کو قیمت بھی زیادہ ادا کی جاتی ہے۔چونکہ پاکٹ اخبارات کے اخراجات صفر ہوتے ہیں اس لئے وہ سازباز کر کے اپنی تعداداشاعت زیادہ درج کرا کر مالکان اپنا اور افسران کا جیب بھرتے ہیں۔

پہلی بات اردو کا کوئی ایک اخبار ایسا نہیں ہے جو ملک کے ہر شہر میں دستیاب ہو،یعنی ہمارے پاس قومی سطح کا کوئی ایک اخبار نہیں ہے جو کشمیر سے کنیا کماری تک ہر جگہ سے شائع ہوتا ہو اور دستیاب بھی ہوجاتا ہو۔اس کے بعد چند اخبارات ہی اردو میں ایسے ہیں جو ہر جگہ عوام میں مقبول ہیں اوران کی خبروں پر عوام اعتبار کرتے ہیں لیکن اگر آپ ڈی اے وی پی کی سائٹ پر جا کر دیکھیں تو حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ اردو اخبارات کی تعداد نہ صرف اچھی خاصی ہے بلکہ کوئی شہر ایسا ہوگا جہاں سے اردو اخبار نہ شائع ہوتا ہو،اسی طرح ان کی تعداد دیکھ کر آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔میں جان بوجھ کر ایسے اخبارات کا نام نہیں لکھ رہا ہوں اور نہ ہی ان کی تعداداشاعت کا ذکر کر رہا ہو لیکن یہی اردو اخبارات کی زمینی حقیقت ہے۔ان پاکٹ اخبارات کی وجہ سے ہی

وہ اخبارات جو عوام میں مقبول ہیں اور متعدد شہروں میں ان کے قارئین ہیں وہ پریشان رہتے ہیں
۔چونکہ اشتہارات اخبارات کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن عوام کی آواز بلند
کرنے اور ان کے مسائل حکومت کے ایوانوں تک پہنچانے والے اخبارات کو ان کا حق نہیں مل
پاتا ہے بلکہ پاکٹ اخبارات پہلے ہی زیادہ کمیشن دے کر اشتہار اچک لیتے ہیں جس کی وجہ سے
ان اخبارات میں کام کرنے والے صحافی پریشان رہتے ہیں کیونکہ کوئی بھی ادارہ آمدنی کے
تناسب سے ہی اپنے ملازمین کو تنخواہ دے سکتا ہے لیکن جب آمدنی ہی نہیں ہوگی تو اچھی تنخواہ کہا
ں سے دی جاسکتی ہے؟ اگر آپ سرکاری اعداد و شمار دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ایک اچھی خاصی رقم
سرکار اردو اخبارات کو دیتی ہے، اعداد و شمار کو دیکھ کر آپ نہ یہ کہہ سکتے ہیں اردو اخبارات شائع نہیں
ہوتے یا ان کی ریڈر شپ نہیں ہے یا پھر سرکار ان کو اشتہارات نہیں دیتی ہے۔ لیکن حقیقت اس
کے برعکس ہے۔ پاکٹ اخبارات ان مقبول اور عوام کی آواز بلند کرنے والے اخبارات کا حصہ کھا
جاتے ہیں چونکہ کاغذی اعتبار سے یہ اخبارات خود کو مضبوط رکھتے ہیں اس لئے سرکاری
اشتہارات کے حصول میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

دراصل یہ اردو زبان اور اس کے اخبارات کو تباہ و برباد کرنے کی ایک منظم سازش
ہے۔ سرکاری کارندے جانتے ہیں کہ کاغذات میں جن اخبارات کی تعداد پچاس ہزار بتائی گئی
ہے، ان کی اشاعت کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں ہے، اس کے باوجود وہ ان کو اشتہارات دیتے
ہیں، اس سے ان کو دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اول اردو صحافت کی وہ کمر توڑ رہے ہوتے ہیں
اور دوم ان کی جیبیں گرم ہوتی ہیں اور تنخواہ سے کئی گنا زیادہ رقم وہ اشتہارات کی دلالی سے حاصل کر
لیتے ہیں۔ ڈی اے پی اور ریاستی گورنمنٹ کے محکمہ اطلاعات ونشریات کے دفتر میں کوئی بھی
جا کر یہ کھیل دیکھ سکتا ہے۔ چونکہ بڑے اخبارات نہ تو نصف سے زائد رقم دلالی میں دے سکتے

ہیں اور نہ ہی وہ کاسہ لیسی کر سکتے ہیں اس لئے وہ پیچھے رہ جاتے ہیں جب کہ پاکٹ اخبارات کی توجہ خبروں اور معیار کے بجائے اشتہارات کے حصول پر رہتی ہے اس لئے ان سے یہ کارندے خوش بھی رہتے ہیں اور ان کو اشتہارات بھی ملتے ہیں جس کی وجہ سے اردو کا کوئی اخبار آج تک قومی سطح کا نہیں بن سکا ہے۔ چونکہ قومی سطح کا کوئی اردو اخبار نہیں ہے، ان کی ریڈر شپ نہایت کم ہے اس لئے پرائیویٹ سیکٹر کے اشتہارات بھی اردو کو نہیں ملتے ہیں ایسے میں ہمارے اچھے اخبار ات نہایت کسمپرسی کے عالم میں ہیں، جس کے لئے سب سے زیادہ ذمہ دار ڈی اے وی پی ہے جو اصل حقدار کو ان کے حقوق دینے کے بجائے خانہ پری کرنے والے پاکٹ اخباروں کو اشتہارات دے کر ایک طرف ان کے حقوق سلب کر کے دوسروں کو دیتا ہے اور دوسری طرف وہ اردو صحافت کی کمر توڑ دیتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اخبارات جو عوام میں مقبول ہیں، جن کی ایک ساکھ ہے، وہ اپنے حقوق حاصل کرنے اور اردو صحافت کے وقار کو بلند کرنے کے ساتھ ہی اپنے ملازمین کی زندگی کو خوشحال کرنے کے لئے آگے آئیں اور اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کریں ورنہ یہ پاکٹ اخبار زمینی سطح پر کام کرنے والے اخبارت کو اپنی سازش اور منصوبہ بندی سے نگل جائیں گے اور ایک دن ایسا آئے گا جب اردو میں صرف پاکٹ اخبارات ہوں گے جو چھپنے کے بجائے صرف کاغذی گورکھ دھندے اور دستاویز میں ہوں گے عوام میں اردو کا کوئی اخبار نہیں ہوگا۔

# زرد دیمک زدہ ہندستانی میڈیا

ہندستان میں میڈیا کتنا آزاد ہے اس کا اندازہ گزشتہ پانچ برسوں میں صرف عوام کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو ہوگیا ہے۔ایک خاص نظریہ کی حامل مرکزی حکومت نے ذرائع ابلاغ پر ایسا شب خون مارا ہے کہ اس کا اعتماد اور وقار ہی صرف مجروح نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا وجود ہی متزلزل ہوگیا ہے۔ایک طرف جہاں حکومت نے اپنی اسٹریٹجی سے ذرائع ابلاغ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس کی تعریف کریں اور مخالفین کی آواز دبائیں وہیں دوسری جانب حکومت سے باہر ایک ایسا گروہ بھی وجود میں آگیا جس نے عالمی سطح پر ہندستانی میڈیا کی ساکھ کو تباہ کردیا ہے۔

صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے، جسے ہندستان میں زرد دیمک لگ چکی ہیں، ان کا رنگ زرد اس لئے ہے کیونکہ انہوں نے خون چوسا ہے۔یہ خون غریبوں، بے سہاروں اور اقلیتوں کا ہے، چوتھے ستون کو اندر اور باہر دونوں طرف سے دیمک چاٹ رہی ہیں۔صحافت کو جو دیمک باہر سے لگی ہیں، اس سے متعلق اطلاعات کی آزادی کے لئے عالمی سطح پر کام کرنے والی ایک تنظیم ''رپورٹرس وداؤٹ بارڈرس'' نے حال ہی میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جبکہ اندر جو دیمک لگی ہوئی ہیں ان کے بارے میں میں کچھ خامہ فرسائی کروں گا۔عالمی تنظیم ''رپورٹرس وداؤٹ بارڈرس'' کے مطابق اس وقت ہندستان صحافت اور اطلاعات کی آزادی کے معاملے میں 140ویں نمبر پر ہے جو نیپال اور سری لنکا جیسے ملک سے بھی پیچھے ہے۔

رینکنگ چارٹ میں یہ دونوں ملک بالترتیب 106 اور 126ویں نمبر ہیں۔نیپال تو انڈیا سے کافی آگے ہے۔مرکز میں جب سے بھاجپا اقتدار میں آئی ہے رینکنگ چارٹ میں ہندستان مسلسل نیچے گرتا جارہا ہے۔2014 میں جب مودی حکومت اقتدار میں آئی تھی اس وقت ہندستان حالیہ رینکنگ پر تھا۔اس کے بعد 2016 میں 136ویں نمبر پر چلا گیا۔2017 میں 136ویں اور 2018 میں 138ویں نمبر تھا اور اب پھسل کر 140ویں پر پہنچ گیا ہے۔پاکستان محض دو نمبر ہندستان

سے نیچے 142ویں نمبر پر ہے۔

عالمی تنظیم کی یہ رپورٹ اس لئے اہم ہوجاتی ہے کیونکہ اس نے اس کی سب سے بڑی وجہ ہندتووادی نظریات کے حامل لوگوں کا صحافیوں پر حملہ بتایا ہے۔ 2018 میں چھ صحافیوں ایسے حملوں میں اپنی جان کھو چکے ہیں۔ رپورٹ کہتی ہے Attacks against Journalists by Supporters of Prime minister Narendra Modi increased in the run up to general elections in the spring of 2019۔ یعنی موجودہ الیکشن میں وزیر اعظم نریندر مودی کے حامیوں کا حملہ صحافیوں پر بڑھ گیا ہے۔ یہ ایک غیر ملکی تنظیم کی رپورٹ ہے جو پوری دنیا میں اطلاعات کی آزادی کے لئے کام کرتی ہے، اس لئے کوئی اس بات کا الزام نہیں عائد کرسکتا ہے کہ رپورٹ جانبداری سے تیار کی گئی ہے۔ رپورٹ میں آن لائن اور جسمانی دونوں طرح کے حملوں کو شامل کیا گیا ہے۔

اپریل 2018 میں شمال مشرقی ریاست منی پور کے ایک صحافی کشور چندرو انگ کھیم کو بغیر کسی ٹرائل کے نیشنل سیکیورٹی ایکٹ کے تحت ایک برس کی جیل صرف اس لئے ہوگئی تھی کہ اس نے ایک فیس بک پر ویڈیو میں ہندو نیشنل ازم، وزیر اعظم نریندر مودی اور منی پور کے وزیر اعلیٰ پر تنقید کی تھی۔ کشور چندرا کو 130 ایام جیل میں گزرنے پڑے جس کے بعد اس کی رہائی عمل میں آئی۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے، ورنہ صحافیوں کی آواز کو ہندتووادی نظریات کے حامل افراد کئی طرح سے دباتے ہیں۔ کبھی ان کی زندگی کی ڈور کاٹ کر آواز خاموش کردیتے ہیں جیسا کہ ایک رپورٹ کے مطابق 2018 میں چھ صحافیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس سے قبل دابھولکر، پنسارے، کلبرگی اور گوری لنکیش کے ساتھ کیا ہوا، یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

دراصل جب سے مرکز میں بھاجپا اقتدار میں آئی ہے، برسوں کا حسد اور بغض اپنے سینوں

میں بھرے متعصب نظریات کے حامل افراد اپنے بلوں سے باہر آ گئے اور ہر اس آواز کو خاموش کرنے لگے جوان کے نظریہ کے خلاف رہی ہو۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ پنیہ پرسون باجپئی کو کس طرح اور کیوں ٹی وی چینل سے نکالا گیا تھا۔ صحافیوں کی آواز دبانے اور ان کو خاموش کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے۔ پرسون باجپئی تنہا نہیں ہیں اور بھی صحافی ہیں جن کو سرکار کے خلاف نیوز چلا دینے یا اخبار میں ایسی خبر لگ جانے کے بعد روز جھڑکیاں سننی پڑتی ہیں۔ رپورٹرس وداؤٹ بارڈرس جیسی تنظیم کو ایسی خبروں کو بھی شامل کرنا چاہئے تھا، اگر یہ رپورٹ بھی شامل ہوجاتی تو ہندستان 150ویں نمبر سے بھی نیچے پہنچ جاتا۔ دراصل یہ وہ ٹارچر ہے جو اخبار یا نیوز چینلوں کے دفتر سے باہر نہیں آپاتا ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ ملازمت کا خوف ہے۔ صحافی آزادی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے لیکن اس کو کام کرنے نہیں دیا جاتا ہے۔ ایک طرف باہر کے غنڈے اور خاص نظریات کے حامل افراد ہوتے ہیں جو صحافی کی آواز خاموش کرانے کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں جس کے کچھ معاملات باہر آتے ہیں اور وہ وہ رپورٹ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ ٹی وی چینل/ اخبارات کے مالکان و ذمیداران ہوتے ہیں جو اپنے مفاد کے لئے صحافیوں کو آزادی سے کام نہیں کرنے دیتے۔ چونکہ اخبارات یا چینلوں میں ملازمت پرائیویٹ سیکٹر کی ہے اس لئے مالک جب چاہتا ہے صحافی کا کان پکڑ کر نکال دیتا ہے۔ ایسے میں یہ ممکن نہیں ہوتا ہے کہ صحافی آزادی کے ساتھ کام کرسکے۔

عالمی تنظیم ''رپورٹرس وداؤٹ بارڈرس'' نے آن لائن تشدد کو بھی موضوع بنایا ہے اور بتایا ہے کہ آزادانہ طور کام کرنے والے صحافیوں کو ای میل، مسینجر اور سوشل میڈیا پر کھلے عام دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں۔ متعدد سیاسی پارٹیوں نے اپنا آئی ٹی سیل بنا رکھا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ سماجی روابط کی ویب سائٹوں پر پارٹی کی تشہیر کریں لیکن سچائی یہ ہے کہ یہ ایک آن لائن گینگ

ہے جو اپنے مخالفین کی آواز دبانے کے لئے بڑی تندہی سے کام کرتا ہے۔ حال ہی میں ایک رپورٹ آئی تھی جس کا تعلق بی جے پی کی آئی ٹی سیل کے کام کرنے کے طریقے سے متعلق تھا۔ جہاں ایک شخص سماجی روابط کی ویب سائٹوں پر کئی کئی ناموں سے آئی ڈی بنا کر دن بھر صرف مخالفین کو گالیاں دے کر نفسیاتی طور پر ان کو کمزور کرتا ہے۔ جن میں وہ صحافی بھی ہوتے ہیں جو آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ میں کسی ایک صحافی کا نہیں لینا چاہتا لیکن متعدد ایسے صحافی ہیں جنہوں نے اپنے اس دکھ کو سماجی روابط کی ویب سائٹ پر لکھا اور بتایا کہ کس طرح ہندتواوادی تنظیموں کے رضا کار اور آئی ٹی سیل والے ان کو اور ان کے اہل خانہ کو ٹارچر کرتے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ جب حکمراں پارٹیاں ہی ایسا آئی ٹی سیل چلاتی ہوں تو پھر صحافت آزادانہ طور پر کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لئے سب سے پہلے سیاسی جماعتوں کو اپنے نظریات کے حامل افراد کو یہ باور کرانا ہوگا کہ ان کو کسی بھی صورت میں پر تشدد نہیں ہونا ہے اگر سیاسی جماعتیں اس جانب قدم نہیں بڑھاتی ہیں یا ایسے افراد کی حوصلہ شکنی کے بجائے ان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں تو جمہوریت کا یہ چوتھا ستون مکمل طور پر منہدم ہوجائے گا۔ اسی طرح میڈیا ہاؤسیز کے مالکان و ذمیداران نے اگر اپنا رویہ ذاتی مفادات کا رکھا اور صحافیوں کو صرف اس لئے خوف زدہ کیا یا ان کو اپنے ادارہ سے نکال کر باہر کیا تو پھر ہماری صحافت آزاد نہیں رہ سکتی ہے اور پھر پورا معاشرہ ایک طرح کی گھٹن کا شکار ہوجائے گا۔

یہ رپورٹ اس لئے بھی اہم ہے کہ یہ پریس کا دور ہے، جس کی آزادی سے عوام کی آزادی کی ریٹنگ کی جاتی ہے، زرد دیمک کی وجہ سے ہم اس وقت 140 مقام پر ہیں، جبکہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہیں لیکن اس کا چوتھا ستون انہدام کی طرف جا رہا ہے جس کو مضبوط کرنا ہم سب کا فریضہ ہے۔

# الیکشن کمیشن کی غیرجانبداری پر سوالیہ نشان

الیکشن کمیشن براہ راست جمہوریت کے ان چار ستونوں (عدلیہ،مقننہ،انتظامیہ اور صحافت) میں شامل نہیں ہے جو اس کی بنیاد ہیں البتہ اس کو انتظامیہ کے زمرے میں شمار کیا جائے گا جس میں اور بہت سے شعبے آتے ہیں۔لیکن ایک دور ایسا آتا ہے جب الیکشن کمیشن کلی طور سے جمہوریت کا نگہبان ہوجاتا ہے،یہ وہی وقت ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ شفاف الیکشن کرائے لیکن ایسا نہیں ہورہا ہے۔1950 میں جب الیکشن کمیشن قائم کیا گیا تو یہ ادارہ یک رکنی تھا لیکن 16 اکتوبر 1989 میں اس میں مزید دو ممبر جوڑ دیئے گئے تاکہ جہاں واحد الیکشن کمشنر کا بوجھ کم ہو وہیں فیصلوں میں غلطیاں نہ ہوں۔الیکشن کے ایام میں سب سے زیادہ طاقت اس ادارے کے پاس آجاتی ہیں کیونکہ کسی بھی افسر کے تبادلے سے لے کر اس کو معطل اور برخاست کرنے تک کی طاقت اس کے پاس آجاتی ہیں جس کا مقصد صرف اور صرف شفاف الیکشن ہوتا ہے۔

یہ پہلی بار ایسا ہوا ہے جب چاروں طرف سے الیکشن کمیشن پر نہ صرف انگلیاں اٹھ رہی ہیں بلکہ سپریم کورٹ کو بھی الیکشن کمیشن کی سرزنش کرنی پڑی کیونکہ وہ اپنا کام وقت پر نہیں کررہا تھا۔جمہوریت میں ہر شخص برابر ہوتا ہے۔راجہ اور رنک دونوں کے حقوق برابر ہوتے ہیں،ایسے میں اگر کسی کے ساتھ جانبداری برتی جائے تو اس کے دوررس منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔جب سے الیکشن شروع ہوئے ہیں وزیراعظم کو اب تک نو معاملات میں کلین چٹ مل چکی ہے۔اہم بات یہ ہے کہ یہ کلین چٹ تینوں الیکشن کمشنروں کی اتفاق رائے سے نہیں ملی ہے بلکہ اشوک لواسا نے نے پانچ میں سے چار معاملات (جن کا تعلق وزیراعظم نریندر مودی سے تھا) میں دوسرے الیکشن کمشنروں سے الگ اپنا موقف رکھا۔اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ رہی کہ انھوں نے بعد میں اس سلسلے میں میڈیا سے گفتگو کرنے اور کچھ بولنے سے انکار کردیا۔

وزیراعظم نریندر مودی اور بھاجپا کے قومی صدر امت شاہ اس وقت شتر بے مہار ہیں،ہر

طرف سے لوگ چیخ رہے ہیں، مخالف پارٹیاں الیکشن کمیشن کے سامنے عرضی پر عرضی دے رہی ہیں لیکن اس کو ان دونوں لیڈران کے بیانات میں کوئی کمی نہیں دکھائی دیتی ہے۔اس کو لگتا ہے کہ یہ دونوں لیڈر ماڈل کوڈ آف کنڈکٹ کی خلاف ورزی نہیں کر رہے ہیں۔

ایک طرف عدالت حکم دیتی ہے کہ کوئی بھی امیدوار یا پارٹی الیکشن میں ووٹ کے لئے فوج کا کسی بھی طرح سے استعمال نہیں کر سکتی ہے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی تصور کی جائے گی۔وزیر اعظم نریندر مودی اور امت شاہ عدلیہ کے اس حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کرتے ہیں اور چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ" نئے ووٹرس بالاکوٹ میں ہوائی حملہ کرنے والے ہیرو کے نام اپنا پہلا ووٹ کریں"۔لیکن الیکشن کمیشن کو لگتا ہے کہ ووٹ کے لئے یہ فوج کا استعمال نہیں ہے۔جس بات کو ہندستان کے ناخواندہ لوگ سمجھ لیتے ہیں اس کو ہمارا الیکشن کمیشن سمجھنے سے قاصر ہے۔ایسا کیوں ہے؟اس کے بھی اسباب اور وجوہ ہیں۔جس کا اندازہ اشوک لواسا کی اس چٹھی سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنے موقف کے خلاف فیصلہ کے بعد سادھی۔ہندستان میں مودی اور شاہ دو ایسے افراد ہیں جو اس وقت بے پناہ طاقت کے مالک ہیں،ان کے سامنے سب کچھ ہیچ ہے۔ہندستان کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا جب ایک چیف جسٹس نے کھانے پر وزیر اعظم کا دو گھنٹے تک انتظار کیا۔فوج کو سیاست میں گھسیٹنے کے کتنے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے اس کا اندازہ پڑوسی ملک پاکستان سے لگایا جاسکتا ہے،اسی لئے عدالت نے سختی سے منع کیا تھا کہ فوج کی سیاست کاری نہ کی جائے لیکن بھاجپا نے اس کے حکم کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں،جس کی نظر میں حصول اقتدار ہی سب کچھ ہے اسی طرح الیکشن کمیشن بھی اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ پا رہا ہے۔

الیکشن کمیشن جن باتوں کے لئے مایاوتی، اعظم خاں یہاں تک کہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ

یوگی آدتیہ ناتھ کے خلاف تادیبی کارروائی کر دیتا ہے ان ہی باتوں کے لئے وزیر اعظم نریندر مودی اور امت شاہ کے خلاف کارروائی نہیں کرتا ہے۔ ماڈل کوڈ آف کنڈکٹ اور پیوپل ایکٹ 1951 کی خلاف ورزی اور دفعہ 131 کے تحت ہیٹ اسپیچ کے لئے ان دونوں لیڈران کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے تھی لیکن الیکشن کمیشن یہ کہہ کر ان دونوں کو کلین چٹ دے دیتا ہے کہ بادی النظر میں یہ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی نہیں ہے۔

وزیر اعظم اپنی انتخابی ریلیوں میں جے شری رام کے نعرے کا مسئلہ اٹھاتے ہیں اور امت شاہ بنگال کی انتخابی ریلی میں جے شری رام کے نعرے لگاتے ہیں لیکن الیکشن کمیشن کی نظر میں نہ تو یہ ہیٹ اسپیچ ہے اور نہ ہی اس نعرے کے ذریعہ مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے ووٹ لینے کی کوشش ہے۔ مسلم لیگ الیکشن کمیشن میں رجسٹرڈ ایک سیاسی پارٹی ہے، جس کا سبز جھنڈا ہے، کانگریس جب اس سے اتحاد کرتی ہے تو مذہبی بنیادوں پر عوام کے جذبات برانگیختہ کئے جاتے ہیں اور شمالی ہند میں اس سبز جھنڈے کو دکھا کر ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن الیکشن کمیشن کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور اس کی نظر میں یہ ہیٹ اسپیچ دفعہ 131 کے تحت نہیں آتا۔ لیکن اگر اعظم خاں بغیر کسی کا نام لئے کہہ دیں کہ اس کی نیکر خاکی ہے تو الیکشن کمیشن فوراً اس بیان اور اس کی منشا کو سمجھ کر کارروائی کر دیتا ہے، لیکن وہ انتخابی ریلی میں جے شری رام کے نعرہ اور اس کے منشا کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہ اگر دوہرا معیار نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ پورے ہندستان کے کسی بھی لیڈر میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ انتخابی ریلی میں اللہ اکبر کا نعرہ لگا سکے، اگر غلطی سے بھی کوئی ایسا کر دے تو جہاں ایک طرف الیکشن کمیشن کے کوڑوں سے اس کی پیٹھ لال ہو جائے گی وہیں دوسری طرف مذہبی بنیادوں پر جذبات کو برانگیختہ کر کے ووٹ حاصل کرنے والے وزیر اعظم نریندر مودی اور امت شاہ ہی نہیں بڑے بڑے لبرل اور سیکولر لوگ تلملا اٹھیں گے۔ الیکشن کمیشن

میں بھی یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ انتخابی ریلیوں میں اللہ اکبر کی صدا کی اجازت دے دے لیکن اگر امت شاہ اور وزیر اعظم نریندر مودی ہیں تو پھر اس کے متوازی نعرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کہنے کو الیکشن کمیشن کے پاس بڑی طاقتیں ہیں لیکن آج تک ہیٹ اسپیچ کے معاملے میں کسی کو ایسی سزا نہیں ملی کہ وہ دوسروں کی عبرت کا سامان بنے، انتخابات کے ایام میں ہزاروں کی تعداد میں ایف آئی آر ہوتی ہیں لیکن ان کا کیا ہوتا ہے کچھ بھی نہیں، لیڈر جانتے ہیں کہ ان کا کچھ نہیں ہونے والا ہے الیکشن کمیشن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ اسی لئے وہ کھلے عام دھمکیاں بھی دیتے ہیں۔ حال ہی میں مینکا گاندھی نے جس طرح سے کھلی دھمکی دی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں مگر ان کا کیا بگڑا؟ الیکشن کمیشن ان کا بال باکا نہیں کر سکا، بس اتنا تھا کہ الیکشن کمیشن ہیٹ اسپیچ اور ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی پر چند گھنٹوں کی پابندی عائد کر دیتا تھا جیسا کہ اس نے مایاوتی، اعظم خاں اور یوگی آدتیہ ناتھ کے معاملے میں لیکن امت شاہ اور وزیر اعظم نریندر مودی کے معاملے میں اس نے اس طرح کی تادیبی کارروائی کو بھی مناسب نہیں سمجھا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ الیکشن کمیشن اندھا، بہرا اور لنگڑا لولا ہونے کے ساتھ ہی فاتر العقل بھی ہو چکا ہے کیونکہ ہیٹ اسپیچ اور اس کی منشا ان پڑھ عوام سمجھ لیتے ہیں مگر الیکشن کمیشن نہیں سمجھ پاتا۔

# حقیقی مسائل کا فقدان

جمہوریت میں ہر پانچ برس پر الیکشن اس لیے ہوتے ہیں تا کہ عوام اور سیاسی پارٹیاں دونوں اپنا اور حکومت کا جائزہ لے سکیں، اگر عوام نے غلطی کی ہے وہ اس کی اصلاح کر کے نئی حکومت کا انتخاب کریں اور سیاسی پارٹیوں نے غلطی کی ہے تو خود کو درست کر کے نئے جوش اور نئے روڈ میپ کے ساتھ میدان میں آئیں.

عوام کا صرف ایک کام ہوتا ہے کہ وہ ووٹنگ کر کے نئی حکومت کا انتخاب کریں جبکہ پارٹیوں کے دو کام ہوتے ہیں اول وہ اپنا جائزہ لیں دوم وہ دوسری پارٹیوں اور خامیوں کو اجاگر کر کے خود سب سے بہتر کے طور پر پیش کریں. اس سطح پر جب ہم پولیٹیکل پارٹیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو سبھی پارٹیاں حمام ایک طرح نظر آتی ہیں لیکن عوام ہمیشہ رولنگ پارٹی کا جائزہ سب سے زیادہ گہرائی سے لیتے ہیں کہ اس نے اب تک کیا کیا ہے اسی طرح رولنگ پارٹی جب الیکشن میں آتی ہے تو وہ پانچ برس میں کیے گیے اپنے کاموں کو بنیاد بناتی ہے۔ جس طرح 2014 کے الیکشن میں کانگریس کے پاس عوام کو بتانے کے لئے کوئی کام نہیں تھا جبکہ اس کے مقابلے بی جے پی نے خود کو صاف شفاف شبیہ کے ساتھ ہی عوام کی امیدوں کو پورا کرنے والا بتایا اور حکومت حاصل کر لی، پانچ برس تک جو فضا رہی اور اس نے کام کیا اس کا لیکھا جوکھا ٹائم میگزین نے اپنے ایک مضمون میں پیش کر دیا۔ جس نے پوری سیاسی بساط کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ اس مضمون کو اگر درکنار کر دیا جائے تب بھی بی جے پی کے پاس کچھ ایسا نہیں تھا جس کے دم پر وہ عوام سے ووٹ مانگتی، جس کی جھلک صاف طور پر وزیر اعظم نریندر مودی کی تقریروں میں دکھائی دی۔ یہ وہی وزیر اعظم ہیں جو 2014 میں گرجتے اور برستے دکھائی دیتے تھے۔ کانگریس کی نیند حرام کر دی تھی اور گجرات کو ایک ایسے ماڈل کے طور پر پیش کیا تھا گویا ہندستان میں گجرات کے علاوہ کہیں کوئی کام نہیں ہوا ہے لیکن اس بار وزیر اعظم کی تقریر سے ترقی اور وکاس کے ساتھ ہی عوام سے متعلق سبھی مسائل

غائب تھے۔وزیر اعظم کی کوئی ایسی تقریر نہیں تھی جو 2014 کی کسی ایک تقریر کا مقابلہ کر سکتی کیونکہ پورے پانچ برس میں انہوں نے کوئی ایسا قابل ذکر کام نہیں کیا تھا۔خواتین سے متعلق اجولا اسکیم کی الیکشن سے قبل خوب تشہیر کی گئی تھی لیکن جب بی جے پی کے ترجمان سمبت پاترا اپنے حلقہ انتخاب میں گئے اور غریبوں کے ساتھ کھانے پینے کا ڈھونگ رچنا شروع کیا تو اس کی بھی حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ وہی گھر جہاں وہ گئے وہاں کی عورتیں لکڑی کے چولہوں پر دھواں میں کھانے پکانے پر مجبور ہوئیں۔

وزیر اعظم نریندر مودی نے خود اپنی کسی تقریر میں روزگار اور کسانوں کے مسائل کو نہیں اٹھایا نہ ہی انہوں نے یہ بتایا کہ پانچ برس میں انہوں نے نوجوانوں کے لئے کیا کیا ہے۔نوجوان کسی بھی ملک کی امید اور اس کا مستقبل ہوتے ہیں جبکہ ہندستان میں کسان ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں وزیر اعظم کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اپنی کسی تقریر میں ان کا ذکر کر سکیں اسی طرح انہوں نے ندیوں کی صفائی کا بھی ذکر نہیں چھیڑا اور نہ ہی کرپشن پر کوئی بات کی ہاں اگر بات کی تو صرف اتنی کہ وہ داماد کو جیل کے دروازے تک لے آئے ہیں اگلے پانچ برس کی حکومت اگر ان کو مل گئی تو وہ ان کو جیل میں پہنچا دیں گے۔ایسا لگتا ہے کہ ہندستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے ان کی نظر میں حالانکہ گذشتہ پانچ برسوں میں داماد کے خلاف بھی وہ قابل ذکر کوئی کارروائی وہ نہ کر سکے۔

سو اسمارٹ سٹی اور بلٹ ٹرین کی بڑے زور وشور کے ساتھ تشہیر کی اور کروڑ ہا کروڑ روپئے اس پر خرچ کئے لیکن کسی ایک جلسے میں انہوں نے نہیں بتایا کہ ہندستان کے کس کونے میں اس اسمارٹ سٹی کا وجود پایا جاتا ہے۔اگر ہم وزیر اعظم کی تقریر کی روشنی میں ان کی حصولیابیوں کا جائزہ لینا چاہیں تو ہمیں جذباتی استحصال کے علاوہ کچھ نہیں دکھائی دے گا۔اور دکھائی کیسے دے گا اگر کام کیا ہوتا تو یقیناوہ اس کو سامنے لے کر آتے اور بتاتے کہ انہوں نے کام کیا ہیمگر ان کی جھولی اس سے بالکل خالی تھی۔ان کے سبھی انتخابی جلسے کانگریس کے ارد گرد ہی رہے،انہوں نے جس طرح پورے پانچ برس کانگریس کو ذمہ دار ٹھہرایا اسی طرح وہ اس الیکشن میں بھی یہی بتاتے رہے کہ

کانگریس نے یہ کیا وہ کیا اور حد تو تب ہوگئی جب انہوں نے نہرو اور ان کے ناتی اور ملک کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کو اس الیکشن میں گھسیٹ لیا، انہوں نے اگستا ویسٹ لینڈ اور نیوی کے بحری جہاز کا مسئلہ اٹھایا کہ یہ ملک کے تحفظ کے ساتھ کھلواڑ تھا۔ شاید ان کو پتہ نہیں کہ ملک اب بہت آگے بڑھ چکا ہے نہ ان مسائل میں کوئی دم ہے اور نہ ہی ان کا تعلق عوام اور ان کے تحفظ سے ہے، اسی طرح انہوں نے 1984 کے دنگوں کا ذکر کیا، آج کے حالات میں اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی کیونکہ مجرم کیفر کردار تک پہنچ چکے ہیں۔ وزیر اعظم نے مدھیہ پردیش کے وزیر اعلی کمل ناتھ کو وزیر اعلی بنائے جانے پر تو سوال اٹھاتے ہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ 2002 میں گجرات میں اس سے کہیں زیادہ بھیانک فسادات ہوئے تھے جس کے ذمہ دار وہ خود تھے اگرچہ وہ دستاویزی طور پر خود کو سزا سے لے گئے لیکن حقیقت یہی ہے کہ گجرات فسادات کے ذمہ دار وہی تھے اور مسلمانوں و معصوموں کی لاشوں پر ہی ان کو وزارت عظمی کی کرسی ملی تھی۔

وزیر اعظم نریندر مودی ایک ایسے لیڈر ہیں جو ہر بات کو اپنے حق میں کرنے کا ہنر جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پلواما میں ہوئے حملہ جب 40 فوجی شہید ہوئے تو اس پر شرمندگی کا اظہار کرنے یا اس کی ذمہ داری لینے کے بجائے اس کو بھی اپنے حق میں کر لیا جس میں میڈیا نے ان کا پورا ساتھ دیا۔ وزیر اعظم نریندر مودی شاید بھول گئے کہ وہ 2014 کے الیکشن میں چیخ چیخ کر کہتے تھے کہ فوج مرکز کے ہاتھ میں ہے، سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری مرکز کے ہاتھ میں ہے پھر دہشت گرد کیسے ملک میں آتش گیر مادے کے ساتھ داخل ہوجاتے ہیں لیکن وہ یہاں بھول جاتے ہیں کہ اب ان کی حکومت ہے۔ اسی طرح مہاراشٹر میں نکسلی حملے میں جب 15 جوان شہید ہوئے تو وزیر اعظم نے ان کا ذکر تک نہ کیا۔ پلواما کا ذکر صرف اس لئے کیا تھا کیونکہ ایئر اسٹرائک کر کے اس کا کریڈٹ لینا چاہا جب کہ نکسلیوں کے حملہ میں وہ تہی دست تھے۔

مجموعی طور پر وزیر اعظم نریندر مودی کی سبھی انتخابی ریلیوں میں کی گئی تقریروں کا تعلق صرف جذبات سے رہا، زمینی حقائق کو چھیڑنے کی بھی ان میں ہمت نہ ہوئی، یہی وجہ ہے ان کی

تقریروں میں پہلے کی طرح جوش وخروش نہیں رہااور اگر کچھ رہا بھی تو وہ جھوٹ پر مبنی دعوں میں تھا۔وزیر اعظم نریندر مودی جو پانچ برس تک میڈیا سے بچتے رہے ایک بھی پریس کانفرنس نہیں کی الیکشن شروع ہوتے ہی ان کے انٹرویوز کی باہر آگئی اور ان میں جس طرح سے انہوں نے دعوے کئے اس سے بین القوامی سطح پر ملک شرمسار ہوا ہے۔اپنے انٹرویوز میں وہ ایسی باتیں صرف اس لئے بولتے رہے کیونکہ زمینی کام ان کے پاس نہیں تھا ورنہ وہ اپنا وقت کیوں برباد کرتے یہ تو انہوں نے صرف اس لئے کیا تھا تاکہ وہ خبروں میں بنے رہیں۔

23 مئی کو الیکشن جب نتائج آئیں گے اس وقت ان کو اندازہ ہوگا کہ جو انہوں نے پانچ برس میں بویا تھا وہی وہ کاٹ رہے ہیں،البتہ ایک خدشہ ضرور ہے جس کا اظہار کیا جانا ضروری ہے۔ایک بھی ای وی ایم ایسی نہیں نکلی ہیں جنہوں نے غلطی سے بی جے پی کے علاوہ کسی دوسری پارٹی کو ووٹ دیا ہو،اگر اس سطح پر الیکشن مینج ہوا ہے تو یقینی طور پر وزیر اعظم نریندر مودی کو کوئی نہیں ہرا سکتا ہے ورنہ کوئی ان کو اکثریت کے ساتھ کامیاب نہیں کرسکتا ہے۔

# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، نیا ایجنڈا اور سیکولرزم

علی گڑھ پارلیمانی حلقہ سے دوبارہ جیت کے بعد ممبر پارلیمنٹ ستیش گوتم نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسئلے کو نہ صرف چھیڑا بلکہ انہوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ اسٹوڈنٹ یونین کی بلڈنگ میں لگی محمد علی جناح کی تصویر پاکستان بھیجی جائے گی، یونیورسٹی میں مندر بنے گا اور ایس سی، ایس ٹی کو ریزرویشن ملے گا۔ یعنی انہوں نے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار سے متعلق اپنے نئے ایجنڈے کا پہلی فرصت میں اعلان کر دیا ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے معطل طالب علم اجے سنگھ کی کلی طور پر حمایت کا اعلان کیا، یہ وہی طالب علم ہے جس نے مندر تعمیر کا مسئلہ اٹھایا، جناح کی تصویر کے ساتھ ہی ممبر پارلیمنٹ اسدالدین اویسی کی آمد کی پرتشدد مخالفت کی تھی، اب اس بات کا خدشہ مزید بڑھ گیا ہے کہ یونیورسٹی کے حالات خراب کرنے کی کوششیں دوبارہ کی جائیں اور سیکولرزم کے نام پر یہاں مندر تعمیر کا مسئلہ اٹھایا جائے۔ ملک کو سب سے زیادہ خطرہ اسی نام نہاد سیکولرازم سے ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندستانی مسلمانوں کی شہ رگ ہے جو سیکولرازم کی علمبردار ہے۔ یہاں سے سیکولرازم کے سوتے پھوٹتے ہیں، یونیورسٹی کے در و دیوار اس کے گواہ ہیں، کوئی بھی بادی النظر میں اس کی طرز تعمیر دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ یہ انڈو اسلامک طرز تعمیر کی نمائندہ عمارتیں ہیں مگر یہاں کا اسٹریچی ہال جو اس کی شناخت ہے وہ گوتھک طرز تعمیر پر مبنی ہے، اس کے باوجود اے ایم یو اس سیکولرازم کی علمبردار ہے جس کی ملک کو ضرورت ہے۔ یہاں کھانے اور دکھانے کے الگ الگ دانت نہیں ہیں جیسا کہ ملک کی متعدد تنظیمیں اپنے سیکولرزم کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ چونکہ اے ایم یو صرف ایک دانش گاہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تحریک ہے جس کی ایک خالص فکر ہے، ایسے میں اس بات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے کہ اس فکر میں سیکولرزم اور فکری تشدد کے عناصر کس مقدار میں ہیں، اے ایم یو ابتدا سے ہی فکری تشدد سے دور رہی ہے جس کی وجہ سے اس کے بانی سرسید احمد

خاں مختلف قسم کے فتوؤں کا بھی سامنا کرنا پڑا، جب محمڈن اینگلو اورینٹل عربک کالج کا قیام 1975 میں ہوا اور سرسید احمد خاں کی تحریک کے خطوط روشن ہونا شروع ہوئے تو انہوں نے واضح کردیا کہ یہ کالج اور اس کی فکر تعمیری ہوگی اور یہاں کے رہنے والے ہندو مسلم کے مذہبی جذبات و احساسات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا، سرسید نے واضح کردیا تھا کہ ایم او کالج میں کبھی گائے کا گوشت نہیں پکے گا، 1873 میں جب میرٹھ میں گائے کی قربانی کے مسئلہ پر تنازعہ ہوا جو بعد فرقہ وارانہ فساد میں تبدیل ہوگیا تو انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ رضا کارانہ طور پر گائے کی قربانی چھوڑ دیں کہ اس کی قربانی اسلامی تعلیمات کا لازمی جز نہیں ہے۔

یونیورسٹی میں مندر تعمیر کر کے سیکولرزم کو فروغ دینے کی بات تو کی جاتی ہے لیکن کبھی کوئی کیمپس میں سیکولرازم کی عملی حقیقت پر بات نہیں کرتا، بیس سے پچیس فیصد غیر مسلم طلبا جو اپنے مسلم ساتھیوں کے ساتھ ہاسٹلوں میں زندگی کا ایک عرصہ گذارتے ہیں ان کے شب و روز کیسے گذرتے ہیں، ان کا اساتذہ اور انتظامی امور کے افسران سے ہمیشہ سابقہ رہتا ہے۔ ان ہی سے یونیورسٹی میں حقیقی سیکولرزم کی معلومات ہوگی، اور یہی یونیورسٹی کے فکر کی سب سے بہتر ترجمانی کر سکتے ہیں، وہ لوگ نہیں جو نام نہاد قومیت اور وطنیت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

ماہ رمضان المبارک مسلمانوں کا سب سے مذہبی مہینہ ہے جس میں وہ اسلامی تعلیمات کا نمونہ بن جاتے ہیں، اگر کسی کو سیکولرزم کا مشاہدہ کرنا ہے تو اس کو اس ماہ میں یہاں ضرور آنا چاہئے، جہاں غیر مسلم طلبا اپنے مسلم ساتھیوں کے لئے افطار تک کا اہتمام کرتے ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جب غیر مسلم ساتھیوں کی افطار میں دعوت نہ رہتی ہو۔ افطار میں ہندو مسلم طلبا ایک ساتھ افطار کرتے ہیں اور ملک میں امن ومحبت کی دعا کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ صرف دکھاوے کے لئے ہو بلکہ یہ سب طلبا اپنے ساتھیوں کی محبت میں کرتے ہیں، جہاں ایک طرف غیر مسلم طلبا کو یہ نہیں احساس ہونے دیا جاتا کہ وہ غیر مسلم ہیں، اسی طرح غیر مسلم طلبا بھی اپنی جانب سے اپنے دوستوں کے افطار کے لئے خود سے اہتمام کرتے ہیں جو قابل دید ہوتا ہے۔ سحر

میں جہاں مسلم طلبا کے لئے کھانے کا انتظام ہوتا ہے تو وہیں غیر مسلم طلبا کے لئے صبح ناشتے اور دوپہر میں کھانے کا انتظام رہتا ہے تاکہ ان کو کسی صورت میں پریشانی نہ ہو، البتہ بعض غیر مسلم طلبا بھی سحر میں اپنے مسلم ساتھیوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں سر سید ہال جنوبی کی پرووسٹ ڈاکٹر بدرالدجی خان نے ہاسٹل میں قیام پذیر طلبا کے لئے افطار کا اہتمام کیا تو غیر مسلم طلبا کو خصوصی طور پر مدعو کیا، یہ ایسا موقع ہوتا ہے جب سب مذہبی ہو کر بھی مذہبی نہیں ہوتے بلکہ صرف ہندستان کے دو سپوت ہوتے ہیں جو ملک کی دو آنکھیں اور دو بانہیں ہیں، یہ یہاں کی قدیم روایت ہے یوں تو سبھی ہاسٹلوں میں اس طرح کے انتظامات ہوتے ہیں لیکن چونکہ سرسید ہال جنوبی اے ایم یو کا دل اور اس کی شناخت ہے اس لئے یہاں ہونے والی تقریبات زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔

میرے ایک دوست تھے پردیپ کمار شرما جو میرے ساتھ سرسید ہال جنوبی کے کمرہ نمبر 55 میں قیام پذیر تھے، ان کا کہنا تھا کہ مجھے ماہ رمضان کا انتظار رہتا ہے، کیونکہ اس مہینے میں جہاں روزانہ دعوتیں ہوتی ہیں وہ دوسری طرف رات جاگنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے، وہ یومیہ صبح فجر کے وقت اٹھ کر پوجا کے لئے جاتے اور واپسی پر ساتھیوں کو پرساد دیتے، کسی فیکلٹی یا طالب علم کو یہاں کے مذہبی ماحول سے کوئی شکایت نہیں رہی، کبھی کسی نے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ اس کے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ بھید بھاؤ کیا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ وہ منظر نامہ ہے جو دنیا کے کسی خطے میں دکھائی نہیں دے گا۔

سیاست دانوں اور نیشنل میڈیا کو جناح کے علاوہ یہاں برتی جانے والی سیکولرزم دیکھنا چاہیے اور ملکی سطح پر اس کی تشہیر کر کے پورے ملک کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فضا میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، اس سے ملک کا بھلا ہوگا اور تعصب و نفرت کی آگ میں جلتا ہوا ملک اخوت و محبت کی باد بہاری میں بدل جائے گا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ تعصب و نفرت کے سوداگروں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی محبت والی فضا راس کہاں آتی ہے، وہ کب دیکھنا چاہیں گے کہ ملک کے

دوسپوت اخوت ومحبت کے ساتھ زندگی گذاریں؟ ایسے میں ان کی سیاست کا کاروبار بند ہو جائے گا، اس لئے اے ایم یو کو بدنام کرنے اور مسلمانوں کو فکری طور پر متشدد دکھانے کے لئے جناح کی تصویر تو کئی دنوں تک نیشنل میڈیا کا حصہ رہتی ہے، اس پر ڈبیٹ ہوتے ہیں، یہاں کی نقاب پوش بچیوں کو روک کر ان سے نقاب سے متعلق سوالات کئے جاتے ہیں اور اپنی زبان ان کے منھ میں ڈال کر ایسی بات کہلانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے وہ یونیورسٹی کو بدنام کرسکیں لیکن یہاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کررہے لڑکے اور لڑکیوں کے ان خیالات کو جگہ نہیں دی جاتی ہے جو ملک کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرسکتے ہیں، اسی طرح ہاسٹلوں میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے والے اور یونیورسٹی کے مسلم بچوں کو تعلیم دینے والے غیر مسلم اساتذہ کے ان خیالات اور ان کے شب وروز جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی جو ملک کو محبت کی جنت میں تبدیل کرسکتے ہیں۔ ہمارے نیشنل میڈیا اور قومی سیاست کا یہ المیہ ہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں کہ تباہی کا سامان تو کیا جاتا ہے مگر ملک کی تعمیر میں استعمال ہونے والی اینٹ کو توڑ کر اس کو انسانی ترقی کی راہ کا روڑا بنا دیا جاتا ہے، اس لئے ہمیں اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

# ایک طویل مدتی منصوبے کی ضرورت

قوموں کا تشخص ان کا علم وفضل اوران کی صنعت وحرفت ہے،اگرکسی قوم میں یہ دونوں اوصاف نہ پائے جائیں تواس کا وجود عدم کے برابر ہے۔یہ دونوں اوصاف کوئی گھٹی نہیں ہیں جن کوفورا پلادیا جائے اور پوری قوم علم وفضل اور صنعت وحرفت میں ماہر ہوجائے بلکہ طویل مدتی منصوبے اورعمل کے نتیجہ میں قوموں میں یہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو آگے چل کران کا تشخص بنتے ہیں جس کی بہترین مثال جاپان اور اسرائیل ہیں۔

آج کے تناظر میں ہندستانی مسلمانوں کوبھی ایک ایسے طویل مدتی منصوبے کی ضرورت ہے جوان کے وجود کو مستحکم کرے۔یہ منصوبہ تعلیم سے بہتر کوئی نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ تعلیم ہر کامیابی کی شاہ کلید ہے۔ہندستان میں ایک ایسی پارٹی کی حکومت اکثریت کے ساتھ دوبارہ آئی ہے جس کا ایک خاص نظریہ ہے۔یہ وہ پارٹی ہے جو تاریخ کوبھی خاص چشمے سے دیکھتی ہے،اس کا خواب ہے کہ ہندستان کوہندوراشٹر بنایا جائے۔"راشٹریہ سہارا اردو" نے 24 مئی کے شمارے کی شاہ سرخی "ہندستان سیاست کے نئے دور میں داخل" لگائی تھی جو مبنی برحقیقت ہے۔اگر ہندستان سیاست کے نئے دور میں داخل ہوچکا ہے توہندستان کے مسلمانوں کواس نئے دور کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کوتیار کرنا ہوگا۔

1857 کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کوذلت ونکبت سے باہر نکالنے کا منظم کام سر سید احمد خاں نے شروع کیا۔انہوں نے جہاں ایک طرف "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر انگریزوں کوان کی غلطیاں یاد دلائیں تو دوسری جانب انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اور 1874 میں ایم اوا ے کالج قائم کردیا جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانی جاتی ہے جوعصری علوم سے ملک وقوم کولیس کررہی ہے،حالانکہ اس وقت ان کے پاس کوئی رول ماڈل نہیں تھا لیکن جب انہوں نے غوروفکر کیا توتعلیم ہی سب سے

بہتر راستہ دکھائی دیا، جس کے نتائج آج ہم دیکھ رہے ہیں، اس وقت ہمارے پاس تو بہت سے ماڈل ہیں، سرسید ماڈل کے ساتھ ہی اور دیگر ماڈل ہیں جن کو پیش نظر رکھ ایک طویل مدتی منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔

حالات کی سنگینی 1857 سے کسی قدر کم نہیں ہے، اس وقت خوف انگریز حاکم کا تھا لیکن آج یہ خوف ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ ہجومی تشدد ایک عام بات ہوگئی ہے۔ ابھی حال ہی میں بریلی میں جو واقعہ رونما ہوا وہ بین الاقوامی سطح پر ملک وقوم کی بدنامی کا سبب بنا 'العربیہ' جیسے میڈیا ہاؤس نے اس کو رپورٹ کیا، ویڈیوں شیئر کی جس میں کھانا کھاتے ہوئے چار مسلم لڑکوں کو حکومت کے نشے میں چور سات آٹھ نوجوان بیلٹ سے پیٹ رہے تھے اور گندی گندی گالیاں دے رہا تھے ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ بھینس کا گوشت کھا رہے تھے جو شاید گھر یا ہوٹل سے لائے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی ہندستان میں کیا حالت ہے۔ اگر کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کیا گیا اور طویل مدتی منصوبہ نہیں بنایا گیا تو ایک صدی کے اندر اندر ہندستان دوسرا اسپین بن جائے گا۔ میں یہ باتیں اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ عوام میں خوف پیدا ہو بلکہ حقیقت سے روشناس کرانے کی کوشش کر رہا ہوں، اگر ان حالات کو بدلنا ہے تو تعلیمی سطح پر ہمیں بیدار ہونا ہوگا اور سرسید احمد خاں کی طرح دوسری علی گڑھ تحریک ہمیں شروع کرنا ہوگا۔

اس وقت ملک کی مختلف ریاستوں میں متعدد تعلیمی وفلاحی ادارے کام کر رہے ہیں جس کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے لیکن ملک کے حالات یہ بتاتے ہیں کہ جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ کافی نہیں ہیں۔ اسی طرح جو ادارے ہیں آبادی کے تناسب سے کافی کم ہیں۔ اس کی دو تین مثالیں میں بطور ماڈل پیش کرتا ہوں جس پر عمل کر کے ہم اپنا ایک نظام تعلیم تیار کر سکتے ہیں۔

انجمن اسلام ممبئی ایک ایسا ادارہ ہے جس کے تحت اس وقت پرائمری، سکنڈری، پالی ٹکنک ، انجینئرنگ، فارمیسی ، آرکیٹکچر ، منیجمنٹ اسٹڈیز، ہوٹل منیجمنٹ اینڈ کیٹرنگ ٹیکنالوجی، یونانی میڈیکل کالج،، ٹیکنکل اینڈ پروفیشنل کیلئے تقریبا95 کالج چل رہے ہیں۔

الامین ایجوکیشنل سوسائٹی بنگلورا س وقت میری دانست کے مطابق پورے ملک میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیمی سوسائٹی ہے جسے ممتاز احمد خاں نے 1966 میں قائم کیا جس کے تحت اس وقت الامین کالج آف فارمیسی ،الامین کالج آف لا ،الامین انسٹی ٹیوٹ آف منیجمنٹ ،الامین ڈگری کالج ،الامین پرائمری اینڈ ہائی اسکول،الامین انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن سائنس ،الامین ہاسپٹل،الامین کالج ،الامین ریزیڈینٹل اسکول،الامین پری یونیورسٹی سمیت تقریباڈھائی سواسکول وکالج بنگلور،میسور،چناپٹنا،مہاراشٹرا،دہلی سمیت متعدد ریاستوں اوراور شہروں میں تعلیمی امورانجام دے رہے ہیں۔

انجمن اصلاح المسلمین لکھنؤ کے تحت ممتاز پی جی کالج ،ممتاز دارالیتامی ،ممتاز سینئر سکنڈری اسکول سمیت متعدد اسکول وکالج لڑکے اورلڑکیوں کے لئے چل رہے ہیں۔اسی طرح کلکتہ کی انجمن مفیدالاسلام ہے لیکن اس کی حالت بہت دگرگوں ہے۔یہ وہ چندادارے ہیں جومسلمانوں کے قائم کردہ ہیں جن سے ملک وقوم مستفید ہورہی ہے لیکن یہ ناکافی ہیں،کیونکہ ان کا دائرہ اپنے اپنے شہروں بلکہ علاقوں تک محدود ہے،اس لئے جہاں ان میں توسیع کی ضرورت ہے،وہیں ایسے مینٹر کی ان اسکولوں کوضرورت ہے،جوبچوں کوان کی صلاحیت کے اعتبار سے رہنمائی کریں کیونکہ اکثر وبیشتر کا حال یہ ہے کہ دوسرے اسکولوں کی طرح یہاں بھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کوئی راستہ دکھانے والانہیں ہے۔حالانکہ ضرورت صرف تعلیم نہیں بلکہ افرادسازی کی ہے۔ان میں سے کوئی ادارہ شاید ہوجس نے اب تک کوئی ایک آئی اے ایس افسر دیا ہوجس کی سب سے بڑی وجہ عدم رہنمائی ہے۔اس کے ساتھ ہی ان سبھی اور نئے قائم ہونے والے اداروں وسوسائٹیوں کو سینٹر لائز کرنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ ہر ادارہ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھا سکے۔اس سے پورے ملک میں مسلمانوں کا نظام تعلیم سینٹر لائز ہوجائے گا جس کے خاطر خواہ نتائج آج نہیں لیکن محض پچیس برسوں میں دکھائی دینے لگیں گے۔

ایک بات ذہن نشیں رہے کہ آرایس ایس جس کی آج ملک میں حکومت ہے،اورخاص نظریہ

پر مبنی نظام تعلیم ترتیب دے رہی ہے اس نے اپنا آغاز ''ششو مندر'' اور سرسوتی مندر جیسے اسکولوں سے کیا تھا، جس کا نتیجہ ہے کہ آج ان اسکولوں سے پڑھے ہوئے آئی اے ایس افسران ناتھورام گوڈ سے کو سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اب ایسے افسران سے جمہوری نظام کو چلانے کی امید کیسے کی جاسکتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ ہر سطح پر اپنے منظم طور پر اپنے اسکول قائم کئے جائیں۔ جس میں مدارس بڑا اور اہم کردار ادا کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ان کو اپنے نظام تعلیم میں ترمیم کرنا ہوگی۔ دارلعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلما جن مقاصد کے تحت قائم کئے گئے تھے آج وہ اپنے مقاصد سے دور جاچکے ہیں۔ اسی طرح اشرفیہ مبارک پور اور بریلی میں قائم مدارس یک رخی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان مدارس کے قیام کا مقصد قوم کے رہنما پیدا کرنا تھا لیکن شاذ و نادر کو چھوڑ کر آج ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکیں۔ دینی علوم میں تو یقینا مہارت رکھتے ہیں لیکن آج کے دور میں صرف دینی علوم کے ساتھ ہی عصری علوم میں مہارت کے بغیر کامیابی نہیں حاصل کی جاسکتی ہے۔ اگر قوم کے قائد پیدا کرنا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان مدارس سے ڈاکٹر، انجینئر، ٹیکنیشین یہاں تک کہ سائنسداں پیدا ہوں لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے چونکہ پورے ہندستان میں ان مدارس کا جال پھیلا ہوا ہے اس لئے صرف نظام تعلیم اور انفرااسٹرکچر میں تبدیلی کے ذریعہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم دے کر یہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

# فلسطین اور ہندستان کی خارجہ پالیسی

فلسطینی ابابیلیں بیت المقدس کے تحفظ کے لئے آج اپنی جانیں دے رہی ہیں، لیکن سب خاموش ہیں۔ فلسطینی خواتین، نوجوانوں اور بچوں کی ہر شام آخری اور ہر صبح بے نور ہوتی ہے، اس کے باوجود وہ ڈٹے ہوئے ہیں، جمے ہوئے ہیں ایک ایسے ملک کے خلاف جو غیر معلنہ طور پر ایٹمی طاقت کا حامل ہے اور پوری دنیا میں اسلحوں کا سپلائر ہے۔ دوسرے لفظ میں وہ دنیا کے ہاتھوں موت بیچتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اس کی شکل پر ایسی پینٹنگ کی گئی ہے جو موت کے بجائے زندگی دکھائی دیتی ہے۔ فلسطین میں ہر آن تڑپتے ہوئے بچے حقوق انسانی کے علمبرداروں کو دکھائی نہیں دیتے ہیں، نہ وہ خواتین دکھائی دیتی ہیں جن پر فلسطینی فوجی کتے چھوڑ دیتے ہیں۔

ہندستان اہنسا کا داعی ہے، دنیا میں اس کی شناخت اہنساوادی کی ہے، مشرق وسطی میں ہندستان کی پالیسی امن دوست رہی ہے، اس نے ہر اس موقف کی حمایت کی جس میں امن کے امکانات ہوں یہی وجہ ہے کہ ہندستان آزاد فلسطین کا ہمیشہ حامی رہا ہے جس کا دار الخلافہ مشرقی یروشلم ہوگا، ہندستان کا موقف دو قومی نظریہ تھا وہ اسرائیل اور فلسطین دونوں کو بطور الگ الگ ملک دیکھنے کا حامی رہا ہے۔ لیکن جب حالات بدلتے ہیں، حکومتیں بدلتی ہیں تو موقف اور نظریئے سب ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے جب ہندستان نے کھل کر اسرائیل کی حمایت اور فلسطینی کاز کی مخالفت کرتے ہوئے اسرائیل کے حق میں اقوام متحدہ میں ووٹنگ کی۔ حالانکہ یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں تھا، اس میں صرف ایک فلسطینی تنظیم ''شہید'' کو آبزرور/ مشاہد کا درجہ دیا جانا تھا جس سے فلسطین کے حالات اور اس پر ہونے والے مظالم میں کمی کی امید نہیں تھی، ہاں یہ ضرور ہوتا کہ حقوق انسانی کا ایک ادارہ عالمی جمہوریت اور انسانی حقوق کے علمبردار ادارہ اقوام متحدہ میں فلسطینی عوام پر ہونے والے مظالم کو بیان کرسکتا اور دنیا کی توجہ اس جانب مبذول کرا

سکتا تھا لیکن ہندستان نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

فلسطین کی غیر حکومتی تنظیم ''شہید'' ایک فلاحی ادارہ ہے جو انسانی حقوق کی پاسداری کے لئے کام کرتا ہے جس نے اقوام متحدہ کی اکنامک اینڈ سوشل کونسل (ای سی او ایس او سی) میں آبزرور کے درجہ کے لئے درخواست دی تھی جس کے خلاف 6 جون کو اسرائیل نے تجویز 'ایل 15' پیش کر کے اس حقوق انسانی کی تنظیم 'شہید' کو مشاہد/آبزرور کا درجہ دیئے جانے کی مخالفت کی۔ ووٹنگ میں 28 ووٹ اسرائیل کی تجویز کی حمایت میں جبکہ 14 ووٹ اس کی مخالفت میں پڑے۔ اسرائیل کی تجویز کی حمایت میں امریکہ، فرانس، جرمنی انڈیا، جاپان، برطانیہ، جنوبی کوریا اور کناڈا وغیرہ نے ووٹنگ کی جبکہ مخالفت میں چین، روس، ترکی، وینزویلا، یمن، ایران، سعودی عرب اور پاکستان وغیرہ نے ووٹنگ کی۔ اس سے اسرائیلی حکمراں نہ صرف خوش ہیں بلکہ ان کو اس بات پر زیادہ خوشی ہے کہ ہندستان نے ان کی حمایت کی، جس کے دور رس اثرات مستقبل میں دیکھنے کو ملیں گے۔ ہندستان میں اسرائیل کی ڈپٹی چیف مشین مایہ کدوش نے اس بات پر زیادہ خوشی کا اظہار کیا کہ ہندستان ایشیا کا واحد ملک ہے جس نے اقوام متحدہ میں اسرائیل کی حمایت کی۔

اسرائیل کے لئے ابھی تک ہندستان صرف ایک بازار تھا لیکن اسرائیل کی دہائیوں کی محنت رنگ لائی اور اس کو ایشیا میں ایک ایسا دوست مل گیا ہے جو ہر طرح سے توانا اور مضبوط ہے، جس کے کندھے پر بندوق رکھ کر گولی داغنے میں اس کو کسی طرح کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہندستان نے اسرائیل کی حمایت دو اسباب کی بنا پر کی ہے۔ پہلا سبب نظریاتی ہے۔ اس وقت یہاں دائیں بازو کے نظریہ کی پارٹی اقتدار میں ہے، جس کی قیادت وزیر اعظم نریندر مودی کر رہے ہیں۔ وہ پہلے ایسے ہندستانی وزیر اعظم ہیں جنھوں نے اسرائیل کا دورہ کیا تھا۔ 2014 کے بعد جب سے مرکز میں بھاجپا اقتدار میں آئی ہے ہندستان اسرائیل کا تیسرا سب سے بڑا ایشیائی ٹریڈ پارٹنر ہے۔

آر ایس ایس اور اس کے سیاسی بازو بھاجپا کا اسرائیل سے بہت قدیم رشتہ ہے۔ بابا قوم مہاتما گاندھی کا موقف تھا کہ یہودیت/صیہونیت کی بنیاد پر اسرائیل نامی ملک نہیں بنایا جا سکتا

ہے۔ہندستان نے 1947 میں فلسطین کو تقسیم کرکے اسرائیل کے قیام کی مخالفت کی تھی، اس نے 1949 میں اقوام متحدہ میں اسرائیل کو شامل کئے جانے کے خلاف ووٹنگ کی، جبکہ ونا یک دامودر ساورکر، آر ایس ایس لیڈر مادھوسدا شیو گولوالکر فلسطین کے مخالف تھے، وہ اسرائیل کے حامی تھے ۔یہ نظریاتی میل ہی تھا کہ جب اٹل بہاری باجپئی وزیر اعظم ہوئے تو اسرائیل کا وزیر اعظم اور ہزاروں فلسطینوں قاتل ایریل شیرون ہندستان دورہ پر آیا، یہ کسی بھی اسرائیلی وزیر اعظم کا ہندستان کا پہلا دورہ تھا۔حالانکہ کانگریس بھی کم نہیں رہی ہے، اس نے بھی فلسطین کے کاز کو نقصان پہنچایا۔1950 میں جواہر لال نہرو نے اسرائیل سے تعلقات قائم کرلئے تھے البتہ اپنے عرب دوستوں کی وجہ سے انہوں نے سفارت خانہ نہیں قائم کرنے دیا جبکہ پی وی نرسمہا راؤ نے 1992 میں دہلی میں اسرائیل کا سفارت خانہ قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

اس وقت ملکی اور عالمی سطح پر ہوا بھی وزیر اعظم نریندر مودی کے موافق ہے۔ان کو دائیں بازو کے نظریہ والے ووٹروں کو خوش کرنا ہے کیونکہ جب کہیں مسلمان ظلم وستم کا نشانہ بنائے جاتے ہیں تو دائیں بازو کا نظریہ رکھنے والے لوگ خوش ہوتے ہیں اور اپنے حامیوں کو خوشی پہنچانا ان کی ذمہ داری ہے۔دوسری جانب جمہوریت کی سربراہی کا دم بھرنے والے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ بھی دائیں بازو کا ہی نظریہ رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ٹرمپ نے 6 دسمبر کو اعلان کردیا کہ یروشلم اسرائیل کی راجدھانی ہوگی اور امریکہ کا سفارت خانہ بھی وہیں قائم ہوگا۔اسی طرح چند دنوں قبل انہوں نے ایک بار پھر اپنی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 1967 کی جنگ میں اسرائیل کے ذریعہ غصب کردہ گولان کی پہاڑی پر اسرائیل کی عمل داری کو جب تسلیم کیا تو اسرائیل نے وہاں ''ٹرمپ ہائٹ'' کے نام سے یہودی آبادکاروں کے لئے نئی بستی بسانے کا اعلان کردیا۔ٹرمپ اور نتین یاہو وزیر اعظم نریندر مودی کے نظریاتی دوست ہیں ایسے میں بھلا وہ کہاں پیچھے رہ سکتے تھے۔انہوں نے بھی حالات کا فائدہ اٹھایا اور فلسطینی عوام پر اسرائیل کے ظلم وجور کو ہری جھنڈی دے دی۔لیکن شاید ان کو نہیں معلوم ہے کہ اس وقت اسرائیل ہٹلر کا جرمنی ہے جو کسی قسم کے

حقوق انسانی کی پاسداری کوروانہیں رکھتا بلکہ توسیع پسندی پر عمل کرتے ہوئے روزانہ فلسطینی بچوں کے پھول جیسے جسموں کواپنے بموں سے چھلنی کرر ہا ہے مگر ذرہ برابر نہ اس کوشرم آتی ہے اور نہ ہی اس کے دوست شرمسار ہوتے ہیں۔

ہندستان کوایک باراپنے موقف پر نظر ثانی کرنا چاہئے اور ہندستانی مسلمانوں کے جذبات کے احترام اور حقوق انسانی کی پاسداری کے لئے کم ازکم اس سطح پر اسرائیل کی حمایت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ظالم اوراس کے حامی دونوں ظلم میں برابر کے شریک مانے جاتے ہیں اور ہندستان ایک اہنساوادی ملک ہے۔

# لہجے کی تندی میں دبی چنگاری کا مطلب

مانی کلاں جونپور کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جو عام مواضعات کی طرح ہے، جہاں کے لوگ محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی کی گاڑی چلاتے ہیں، ان کا سیاست یا ملکی معاملات سے بس اتنا ہی تعلق ہے جتنا ہندستان کے دوسرے دیہی باشندوں کا ہوتا ہے جو صرف ووٹ اور سیاسی گفتگو تک محدود ہے، لیکن مانی کلاں کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا ہے جب یہاں کے نوجوانوں ، بزرگوں اور بچوں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے پوسٹر اور بینر لے کر، اپنا کام اور کاروبار چھوڑ کر گھروں سے باہر نکلے اور ہندستان میں پھیلائی جارہی نفرت کے خلاف آواز بلند کی۔ مانی کلاں جیسے چھوٹے اور ملک وریاست کی راجدھانی سے بہت دور اس گاؤں کے لوگوں کا ظلم کے خلاف باہر نکلنا ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ دھرنے ومظاہرے تو شہروں میں ہوا کرتے ہیں ، دیہی علاقوں میں ان کا اہتمام کہاں؟ اور وہاں کے لوگ اس کی اہمیت بھی نہیں جانتے، شاید ان کو آج بھی نہ معلوم ہو کہ جو صدائے احتجاج انہوں نے بلند کی اس کی گونج دیر تک اور دور تک سنائی دے گی اس کے باوجود وہ اپنے گھروں سے نکلے جس کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ ہندستان جیسے جنت نشان اور پر امن ملک میں امن وامان قائم ہو، ہر شخص بلا خود وتردد کہیں بھی آجا سکے۔

ہمیں اس نفسیات کا مطالعہ ضروری ہے جس کے تحت مانی کلاں جیسے چھوٹے سے گاؤں کے لوگوں نے اپنا احتجاج درج کرایا ہے۔ دراصل راجہ جب دوہری پالیسی کا شکار ہو جاتا ہے اور پینترے بازی کرنے لگتا ہے تو لوگوں میں عدم اطمینان کا پھیلنا فطری امر ہے۔ ایسے میں پہلے کسمساہٹ ہوتی اور پھر ہر طرف سے شور اٹھنے لگتا ہے، یہ اسی شور کا نتیجہ ہے۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے دوبارہ حلف برداری سے قبل ایک نیا نعرہ ”سب کا ساتھ سب وکاس اور سب کا وشواس“ دیا تھا لیکن ان کا یہ نعرہ اس وقت جملہ ثابت ہو گیا جب انہوں نے پارلیمنٹ میں تبریزی

انصاری کی لنچنگ پر دوہرے پیمانے کا بیان دیتے ہوئے کہا کہ افسوس کی بات ہے کہ پورے جھارکھنڈ کو لنچنگ کا اڈہ بتایا جا رہا ہے۔انہوں نے مجرمین کو قرار واقعی سزا دینے کی بات نہیں کہی بلکہ یہ کہا کہ سزا دی جانی چاہئے جبکہ جھارکھنڈ کی شبیہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز رکھی کیونکہ جلد ہی وہاں اسمبلی الیکشن ہونے والے ہیں۔وزیر اعظم کے اس بیان تک پورے ملک میں تبریز کی موت پر اندر اندر عدم اطمینان تو تھا لیکن لوگوں کا غصہ باہر نہیں آیا تھا مگر ان کے اس بیان کے بعد لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وزیر اعظم جملے بازی کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہیں اور پھر پورے ملک میں دھرنے و مظاہرے شروع ہو گئے۔

تبریز انصاری کی لنچنگ سے ہوئی پہلی ایسی موت ہے جس پر ملک میں اس طرح مسلسل دھرنے و مظاہرے ہو رہے ہیں اور لوگ اپنا احتجاج درج کرا رہے ہیں جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہی دوسرے مذاہب کے امن پسند لوگ بھی شریک ہو رہے ہیں اور حکمراں پارٹی کے ساتھ ہی وزیر اعظم نریندر مودی کو آئینہ دکھا رہے ہیں۔سوشل میڈیا پر اپ لوڈ ہونے والی ویڈیو کلپ سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں کس طرح عدم اطمینان پھیلا ہوا ہے۔ملک اس وقت بارود کے ڈھیر پر کھڑا ہے،وہ لوگ جو گھروں سے باہر نکل کر اپنا احتجاج پر امن طور پر درج کرا رہے ہیں،ان کے ذہن اتنا پر سکون نہیں ہیں جتنا دکھائی دے رہے ہیں بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ ان کے ذہنوں میں شور اور دلوں میں طوفان ہے،وہ ہندستان میں موب لنچنگ سے ہونے والی اموات سے نالاں ہیں۔ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ دنگائی اور فسادی ذہن کے لوگ موب لنچنگ کے ذریعہ کیا چاہتے ہیں اور ہندستان کو کن خطوط کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ڈر اور خوف کی سیاست صرف بیانات سے نہیں ہوتی ہے،ڈر اور خوف کی سیاست کا یہ دوسرا اسٹیج ہے ،بیانات کا پہلا اسٹیج وہ لوگ پار کر چکے ہیں اب عمل کے اسٹیج میں ہیں،وہ چاہتے ہیں کہ ان کے اس عمل سے پورے ہندستان میں ڈر اور خوف کی فضا پیدا ہو کیونکہ کسی بھی قوم پر برتری ثابت کرنے اور ان کو دوئم درجے کا شہری بنانے کے لئے سب سے کارگر حربہ ڈر اور خوف کی نفسیات

ہی ہے،وہ اسی کو پورے ملک میں پیدا کرنا چاہتے ہیں بلکہ کافی حد تک وہ اس میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مسلم اور دلت اس خوف کے سائے میں جی رہے ہیں،وہ جب گھروں سے نکلتے ہیں تو ڈران پر مسلط ہوتا ہے،ان میں یہ خوف سمایا رہتا ہے کہ کبھی بھی اور کہیں بھی وہ متشددلوگوں کا نشانہ بن سکتے ہیں،اسی کے خاتمے کے لئے مسلمان اور ہندستان کے دوسرے پر امن شہری گھروں سے باہر نکل کر دھرنے اور مظاہروں کے ذریعہ کوششیں کررہے ہیں لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی،ابھی تک حکومت کی طرف سے کوئی ایسا بیان تک نہیں آیا ہے جس سے محسوس ہو کہ وہ موب لنچنگ اور خوف کے خاتمہ کے لئے پر عزم ہے۔

پر امن شہریوں نے اب اس بات کا بھی عندیہ دے دیا ہے کہ اگر موب لنچنگ اور خوف کا سلسلہ رکا نہیں تو وہ جوابی کارروائی پر مجبور ہو جائیں گے،مسلم سیوا سنگٹھن نے صاف طور پر میڈیا کے سامنے اعلان کیا ہے کہ اب وہ ان ہجومیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنے بچوں کو تیار کریں گے ،مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی جیسے سنجیدہ عالم دین نے بھی کہا کہ مسلمانوں نے چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں،ان کے لہجے کی تندی بتاتی ہے کہ وہ اب کس حد تک جانے کے لئے تیار ہیں۔اس بات کا علم تو سب کو ہے کہ اگر آگے سمندر ہو اور پیچھے دشمن تو ایسے میں ایک مجبور اور مظلوم شخص کے پاس مڑ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا کیوں کہ زندگی کی یہی ایک صورت ہوتی ہے۔آج وزیر اعظم کے نیو انڈیا میں مسلمانوں اور دلتوں کے سامنے یہی صورت حال پیدا ہوگئی ہے،ان کے آگے موت اور پیچھے دشمن ہے ایسے میں وہ پیچھے مڑ کر دشمن سے پنجہ آزمائی کا عندیہ دے چکے ہیں۔اعیان حکومت اگر اپنی روش پر چلتے رہے اور انہوں نے ملک کے طول و عرض میں ہونے والے مظاہروں اور وہاں سے اٹھنے والی آوازوں پر کان نہیں دھرا اور ملک میں امن و امان کی فضا کی بحالی کے لئے قابل اعتماد قدم نہیں اٹھایا جس طرح مدھیہ پردیش کی کانگریس حکومت نے ایسے افراد کے لئے چھ برس تک سزا کا بل مانسون اجلاس میں لانے کا اعلان کیا ہے تو یقین مانئے ہندستان میں انارکی پھیل جائے گی۔صدیوں سے بنا تانا بانا ٹوٹ جائے گا اور جو

حالات آج ہیں اس سے کہیں زیادہ برے حالات ہوجائیں گے۔

ہندستان ایک ایسا ملک ہے جو معاشی سطح پر تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کرنے والے ملکوں کی فہرست میں شامل ہے لیکن ملک میں بدامنی کی وجہ سے اس کی معاشی رفتار متاثر ہورہی ہے جس کی طرف اقوام متحدہ نے بھی اشارہ کیا ہے۔اقوام متحدہ کی حقوق انسانی کاؤنسل کی سربراہ مشیل باچلے نے ہجومی تشدد اور دلتوں کے استحصال پر جنیوا میں اپنی سالانہ رپورٹ میں تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس کو ہندستان کی معاشی ترقی سے جوڑا ہے۔انہوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ اس سے ہندستان کی معاشی ترقی رک جائے گی۔انہوں نے کہا کہ پر پیچ سیاسی ایجنڈے کی وجہ سے کمزور لوگ حاشیے پر ہیں،انہوں نے متعدد رپورٹوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اقلیتوں پر ظلم اور ان کے استحصال کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے خاص طور پر مسلمانوں اور دلتوں کا استحصال ہورہا ہے۔

یوں تو حکومت نے اقوام متحدہ کی اس رپورٹ کو خارج کردیا ہے لیکن رپورٹ میں جو بات کہی گئی ہے وہ سچ ہے۔ایسے میں حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ زمینی حقائق پر نظر کرے اور ملک کی تعمیر وترقی کو نظر میں رکھ کر فیصلے کرے یہی اس ملک کے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

# اردو زبان کے ساتھ سرکار کا رویہ

ہندستان گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے، کسی بھی سماج کی روح سمجھنے کے لئے اس کے معاشرے کا مطالعہ سب سے اہم ہوتا ہے اور اس معاشرے میں زبان کلیدی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، کیونکہ زبان ہی وہ ذریعہ ہے جس کے توسط سے سماج کے افراد باہم رابطہ کرتے ہیں۔ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھانے اور اس کو دنیا کے لئے ایک مثال بنانے میں اردو کا کلیدی کردار رہا ہے۔گنگا جمنی تہذیب/مشترکہ تہذیب کی اصطلاح بھی اسی زبان کے ساتھ وجود میں آئی ورنہ اس سے قبل ایسے سماج کا تصور نہیں تھا،اس کے باوجود یہی اردو آج ہندستان میں بے گھری کا شکار ہے۔یوں تو آزادی کے بعد سے ہی اردو کے ساتھ سوتیلا رویہ اختیار کیا گیا اور زبان کے قضیے نے طول پکڑا اس کی طویل بحث ہے،اس مسئلے سے کنارہ کش ہوتے ہوئے آج کی صورت حال پر گفتگو مقصود ہے۔اس وقت اردو زبان ہندستان کی پانچ ریاستوں اتر پردیش، مدھیہ پردیش، دہلی، بہار اور تلنگانہ کی دوسری سرکاری زبان ہے جبکہ جموں وکشمیر کی پہلی دفتری زبان ہے۔یہ واحد زبان ہے جو کشمیر سے کنیا کماری تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔آپ کسی بھی ریاست میں چلے جائیں اردو بولنے اور سمجھنے والے مل جائیں گے جبکہ دوسری علاقائی زبانوں کو دوسری ریاستوں کے افراد نہ تو بولتے اور نہ ہی سمجھتے ہیں اس طرح یہ زبان پورے ملک کو ایک دھاگے میں پرو کر لڑی بناتی ہے پھر بھی اردو کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے۔جس سے مشترکہ تہذیب کمزور پڑتی جارہی ہے۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ شبانہ اعظمی کے ذریعہ ہندستان کو ''ملک'' کہے جانے پر ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ ملک نہیں ''دیش'' ہے۔یہ ذہنیت یوں ہی نہیں پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کے پیچھے برسوں کی محنت اور برین واشنگ ہے۔جب سرکار خود اردو کے ساتھ سوتیلا رویہ اختیار کریں تو بھلا دوسروں سے کیا شکایت! سرکار خود اردو کو تباہ کرنے کی ذمہ دار ہے۔راشٹریہ سہارا اردو نے 17 جو

لائی 2019 کو پہلے صفحے پر پہلی خبر اس سرخی ''یو پی میں اردو میڈیا کے ساتھ امیتازی سلوک'' شائع کی، جس میں اردو میڈیا کے ساتھ اختیار کئے جانے والے سلوک کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ یہ سلسلہ صرف اتر پردیش اور وہاں کے محکمہ نشر و اشاعت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مرکزی حکومت کے محکمہ اطلاعات و نشریات سے جاری کئے جانے والے اشتہارات میں بھی یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور اردو اخبارات کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج تک اردو زبان کا کوئی اخبار اس طرح قومی سطح کی حیثیت نہیں اختیار کر سکا ہے کہ ملک سے سبھی اہم شہروں سے اس کی اشاعت ہوتی ہو۔ اگر حکومت اس جانب توجہ مبذول نہیں کرتی ہے اور اردو کے اخبارات کو ان کے جائز حقوق نہیں دیتی ہے تو ایک دن ایسا آئے گا جب اردو کے اخبارات تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔ یہ معاملہ صرف اخبارات اور اشتہارات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے شعبوں تک بھی پھیلا ہوا ہے۔

جن ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری/ دفتری زبان کا درجہ حاصل ہے، وہاں بھی یہ صرف کاغذات تک ہی محدود ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کہنے کو متعدد محکموں میں مترجمین کا تقرر ہوا ہے لیکن کسی بھی دفتر میں اردو زبان میں درخواست دے کر دیکھ لیجیے حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ یہ مترجمین صرف وہی کام نہیں کرتے ہیں جس کے لئے ان کا تقرر ہوا ہے، جس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ بالا افسران ان سے وہ کام لینے کے بجائے دوسری ذمہ داریاں دیئے رہتے ہیں جس سے ان کو فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔ ان تقرریوں کا فائدہ تنخواہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور زبان کے حق میں تو بالکل نہیں ہے۔ یہی حال اتر پردیش کے سرکاری اسکولوں کا ہے۔ جہاں اولاً اردو اساتذہ کا ہی فقدان ہے اور جن اسکولوں میں اردو اساتذہ ہیں وہاں اردو پڑھائی نہیں جاتی ہے۔

متعدد حکومتوں میں پرائمری اور ثانوی سطح کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر کیا گیا تا کہ وہ سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو پڑھنے والے بچوں کو اردو کی تعلیم دیں لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ

جن علاقوں میں اردو پڑھنے والے بچے ہیں وہاں کے اسکولوں میں اردو اساتذہ نہیں ہیں اور جہاں اردو اساتذہ ہیں وہاں یا تو اردو پڑھنے والے بچے نہیں ہوتے ہیں اور اگر ہوتے ہیں تو ان کی تعداد صفر کے برابر ہوتی ہے۔

سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا سب سے برا حال ہے۔ میرے کئی دوست پرائمری اور پی جی ٹی سطح پر سرکاری اسکولوں میں ٹیچر ہیں۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق بی ایس اے اور اور این پی آر سی باضابطہ ان کو اردو پڑھانے سے منع کرتے ہیں۔ سرکاری اسکولوں کے اساتذہ چاہنے کے باوجود بچوں کو اردو نہیں پڑھا سکتے ہیں۔ بی ایس اے اور این پی آر سی جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ ان اساتذہ کا تقرر صرف اردو پڑھانے کے لئے نہیں ہوا اور ضابطہ کے مطابق یہ درست بھی ہے لیکن غلط بات یہ ہے کہ جس سبجیکٹ کے لئے ان کا تقرر رہوا ہے وہی سبجیکٹ ان کو نہیں پڑھانے دیا جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے کتابیں سرکار مہیا کراتی ہیں لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ پرائمری اسکولوں میں دیگر سبجیکٹ کی کتابیں تو پہنچ جاتی ہیں مگر اردو کی کتابیں نہیں پہنچتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اردو کی کتابیں چھپتی ہی نہیں اور اگر چھپتی ہیں تو غائب کردی جاتی ہیں۔ اگر اساتذہ اپنے اعلی افسران سے بار بار رجوع کرتے ہیں اور اردو پڑھانے کی ضد کرتے ہیں تو ان کو ٹرانسفر سے لے کر متعدد طریقوں سے پریشان کیا جاتا ہے۔ جس سے مجبور ہو کر وہ خاموشی اختیار کر لیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بڑی مصیبت سے تو نوکری ملی ہے اب اگر اس نے زیادہ مین میخ نکالی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے والدین کتنا باشعور ہوتے ہیں یہ بھی کسی سے چھپا نہیں ہے، ایسے میں وہ بھی خاموش رہتے ہیں۔ نویں میں اگر کوئی بچہ اردو لینا چاہتا ہے تو اولاً اس کو اردو دی نہیں جاتی ہے بلکہ اس کو سمجھا دیا جاتا ہے کہ اس سے مستقبل میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا یا پھر اس کے علم کے بغیر متبادل مضمون میں کلا/ ڈرائنگ لکھ کر خانہ پری کردی جاتی ہے، جب وہ ہائی اسکول میں پہنچتا ہے جو تعلیمی دور کا ایک اہم پڑاؤ ہوتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس

اختیاری مضمون میں اردو نہیں ہے۔مجبورااس کو ہائی اسکول اردو کے بجائے اختیاری مضمون کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔

یہ ایک اہم اور سنگین مسئلہ ہے جس سے اردو اور اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے نبرد آزما ہیں، جس کے ذمہ دار سرکار اور اعلی افسران کے سوا کوئی نہیں ہے ایسا نہیں ہے کہ سرکار کو معلوم نہ ہو اس کو ہر بات کا علم رہتا ہے لیکن خاموش سازش کے تحت اردو کی جڑیں کاٹنا مقصود ہوتا ہے اس لئے سرکار صرف نظر کئے ہوئے ہے۔

اعلی سطح پر اردو کی تعلیم کا بندوبست ہے، اکثر و بیشتر یونیورٹیوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے ،یہاں تعلیم حاصل کرنے والے اکثر وہ بچے ہوتے ہیں جو گیارہویں میں پہنچ کر اردو لیتے ہیں یا پھر مدارس سے مساوی ڈگری لے کر یہاں تک پہنچتے ہیں، جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح یہ طلبا اردو لکھ پڑھ تو سکتے ہیں لیکن یہ زبان کی جڑوں سے آشنا نہیں ہوتے ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرکار اردو کی جڑیں کاٹ کر اس کی پھننگ کو پانی دیتی ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ اگر اس طرح کا عمل اختیار کیا جائے تو درخت کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔اس لئے اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اہل اردو کو کمر بستہ ہونا پڑے گا ان کو سرکار کی ناک میں دم کرنے اور اردو کو جائز حقوق دلانے کی جدو جہد کے ساتھ اپنی سطح پر بھی اس زبان کو فروغ دینا ہوگا اس کے بغیر اردو زندہ نہیں رہ سکتی ہے اور اگر اردو زندہ نہیں رہی تو یقین مانئے مشترکہ تہذیب کا تانا بانا بھی بکھر کر رہ جائے گا اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان ہے، جن کا غالب مذہبی سرمایہ اسی زبان میں ہے جس کے تحفظ کی ذمہ داری بھی ان ہی پر ہے اور جو بھی غیر مسلم اردو کی طرف آتے ہیں وہ صرف حصول ملازمت کے لئے آتے ہیں اس سے زیادہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

# چوتھا ستون یا تابوت میں آخری کیل؟

میڈیا جمہوریت کا چوتھا ستون ہے، جس کا کام حکومت اور عوام کے مابین پل کا کام کرنا ہے۔ عوام کو میڈیا سے امید ہوتی ہے کہ وہ ان کی آواز اٹھائے اور ایوانوں تک پہنچا کر ان کے مسائل حل کرے لیکن اگر یہی میڈیا حکومت اور عوام دونوں کو گمراہ کرنے لگے تو جمہوریت کا چوتھا ستون ہونے کے بجائے اس کی تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی۔ اس وقت ملک کا سب سے بڑا مسئلہ اکثریت و اقلیت کے مابین پیدا ہوئی خلیج ہے، جسے پاٹنے میں میڈیا کو نمایاں کردار ادا کرنا تھا لیکن یہ فرض ادا کرنے کے بجائے مین اسٹریم کا میڈیا عوام اور حکومت دونوں کو گمراہ کر رہا ہے جسے نہ صرف ملک کے عوام ، یہاں کی اکثریت بلکہ عالمی میڈیا بھی محسوس کر رہی ہے۔ آپ کوئی بھی چینل کھول لئے وہاں جو ڈبیٹ ہوتے ملیں گے وہ غیر جانبدار ہونے کے بجائے جانبدار ہی ملیں گے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میڈیا نے اپنا فرض منصبی ترک کر کے ہاتھوں میں کشکول اٹھالیا ہے اور جہاں اس کو نظر آتا ہے کہ اس کا کشکول بھر جائے گا وہ آگے بڑھ کر اسی کا راگ الاپنے لگتا ہے۔

دو دن قبل مشہور و معروف فلم سازوں نے وزیر اعظم نریندر مودی کو خط لکھا جس میں انہوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ ملک میں پھیلی انارکی اور موب لنچنگ پر لگام لگانے کے لئے وہ ٹھوس قدم اٹھائیں۔ میڈیا کو ان فلم سازوں کی بات اور ان کے مطالبے کو حکومت تک پہنچا کر اسے مجبور کرنا چاہئے تھا کہ وہ بدامنی کی اس فضا کو ختم کرنے کے لئے کوئی مثبت قدم اٹھائے لیکن اس کے برعکس میڈیا نے ان فلم سازوں کے خلاف ہی محاذ کھول دیا۔ حد تو تب ہوگئی جب ملک کا نمبر ایک اخبار ہونے کا دعویٰ کرنے والے اخبار نے ان افراد کے خلاف اداریہ لکھ دیا کہ یہ ایسا خط ہے جس کو در خور اعتنا نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس اداریہ کے مطابق یہ وہ افراد ہیں جو بغیر سوچے سمجھے اس طرح کے قدم اٹھاتے رہتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا یعنی اس اخبار کی نظر میں ملک میں موب

لنچنگ اور ''جے شری رام'' کے نعرے کے ذریعہ خوف و دہشت پھیلانے کی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جو بات ملک کے عام و خاص لوگ محسوس کرتے ہیں اس کو یہ اخبار محسوس نہیں کرتا ہے۔ اس احساس کے ختم ہونے کے پس پشت بہت سی وجوہ اور اسباب ہیں۔

صحافت اور صحافیوں سے امید کی جاتی ہے کہ وہ غیر جانبداری کا رخ اختیار کریں گے لیکن یہ اس وقت تک ہی ممکن ہے جب تک ایک صحافی/میڈیا ہاؤس کا مالک کسی نظریے کا اسیر نہ ہو اور نہ ہی اس کے سامنے ذاتی مفادات ہوں۔ اس تناظر میں جب میڈیا پر ایک عمومی ڈالی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اکثر و بیشتر صحافی اور میڈیا ہاؤس مالکان نہ صرف ذاتی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہیں بلکہ وہ نظریہ کے بھی اسیر ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو واقعات کی یک رخی رپورٹنگ کیوں کی جاتی؟

کٹھوعہ کا واقعہ سب کو یاد ہوگا جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا، زانیوں اور قاتلوں کے حق میں ریلی نکال کر ان کی نہ صرف حمایت کی گئی تھی بلکہ اسی نمبر ایک اخبار ہونے کا دعویٰ کرنے والے اخبار نے پہلے صفحے پر سب سے اوپر باکس بنا کر ایک رپورٹ شائع کی تھی کہ کٹھوعہ میں بچی کے ساتھ ریپ ہوا ہی نہیں ہے لیکن ملک نے دیکھا کہ عدالت نے ملزموں کو مجرم قرار دیا اور ان کو سزائیں ہوئیں۔ اسی اخبار نے ابھی چند دنوں قبل میرٹھ میں ہوئے ایک واقعے کی بھی رپورٹنگ خالص نظریاتی کی ہے، اس نے حقائق کو چھپا کر عوام کو بہکایا ہے۔ پاپولر فرنٹ آف انڈیا الیکشن کمیشن آف انڈیا سے تسلیم شدہ ایک سیاسی پارٹی ہے جو ملک کے انتخابات میں حصہ لیتی ہے جس میں ہندو مسلم دونوں طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد نہ صرف شامل ہیں بلکہ اس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑتے ہیں۔ ملک میں عام ہو چکی وبا موب لنچنگ سے نجات دلانے اور خوف و دہشت کو ختم کرنے کے لئے اس کے کارکنوں نے لساڑی گیٹ علاقہ میرٹھ میں اشتہارات چسپاں کئے تھے جس میں لکھا تھا ''بے خوف جیو، باعزت جیو۔ نفرت انگیز جرائم کے خلاف پاپولر فرنٹ کی مہم''، اس واقعہ کی رپورٹنگ کرتے ہوئے اسی اخبار نے خبر شائع کی جس کی سرخی تھی

''لساڑی گیٹ میں بھڑکاؤ پوسٹر چسپاں''پولیس نے ان پوسٹروں کو ہٹا دیا تھا۔اس سلسلہ میں پاپولر فرنٹ آف انڈیا کے کارکنوں نے پریس کانفرنس کا انعقاد کیا تو پولیس نے بغیر اجازت پریس کانفرنس کرنے کے جرم میں پانچ افراد کو حراست میں لے لیا تھا جس خبر کی سرخی اسی اخبار نے''پاپولر فرنٹ کے پانچ افراد دبوچے۔خفیہ ایجنسیوں کو ملا اہم انپٹ،دیر رات محلکہ پابند کر چھوڑا'' لگائی تھی۔ان سرخیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مین اسٹریم کا میڈیا کس طرح صحافت کو بدنام اور نظریاتی رپورٹنگ کر کے ملک کے عوام کے مابین خلیج پیدا کر رہا ہے۔ان سرخیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ متعلقہ سیاسی پارٹی کے کارکن ملک میں پھیلی نفرت اور موب لنچنگ جیسے دہشتناک رویوں سے نجات دلانے کے لئے نہیں بلکہ وہاں بم بلاسٹ کے لئے کام کر رہے تھے،یہی رخ دینے کے لئے''خفیہ ایجنسیوں کو ملا اہم انپٹ''جیسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔یہ خبریں جب عوام کی نظروں سے گذرتی ہیں تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ دوسرا طبقہ صرف دہشت پھیلا رہا ہے وہ اکثریتی طبقے کو ختم کرنا چاہتا ہے جس سے دونوں کے مابین خلیج اور نفرت بڑھتی ہے۔لیکن جو لوگ میڈیا کے رویے سے واقف ہیں اور کٹھوعہ کی رپورٹنگ جن کی نظروں کے سامنے ہے ان کو اندازہ ہے کہ یہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔

دو دن پہلے کی بات ہے کہ 1996 میں دہشت گردی کے جرم میں گرفتار کئے گئے دو کشمیریوں کو ثبوت کی عدم موجودگی میں رہا کیا گیا ہے۔ایک عالمی سطح کے میڈیا ہاؤس نے اس کا ایک ویڈیو جاری کیا ہے جس میں رہا کیا گیا شخص اپنے والدین کی قبر سے لپٹا رو رہا ہے۔جس کا کوئی گناہ نہیں تھا اس کے باوجود 23 برس تک نہ صرف سلاخوں کے پیچھے رہا بلکہ اس کی زندگی کا عزیز ترین حصہ برباد ہو گیا اس کا ذمہ دار میڈیا کے علاوہ کوئی نہیں ہے کیونکہ بغیر کسی ثبوت کے میڈیا کسی ملزم کو مجرم لکھنے لگتا ہے۔جس خمیازہ لوگ اس طرح بھگتتے ہیں کہ ان کی زندگیاں اور خاندان سب تباہ ہو جاتے ہیں۔

موب لنچنگ اور اس کو روکنے کے لئے وزیر اعظم کو فلم سازوں کے ذریعہ لکھے گئے خط اور اس

سے متعلق کی گئی رپورٹنگ اوراس پر لکھے گئے اداریہ کواگراس تناظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سچ میں میڈیا نے اپنا فرض منصبی چھوڑ دیا ہے۔اس معاملے میں سب سے بہتر اردو میڈیا ہے جوکم ازکم ملزم کو مجرم نہیں لکھتا اور قومی سلامتی سے متعلق معاملات میں ملک وقوم اور سرکار کو بہکاتا نہیں ہے ۔دوسرے نمبر پر ہندستان کا انگریزی میڈیا ہے جوحتی الامکان غیر جانبدار رپورٹنگ کرتا ہے اور سچ وجھوٹ کو بعینیہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ہندی میڈیا کا رویہ اس معاملے میں سب سے زیادہ خراب ہے۔اس کو اپنا جائزہ لینا چاہئے تاکہ کم ازکم ملک کے حالات کو اگر وہ بہتر نہ کرسکے تو خراب بھی نہ کرے۔

آج کا میڈیا چوتھا ستون ہونے کا حق ادا نہیں کر رہا ہے خواہ وہ پرنٹ میڈیا یا الیکٹرانک میڈیا دونوں کا ایک جیسا حال ہے۔اس کی روش اور رویے کی بنیاد پر ایسا لگتا ہے کہ یہ وہ میڈیا نہیں ہے جسے جمہوریت کا چوتھا ستون کہا گیا تھا بلکہ یہ وہ میڈیم ہے جس کے ذریعہ نظریاتی جنگ لڑکر ملک کو خوف ودہشت میں مبتلا کیا جارہا ہے۔اگر آج پھیلے ہوئے خوف اور دہشت سے ملک کو نکالنا ہے تو میڈیا کو اپنا احتساب کرنا ہوگا اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو اس کو مستقبل میں جمہوریت کا چوتھا ستون کہنے کے بجائے جمہوریت کی تابوت میں آخری کیل کہا جائے گا جس کی ذمہ داری میڈیا ہاؤس مالکان اوران صحافیوں پر ہوگی جو ذاتی مفادات پر ملک وقوم کے مفادات کو قربان کررہے ہیں۔

# سماجی نظریے میں تبدیلی کی ضرورت

سب سے زیادہ انسان کو تکلیف نا کردہ گناہ پر ہوتی ہے، اگر کسی نے کوئی جرم کیا ہو اور اس کو سزا ملے تو کوئی بات نہیں، لیکن جس گناہ کا ارتکاب بھی نہ کیا ہو اور اس کی سزا پوری عمر ملے تو یقین مانئے اس درد و کرب کو بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے سماج میں ایک ایسا بھی طبقہ ہے جو ایسے ہی گناہ کی سزا پوری عمر بھگتتا ہے مگر کسی کو ذرہ برابر ان کی تکلیف اور کے دکھ درد کا احساس نہیں ہوتا ہے، اکیسویں صدی میں ایسی بے حسی یقیناً انسانی سماج کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ مخنث پیدا ہونا کوئی جرم تو نہیں! اور نہ ہی کسی انسان کے ہاتھ میں ہے، اگر ایسا ہوتا تو کوئی بھی شخص مرد اور عورت کے درمیان اپنا وجود کیوں معلق رکھتا؟ ایسے میں ہمارے مہذب سماج کو ان افراد کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہئے جنہیں حکومت و سماج کی مدد اور ہمدردی کی ضرورت ہے جس سے ان کی زندگی بھی پرسکون اور قابل عزت بن سکتی ہے۔

ابھی چند دنوں قبل بنگال کے جلپائی گڑی میں ایک مخنث کو بھیڑ نے پیٹ پیٹ کر مار ڈالا، اس کو بچہ چور ہونے کی شک میں نشانہ بنایا گیا جبکہ وہاں کے سب ڈویژنل پولیس افسر دیپاشیش چکرورتی نے اس الزام کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ علاقہ میں بچہ چوری کی کوئی واردات نہیں ہوئی ہے۔ ایسے میں اس واقعہ کی تہہ میں جانا ضروری ہے، بھیڑ کی نفسیات کو گرفت میں لائے بغیر نفس مسئلہ کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ سماج کی سب سے چھوٹی اقلیت مخنث ہیں، جو سماج کا لازمی جز ہیں ، یہ نہ سماج کا کوڑھ ہیں اور نہ ہی اس کے لئے نقصان دہ ہیں جیسا کہ تصور کیا جاتا ہے، ان کا کوئی اپنا گھر اور ٹھکانہ نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی کاروبار ہوتا ہے، نہ ہی ملازمت، ایسے میں سماج کا یہ پورا طبقہ بے سہارا ہوتا ہے۔ ان کے اڈے اور گرو ہوتے ہیں جو خود بھی ان ہی کی طرح بے یار و مددگار ہوتے ہیں البتہ وہ کوئی ایسا ٹھکانہ ضرور تلاش کر لیتے ہیں جہاں وہ اپنے چیلوں کے ساتھ رہ سکیں۔ دراصل یہ افراد بچپن کے خاتمہ سے قبل ہی اپنے گھروں سے نکلنے پر

مجبور کردیئے جاتے ہیں، جس میں خود ان کے اہل خانہ کا قصور ہوتا ہے کیونکہ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی وجہ سے سماج میں ان کی بدنامی ہورہی ہے، ایسے میں وہ ان کو اپنے گھر سے نکلنے پر مجبور کردیتے ہیں جس کے بعد ان کی زندگی بالکل بے سہارا اور بے یارومددگار ہوجاتی ہیں، ایسے میں ان کے گرو ہی ان کا سب کچھ ہوتے ہیں، جو قیام وطعام کے انتظام سے لے کر ان کے احساس تنہائی تک کو دور کرتے ہیں۔ چونکہ کوئی ایسا نہیں ہوتا ہے جو والد اور ماں کی طرح سرپرستی کرسکے اس لئے بعض میں اخلاقی پستی بھی آجاتی ہے لیکن یہ بھی سماج کی دین ہے کیونکہ سماج ان کے ساتھ بھونڈے مذاق کو اپنا حق تصور کرتا ہے۔ ان کی گذران زندگی کا دارومدار شادی بیاہ اور گھروں میں بچوں کی پیدائش پر ملنے والے نذرانے پر ہوتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ روزروز نہ تو شادی ہوتی ہے اور نہ بچے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے یہ لوگ ریلوے اسٹیشن، ٹرین اور دوسرے مقامات پر ہنسی مذاق کرکے مانگتے ہوئے بھی نظر آجاتے ہیں۔ چونکہ ان میں بہت سی اخلاقی برائیاں در آتی ہیں اور ان کے تہی دست و تہی داماں ہونے کی وجہ سے لوگ ان کو بڑی آسانی سے چور، اچکا اور معاشرے کے لئے نقصان دہ سمجھ لیتے ہیں جس کے بعد ان کے ساتھ جلپائی گڑی میں ہونے والا سلوک کیا جاتا ہے۔

2011 کی مردم شماری کے مطابق ہندستان میں مخنثوں کی تعداد ایک لاکھ انچاس ہزار ہے ، اپریل 2014 میں سپریم کورٹ نے مخنثوں کی جنس کا تعین کرتے ہوئے ان کو تیسری جنس قرار دیا، (تھرڈ جنڈر/تیسری جنس ایک وسیع اصطلاح ہے جس کے تحت ہم جنس پرست اور دوسرے طبقات بھی آتے ہیں) اس سے قبل ان کو سب سے زیادہ دشواری اپنی جنس کے تعین میں ہوتی تھی ،لیکن اب ان کو عدالت عالیہ کے حکم کے بعد تیسری جنس کے زمرے میں رکھا جاتا ہے، آئین ہند نے مخنثوں کو بھی وہی حقوق دیئے ہیں جو اس نے تمام شہریوں کو دیئے ہیں، جنس ،مذہب اور زبان وعلاقہ کی بنیاد پر تعصب نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج تک اگر کسی طبقے کے ساتھ سب سے زیادہ تعصب برتا گیا ہے تو وہ یہی تیسری جنس ہے۔ ان کو نہ گھر

میں جگہ ملتی ہے اور نہ ہی گھر سے باہر کوئی جائے امان، سماج کا ہر شخص ان سے دور رہتا ہے، یہاں تک کہ ان کو کوئی ملازمت تک دینے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔ جس کا سبب ان کی جنس کا علاوہ اور کچھ نہیں ہے، ان کو اب تک جو بھی حقوق ملے وہ صرف کاغذی ہیں، زمینی سطح پر تیسری جنس کو کچھ نہیں ملا، جس کی واضح مثال آج بھی ان کا بے گھر و بے در ہونا ہے، کہیں ملازمت میں آپ تیسری جنس کو نہیں پائیں گے، کسی کاروبار میں میں ان کا وجود نہیں، ان کے پاس آپ کو غیر منقولہ جائداد نہیں ملے گی، سماج میں ان کی نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی وقعت، جس کی وجہ سے یہ سماج میں رہ کر بھی اس سے کٹے اور تنہا ہوتے ہیں۔ جس کے ذمہ داران کے اہل خانہ، سماج اور حکومت ہے۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مرکزی حکومت نے 2019-20 کے اپنے بجٹ میں مخنثوں کی فلاح و بہبود کے لئے محض پانچ کروڑ روپے مختص کئے ہیں، جس کی حیثیت اونٹ کے منھ میں زیرے سے زیادہ نہیں ہے۔ بجٹ کتابچہ میں بس اتنا کہہ کر پلہ جھاڑ لیا گیا ہے The scheme however suffers from abysmally low levels of utilisation۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری حکومت سماج کے اس طبقے کے لئے کتنی زیادہ سنجیدہ ہے۔ سماج کی ترقی کا اندازہ صرف اس کے اشرافیہ سے نہیں لگایا جاتا ہے بلکہ اس کا اصل پیمانہ محروم طبقات ہوتے ہیں، حکومت ہر طبقے کے لئے گھر اور کاروبار کا وعدہ ، دعوی اور انتظام کرتی ہے لیکن کسی کے بھی منصوبے میں سماج کا یہ سب سے چھوٹا طبقہ شامل نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ صدیوں سے ان کو مجبور محض سمجھا گیا اور آج اکیسویں صدی میں بھی سماج کی ذہنیت میں ان کے تئیں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

مخنثوں کی فلاح و بہبود کے لئے یوں تو بہت سی سماجی تنظیمیں کام کرتی ہیں لیکن صرف سماجی تنظیموں کے کام سے کچھ نہیں ہونے والا ہے کیونکہ ان کے پاس محدود وسائل و ذرائع ہوتے ہیں، وہ سماج میں بیداری سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی ہیں اس لئے حکومت کو آگے آ کر اس طبقے کی

فلاح و بہبود کے لئے کچھ ٹھوس اور سنجیدہ قدم اٹھانے ہوں گے، اگر وہ ایسا نہیں کرتی ہے تو جلیپائی گڑی کی طرح واقعات دہرائے جاتے رہیں گے اور یہ زمانے کے ستائے ہوئے لوگ اپنی جانیں گنواتے رہیں گے جس سے زیادہ کچھ شرمناک نہیں ہوسکتا ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ سماج کے اس طبقے کے لئے ایسے انتظامات کرے کہ ان کی بے گھری و بے دری دور ہو، سب سے پہلے ان کے لئے مکان کا انتظام ترجیحی بنیاد پر ہونا چاہئے تاکہ ان کا اپنا ایک ٹھکانہ اور سر چھپانے کی جگہ مل سکے، یہ وہ بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، اس طرح ان کی دربدری دور ہوگی، یہ بھی چونکہ کسی نہ کسی کے بچے ہوتے ہیں اس لئے قانون بنا کر باپ کی جائداد میں ان کو حصہ دلایا جائے اور جو ایسا نہ کرے اس کے لئے سزا کا انتظام کیا جائے، جس طرح سے دوسرے طبقات کو ملازمت میں ریزرویشن دیا گیا ہے اسی طرح ان لوگوں کو ابھی لگ سے ریزرویشن دیا جائے تاکہ ان کی بے روزگاری دور ہو سکے۔ ان کے لئے خط افلاس سے نیچے کے راشن کارڈ بنائے جائیں۔ کاروبار کے لئے حکومت نے متعدد اسکیمیں شروع کی ہیں، ان اسکیموں سے ان کو ترجیحی بنیاد پر جوڑا جائے اور ان سے ان کو مستفید کیا جائے۔ بینکوں سے غیر سودی قرض ان کو مہیا کرا کر اس طبقے کو باروزگار بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ یہ بھی اپنی زندگی کو قابل عزت بنا سکیں۔

کسی بھی طبقہ کو ذلیل کر کے کوئی ملک تعمیر و ترقی کی راہ پر نہیں جا سکتا ہے ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے مخنثوں کے تئیں سماجی نظریے میں تبدیلی لائی جائے، جس کے لئے اس طبقے کے سربرآوردہ افراد سے گفت وشنید کر کے سب سے پہلے جس طرح لفظ ''دلت'' کے استعمال کو قابل تعزیر قرار دیا گیا ہے اسی طرح سے لفظ ''ہجڑا اور چھکا'' کو قابل تعزیر قرار دیا جائے، ان کے ساتھ بھونڈے مذاق کو جرم کے زمرے میں لایا جائے۔ اس طرح کی قانون سازی سماج نابرابری کے خاتمہ اور اور اس میں مقام دلانے کی خشت اول ہوگی۔ جب تک حکومت اس طرح

کے مثبت قدم نہیں اٹھاتی ہے اس وقت تک سماج میں اس طبقے کو عزت کا مقام نہیں مل سکتا ہے، جو کسی بھی سماج اور طبقے کی کامیابی کی کلید ہے، ورنہ احساس کمتری، سماجی ناانصافی اور ظلم وجور کی فضا میں بھلا کس طبقے نے کامیابی حاصل کی ہے؟ اس لئے سب سے پہلے اس طبقے کے لئے پرامن اور پرسکون ماحول کا انتظام حکومت اور سماج دونوں کی ذمہ داری ہے۔ ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ عزت وہمدردی سے ایک رحم دل سماج کی تشکیل ہوتی ہے، جس میں اقلیتیں اور محروم طبقات پر امن اور پرسکون رہتے ہیں، اس سے ہماری دنیا متنوع اور خوبصورت بنتی ہے، جہاں کوئی بھی خود کو محروم، مطرود اور بے سہارا نہیں سمجھتا ہے۔

# لیبارٹری سے نکلی فوج کی ضرورت نہیں

کسی بھی ملک کی ترقی اور طاقت کا اندازہ وہاں کے تعلیمی نظام اور فوجی انتظام وانصرام سے لگایا جاتا ہے۔ہندستان بھی تعلیمی اور فوجی طاقت کی بنیاد پر ترقی کر رہا ہے جو خوش آئند ہے۔فوج اور تعلیم یہ دونوں شعبے ایسے ہیں جن سے کوئی بھی حکومت اغماض نہیں برت سکتی ہے اور اگر ایسا کرتی ہے تو وہ حکومت غیر سنجیدہ بلکہ غیر ذمہ دار کہلائی جائے گی۔ بھاجپا کی مرکزی حکومت ان دونوں محاذ پر ناکام ثابت ہو رہی ہے۔یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اس کی رپورٹ، ملک کا تعلیمی بجٹ اور آر ایس ایس کہہ رہی ہے۔تعلیم کے تئیں مرکزی حکومت کی سنجیدگی کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ناروے جیسا ملک اپنے بجٹ کا 6.38 فیصد، آسٹریلیا 5.95 فیصد، جرمنی 4.22 فیصد جاپان 4.8 فیصد، فرانس 5.20 فیصد خرچ کرتے ہیں، جن میں ناروے جیسا ملک سرفہرست ہے جبکہ ہندستان اس وقت 3.01 فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے۔آج جب دنیا تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر اپنے تعلیمی بجٹ میں اضافہ کر رہی ہے تاکہ اس کی نئی نسل ہر طرح کی تعلیم سے لیس ہو تو ہماری حکومت میں اس میں تخفیف کر دیتی ہے۔2014 میں یہ بجٹ 4.08 فیصد تھا جو 2018 میں گھٹ کر 3.01 فیصد ہو گیا یعنی 1.07 کی تخفیف کر دی گئی ہے۔مرکزی حکومت کی سنجیدگی کا اندازہ اسی بات سے لگا لیجیے۔یہی حال فوج کا بھی ہے۔خود آر ایس ایس کے لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اس وقت ملک میں دس ہزار فوجی افسران کی کمی ہے،جس کو دور کرنے کے لئے وہ آگے آئے ہیں۔دراصل یہ کہہ کر جہاں ایک طرف وہ اپنے اصل ایجنڈے کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں وہیں دوسری جانب فوجی اسکولوں کے قیام کا جواز بھی تلاش کرتے ہیں لیکن ان کو نہیں معلوم کہ ملک میں گزشتہ چھ برس سے ان کی ہی سیاسی ونگ کی حکومت ہے جس سے اس کی بدنامی ہوگی۔آر ایس ایس کو آرمی اسکول کے قیام کی اجازت دیا جانا سرکار کی سب سے بڑی ناکامی ہے کہ وہ اپنے اسکولوں کے ذریعہ فوجی افسران کی کمی نہیں

پوری کر پا رہی ہے۔

آر ایس ایس نے ہر شعبہ کے لئے الگ الگ ناموں سے ذیلی تنظیمیں/شاخیں بنا رکھی ہیں۔اس کی ذیلی شاخ ودیا بھارتی تعلیمی نظام دیکھتی ہے۔سرکار نے اسی ودیا بھارتی کو بلند شہر کے شکار پور میں فوجی اسکول کے قیام کی منظوری دے دی ہے جو نہایت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔سب سے پہلا سوال تو یہی ہے کہ آخر سرکار نے فوجی اسکول کے قیام کی منظوری کیسے اور کیوں دی؟غیر ملکی خفیہ ایجنسیاں جب سرکاری اداروں تک پہنچ جاتی ہے اور وہاں ایسے بچوں کا داخلہ کرا دیتی ہیں جو مستقبل میں ان کے لئے کام کرتے ہیں تو پھر پرائیویٹ اداروں میں داخلہ ان کے لئے مزید آسان ہو جائے گا۔

آر ایس ایس اگر چہ ایسی تنظیم ہے جس کی سیاسی یونٹ بھاجپا مرکز میں اقتدار میں ہے لیکن یہ ایک متنازع تنظیم ہے۔آزادی کے فوراً بعد اس تنظیم پر اس وقت کے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے پابندی بھی عائد کر دی تھی۔چند شرائط کے بعد اس پر سے پابندی تو ہٹالی گئی لیکن یہ تنظیم مشکوک ضرور بنی رہی جس کی سب سے بڑی وجہ اس تنظیم کی فکری نہج تھی۔اسی کی بنا پر آج بھی یہ تنظیم مشکوک ہے۔اس پر وقتاً فوقتاً اس بات کے الزامات عائد ہوتے رہے ہیں کہ وہ ملک اور سماج میں تفریق پیدا کر رہی ہے۔مذہبی بنیادوں پر وہ عوام کو ورغلا کر ان میں تنافر پیدا کر رہی ہے۔ایسی تنظیم اگر فوجی اسکول چلائے گی تو یقیناً اس کا نصاب سرکاری اور دوسرے تعلیمی اداروں سے مختلف ہوگا حالانکہ دعویٰ تو یہ کیا گیا ہے کہ اس میں سی بی ایس ای کے نصاب کے مطابق تعلیم ہوگی لیکن کیا وہ تربیت بھی غیر جانبدار ہو کرے گی اس کی کیا گارنٹی ہے اور وہ کیوں ایسا کرے گی؟سچ تو یہ ہے کہ وہ بچوں کی تربیت اپنی فکری نہج پر ہی کرے گی جس سے آگے چل کر مسائل پیدا ہوں گے اور فوج کا ماحول بھی سماج کی طرح آلودہ ہو جائے گا۔آر ایس ایس اس وقت ملک میں سرسوتی ودیا مندر، ششو مندر اور دیگر ناموں سے بیس ہزار اسکول چلا رہی ہے۔ان اسکولوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج کی نئی نسل یہاں رہنے والے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو نہ صرف

نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے بلکہ ان پر ظلم وتشدد تشدد کرنے میں بھی یقین رکھتی ہے۔اسی لئے بھاجپا جب سے اقتدار میں آئی ہے اس نئی نسل کی نفرت ابھر کر ہجومی تشدد کی شکل میں سامنے آ گئی ہے اسی طرح دفاتر میں ملازمت کرنے والے بعض پڑھے لکھے لوگ بھی کسی مسلم کی لمبی داڑھی دیکھ کر زیرلب گالی بک دیتے ہیں جو عام بات ہے۔

سرکار کے پاس کیا کمی ہے جو فوج جیسے اہم ادارے کے لئے آر ایس ایس کو آگے لا رہی ہے ؟سرکار کے لئے ضرورت کے مطابق اسکولوں کا قیام ضروری ہے،اس کو یہی کرنا چاہئے تھا تا کہ اس کے اتنے اہم ادارے محفوظ رہیں لیکن خاص نظریہ کی حامل سرکار نے قومی سلامتی کی جانب توجہ دینے کے بجائے ایک ایسی تنظیم کو فوجی اسکول قائم کرنے کی اجازت دے دی ہے جو فکری اعتبار سے یک رخی ہے۔جس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس اسکول کا نام کسی فوجی جنرل اور کرنل کے نام پر نہ رکھ کر ''رجو بھیا سینک ودیا مندر'' رکھا گیا ہے۔رجو بھیا کوئی فوجی نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے ملک کے لئے کوئی قربانی دی تھی بلکہ آر ایس ایس کے وہ سابق سرسنگھ چالک تھے جن کے نام پر یہ اسکول قائم کیا جارہا ہے۔آر ایس ایس اپنے کارکنان کو وقتاً فوقتاً لٹھ بازی سے لے کر کئی اور طرح کی تربیت دیتی رہی ہے۔بعض مواقع پر سخت گیر ہندو کارکنان کے یہاں سے ناجائز اسلحہ تک برآمد ہوئے ہیں،اس تنظیم کے بارے میں ہمیشہ اس شک کا اظہار کیا گیا کہ سماجی امور کی آڑ میں ہندوؤں کو مسلح کرنے میں بھی یقین رکھتی ہے۔

آر ایس ایس کے زیر انتظام قائم ہونے والے اس فوجی اسکول سے پڑھ کر فوج میں جانے والے فوجیوں کی کیا ذہنیت ہوگی اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے۔جس کی جانب سماج وادی پارٹی کے قومی صدر اکھلیش یادو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس اسکول میں میں پڑھنے والے فوجی لنچنگ سیکھیں گے۔ملک اور فوج کو خاص ذہنیت کے حامل فوجیوں کی بالکل ضرورت نہیں ہے،جو سرحد سے لے کر اندرون ملک ضرورت پڑنے پر اپنا فریضہ انجام دینے کے بجائے خاص نظریہ کے تحت کام کریں۔اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ ان فوجیوں کو جو تربیت دی

جائے گی اس میں مذہبی اقلیت دشمنی لازمی ہوگی  اسی لئے یہ اسکول قائم کیا گیا ہے تا کہ سماج کے بعد فوج کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لیا جائے۔اس طرح کے اسکول آر ایس ایس کی طویل مدتی منصوبے کا نتیجہ ہیں۔آر ایس ایس ملک کے ہر شعبے میں دخیل ہو چکی ہے،ابھی تک فوج ہی بچی تھی جس میں براہ راست اس کا دخل نہیں تھا لیکن اب سرکار نے اس کا راستہ بھی صاف کر دیا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ متنازع تنظیم کو فوج سے بالکل دور رکھا جائے  اور سرکار کو مجبور کیا جائے کہ وہ ضرورت کے مطابق آرمی اسکول قائم کرے کیونکہ ملک کو ایسے فوجیوں کی قطعی ضرورت نہیں ہے جو کسی خاص ذہنیت کے حامل ادارے سے فارغ ہو کر فوج میں پہنچیں اور پھر ملک کی حفاظت کرنے کے بجائے وہ کسی ایسی سمت میں کام کرنے لگیں جس سے اس کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے۔اس لئے اس سیکولر شخصیات اور سماجی تنظیموں کو اس جانب فوری توجہ دینا چاہئے ورنہ فوج بھی بھگوا رنگ میں رنگ دی جائے گی۔

# میڈیا ٹرائل سے خوف زدہ ہیں اپوزیشن پارٹیاں

جمہوریت میں حکومت سیاسی داؤں پیچ سے حاصل ہوتی ہے جس کے لئے سیاستداں طرح طرح کے ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں، جس میں ذات برادری اور مذہب سب سے اہم ہے۔علاقائی سطح پر ذات برادری اور قومی سطح پر مذہبی منافرت حصول حکومت کا سب سے کامیاب ہتھکنڈا ہے۔ملک کی کوئی ایسی پارٹی نہیں ہے جوان دونوں سے انکار کرسکتی ہو۔اسی طرح ہر شخص کسی نہ کسی طور پر کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کا ووٹ بینک ہے، حالانکہ جمہوریت میں ہر شخص کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس کو چاہے ووٹ دے لیکن عام طور پر جو ہمارے ملک کا سیاسی رویہ ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر اوپر میں نے کیا ہے۔جو فرد/سماج/طبقہ جس پارٹی کو ووٹ دیتا ہے اس کی اس پارٹی سے کچھ جائز کچھ ناجائز امیدیں ہوتی ہیں، اقتدار ملنے کے بعد جن کا پورا کرنا پارٹی کا فرض ہوتا ہے اور اگر پارٹی اقتدار میں نہیں ہے تو اپوزیشن میں رہ کر وہ کوشش کرتی ہے کہ اس کے ووٹروں کو کسی بھی طرح کی دشواری کا سامنا نہ ہو، جس کے لئے وہ سینہ تان کر اسمبلی اور پارلیمنٹ سے لے کر سڑک تک ان کے حقوق کی لڑائی لڑتی ہے۔یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو پارٹی اقتدار میں نہیں ہوتی ہے ،وہ ہر جگہ جد و جہد کرتی ہے اور حکمراں پارٹی کو اس کے اپنے ایجنڈے کے نفاذ اور منصوبوں کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی ہے۔ایک بات اور اقتدا میں تو ایک ہی پارٹی ہوتی ہے لیکن اقتدار سے باہر ہو کر کئی پارٹیاں اپوزیشن میں ہوتی ہیں اس طرح وہ سبھی پارٹیاں اگر ایک کائی بن جائیں تو حکمراں پارٹی کا ناطقہ بند کرسکتی ہیں۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس وقت ملک میں اپوزیشن نہیں ہے اور اگر مختلف پارٹیاں چاہتیں تو حکومت کے خلاف سب متحد ہو کر ایک اکائی بن جاتیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان پارٹیوں کا متحد ہونا تو دور کی بات ہے سبھی پارٹیاں اندورنی خلفشار اور انتشار کا شکار ہیں، جس کا سب سے زیادہ نقصان ان ووٹروں کو اٹھانا پڑ رہا ہے جنہوں نے اپوزیشن پارٹیوں کو ووٹ دے کر اسمبلی اور

پارلیمنٹ بھیجا تھا، کسی بھی معاملے میں یہ پارٹیاں حکمراں پارٹی کے سامنے تھوڑی دیر تک بھی نہیں ٹک پا رہی ہیں، کیونکہ ان پارٹیوں کے لیڈران کے اپنے اپنے ذاتی مفاد ہیں۔

مرکز میں حکمراں پارٹی نے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد ایک ایسا میکنزم بنا دیا ہے جس کے بعد ہر پارٹی میں سناٹا ہے، سب خاموش ہیں، کوئی بھی کچھ کر سکنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ حکمراں پارٹی ایک خاص فکر کی حامل ہے، جس نے اپنی ابتدا سے ملک کے تانے بانے کو نشانے پر لے کر اپنے وجود کو مستحکم کیا خواہ وہ بابری مسجد کی شہادت ہو یا پھر گودھرا میں نسل کشی، یا پھر اب طلاق ثلاثہ بل کے ذریعہ یکساں سول کوڈ کی طرف جانے کا راستہ ہموار کرنا ہو، ہر جگہ اور ہر دور میں اس پارٹی نے مسلمانوں کو حاشیے پر رکھا حالانکہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ اس پارٹی کے بانیوں نے اسی لئے پارٹی قائم ہی کی تھی، افسوس کی بات تو یہ ہے کہ وہ پارٹیاں جو خود کو سیکولر نہ صرف کہتی رہی ہیں بلکہ انہوں نے اسی سیکولرزم کے بہانے مسلمانوں کا ووٹ لیا اور اقتدار کے مزے لوٹے خواہ وہ کانگریس ہو، بی ایس پی ہو یا پھر ایس پی یا پھر جنوبی ہند کی پارٹیاں یہ تینوں پارٹیاں، سب نے ہمیشہ مسلمانوں کا ووٹ لیا لیکن آر ایس ایس نے جب سماج پر بھگوا رنگ چڑھا کر بھاجپا کو اقتدار تک پہنچایا تو ان سبھی پارٹیوں کی گھگھی بندھ گئی اور یہ پارٹیاں بھی دھیرے دھیرے خود ہندتو کی طرف لے جانے لگیں، مجھے اس بات سے کوئی دکھ نہیں کہ ان پارٹیوں کا جھکاؤ ہندتو کی طرف کیوں ہوا، ظاہر سی بات ہے کہ صرف مسلمانوں کے ووٹ سے اقتدار تو مل نہیں جاتا ایسے میں ہندو ووٹر کو راغب کرنے کیلئے ان کو کچھ تو کرنا ہی تھا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندو ووٹر اور میڈیا ٹرائل سے خوف زدہ ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمانوں کو بیچ منجدھار میں بھلا چھوڑ کر وہ خاموش کیوں ہو جاتیں؟

مودی حکومت کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد پارلیمنٹ میں حلف برداری کے وقت جے شری رام کے نعرے لگانا اس بات کا اعلان تھا کہ ہم یہاں پارلیمنٹ میں اپنے طریقے سے لنچنگ کر رہے ہیں اور آپ اپنے طریقے سے کریں، اگر ایسا نہ ہوتا تو جب اسد الدین اویسی اور

دیگر مسلم ممبران پارلیمنٹ حلف لینے کے لئے آئے تو یہ مذہبی نعرے ایک خاص انداز اور پس منظر میں کیوں لگائے جاتے؟ حکمراں پارٹی کے اس عمل اور اپوزیشن پارٹیوں کی خاموشی نے پورے ملک میں ایک پیغام دیا کہ اب ہر سطح پر لنچنگ ہوگی جس کے لئے سب کو تیار رہنا چاہئے۔اسی طرح سے طلاق ثلاثہ بل کی ایوان بالا میں منظوری اس بات کی غماز ہے کہ یہ سبھی پارٹیاں ایک ہی موقف اور نقطہ نظر کی حامل ہیں،واک آؤٹ کے ذریعہ بھاجپا کو فائدہ پہنچانے پر وزیر داخلہ امت شاہ اپنے ایک مضمون میں ان سب کا ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا کہ میں ان سب کا شکر گذار ہوں نے راست طور پر یا براہ ست یعنی اس بل کے حق میں ووٹنگ کے کے یا پھر واک آؤٹ کر کے ہمارا تعاون کیا۔

اتر پر دیش میں ادھر محض چند ماہ میں مسلمانوں کی لنچنگ اور ان سے جے شری رام کا نعرہ لگوانے اور ان کی پٹائی کے کئی معاملات سامنے آچکے ہیں،لیکن اپوزیشن کی سبھی پارٹیاں بالکل خاموش ہیں،ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ہے ہی نہیں بلکہ یومیہ وظیفے میں شامل ہے۔علی گڑھ کا ایک طالب علم ٹرین سے بریلی جا رہا تھا جس کو راستے میں راج گھاٹ نرورا اسٹیشن پر چند اوباشوں نے پکڑا اور جے شری رام کا نعرہ لگانے پر مجبور کرنے لگے جب اس نے ایسا نہیں کیا تو پٹائی کی گئی،اسی طرح اناؤ میں ایک مدرسہ کے چند طالب علم ایک میدان میں کرکٹ کھیل رہے تھے جن پر حملہ کیا گیا اور ان سے بھی جے شری رام کے نعرے لگوانے کی کوشش کی گئی۔کانپور میں ایک نوجوان نماز پڑھ کر گھر واپس آرہا تھا جس کے ساتھ لنچنگ کی آ گئی اس سے جے شری رام کا نعرہ لگوانے کی کوشش کی گئی اور دھمکی دی گئی کہ اگر دوبارہ ٹوپی میں نظر آ گئے تو خیریت نہیں۔ابھی چند دن ہوئے چندولی میں میں خوفناک لنچنگ کا معاملہ سامنے آیا،جہاں ایک پندرہ سالہ لڑکے کو صرف اس لئے جلا دیا گیا کہ اس نے جے شری رام کا نعرہ لگانے سے انکار کر دیا تھا،جس کی بنارس کے ایک اسپتال میں موت بھی ہوگئی،اس سے بھی افسوسناک بات تو یہ ہے کہ وہاں کے ذمہ دار ایک پولیس افسر نے میڈیا کو بتایا تھا کہ یہ لنچنگ کا معاملہ نہیں ہے یعنی جانچ سے قبل ہی انہوں

نے اس کا رخ تبدیل کر دیا۔ ان سبھی واقعات پر سماج وادی پارٹی، بہوجن سماج پارٹی اور کانگریس
نے خاموشی اختیار کئے رکھا، کسی بھی پارٹی کا لیڈر سامنے نہیں آیا، یہاں تک کہ یوپی میں غنڈہ
راج کا معاملہ بھی نہیں اٹھایا لیکن جب سون بھدر میں گولیوں سے دس لاشیں گرادی گئیں اور
رائے بریلی میں اناؤ کی لڑکی پر ٹرک چڑھا دیا گیا تو سب چیخ اٹھے۔ یہ اچھی بات ہے کہ مظلوموں
کے ساتھ کھڑا ہوا جائے ان کے حق کی لڑائی لڑی جائے، لیکن انصاف دلانے اور مظلوموں کی
لڑائی لڑنے کے دوہرے پیمانے یہ سیاسی پارٹیاں کیوں اختیار کرتی ہیں؟ مسلمانوں کو اس
بارے میں غور کرنا چاہئے۔ ابھی اتر پردیش کی ایک پارٹی کے سپریم لیڈر نے ایک میٹنگ میں
مسلم معاملات پر خاموشی اختیار کرنے کی بات کہی حالانکہ مسلمانوں کا اچھا خاصہ ان کو ووٹ ملتا
ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اتر پردیش میں مسلمان ہی ایسی پارٹیوں کو اقتدار میں لاتا ہے تو کوئی
تعجب نہیں ہونا چاہئے اس کے باوجود انہوں نے ایسا فرمان سنایا، جس کی سب سے بڑی وجہ
میڈیا ٹرائل کا خوف ہے۔ اپوزیشن پارٹیوں کو اس بات کا ڈر ہے کہ اگر وہ مسلم معاملات کو اٹھاتی
ہیں تو آر ایس ایس اور بھاجپا اور اس کا آئی ٹی سیل ان پر مسلم کاز کے لئے لڑنے کا الزام لگادے گا
جس کے بعد یک رخی میڈیا ان کا ٹرائل شروع کردے گی، جس سے ان کا ہندو ووٹر ان سے
ناراض ہوجائے گا۔ وہ اپنے ہندو ووٹروں کو بچانے کیلئے مسلمانوں کا ووٹ لے کر ان ہی کے حق
میں آواز نہیں اٹھاتے ہیں جو ناانصافی کی آخری حد ہے۔ ایسے میں مسلم قیادت اور مسلمانوں کو
سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے تاکہ سیاسی سطح پر وہ ان کو یا تو اپنے حق میں اعلانیہ آواز اٹھانے پر مجبور
کریں یا پھر کوئی متبادل تیار کریں ورنہ یہ لوگ ووٹ لیتے رہیں اور ظالموں کا ساتھ دیتے رہیں
گے۔

# سازشوں بھرا حب الوطنی کا نیا بیانیہ

جاری بیانیہ کو ختم کرنے کے لئے اس کے متوازی کے بجائے اسی پر نیا بیانیہ (New Narrative) چلایا جاتا ہے۔سچ پر جھوٹ اور جھوٹ پر سچ کو طویل عرصے کے بعد کامیابی ملتی ہے۔کوئی بھی بیانیہ تعلیمی اداروں میں پنپ کر کتابوں کے ذریعہ سماج تک پہنچتا ہے، یہ بیانیہ میڈیا اور سوشل میڈیا کے بیانیہ سے زیادہ دیر پا ہوتا ہے۔کسی بھی ملک کے تعلیمی ادارے اور وہاں شائع ہونے والی کتابیں حاوی بیانیہ کی غماز ہوتی ہیں۔مرکز میں جب سے بھاجپا اقتدار میں آئی ہے ،حب الوطنی کا نیا بیانیہ تراشنے کی کوششیں شروع ہوگئیں، جو مسلسل چل رہی ہیں۔یہ نیا بیانیہ سچ کے لبادے میں جھوٹ کی پیشکش ہے،جس کے لئے تمام طرح کے ہتھکنڈے اختیار کئے جا رہے ہیں۔وقتی طور عوامی ذہن کو تبدیل کرنے کے لئے میڈیا کا استعمال کیا جارہا ہے تاکہ عوام کے ذہنوں میں حب الوطنی کا نیا پیراڈائم راسخ ہوجائے۔لیکن طویل مدتی عمل کتابوں، اسکولوں اور کالجوں میں اختیار کیا جارہا ہے۔اسی لئے آر ایس ایس نے ''ودیا مندر'' جیسا ادارہ قائم کر کے الگ ذہن تیار کیا، یہ منصوبہ ایک طویل مدت سے چل رہا ہے، جہاں ذہنوں کو مسموم کر کے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ملک سے محبت صرف ہندو کرتا ہے اور مسلمان باہری ہیں جو صرف یہاں کے وسائل کا استعمال کرتے ہیں ملک کی تعمیر وترقی میں وہ کوئی کردار نہیں ادا کرتے ہیں۔

آنجہانی وزیر اعظم اٹل بہاری کے دور میں مرلی منوہر جوشی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ہوا کرتے تھے،اس وقت کالجوں اور اسکولوں میں ایک خاص طرح کا نصاب تیار کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا جس کا مقصد یہی حب والوطنی کا نیا بیانیہ تراشنا تھا،لیکن 2014 میں جب سے بھاجپا مرکز میں اقتدار میں آئی ہے،بہت منصوبہ بند طریقے سے اس پر عمل شروع ہوگیا ہے اور آج حالات یہ ہوگئے ہیں کہ مسلمان ہر جگہ شک کی نگاہ سے نہ صرف دیکھا جانے لگا ہے بلکہ ہجومی تشدد کا وہ مسلسل شکار ہونے لگا ہے،ہجوم/عوام کے ذہنوں میں یہ تبدیلی اسی نئے بیانیہ کی دین

ہے۔جس نے حب الوطنی کا نیا معیار اور نیا تصور قائم کیا اور ملک کی اکثریت یہاں کی سب سے بڑی اقلیت کو ملک دشمن تصور کرنے لگی۔

یہ سب جانتے ہیں کہ ونایک دامودر ساورکر ایک ہندو انتہا پسند تھے، جنہوں نے انگریزوں سے معافی مانگ کر پوری زندگی ان کی غلامی کی جب کہ بھگت سنگھ، سبھاش چندر بوس اور اشفاق اللہ خان وغیرہ نے ملک کے لئے جان نچھاور کی لیکن ان دونوں کو ایک جگہ کھڑا کر کے برابری کا درجہ دینے کا نیا بیانیہ شروع کیا گیا۔ ابھی حال ہی میں وبھو پرندرے کی کتاب ''ساورکر: دی ٹرو اسٹوری آف دی فادر آف ہندوتوا'' شائع ہوئی ہے۔جس میں ساورکر کو ایک ایسا دیش بھکت قرار دیا گیا ہے جس نے ''حکمت عملی'' کے تحت انگریزوں سے معافی مانگی تھی لیکن سچ یہ ہے کہ ساورکر نے جیل سے واپسی کے بعد کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو انگریزوں کے خلاف اور ملک کی آزادی کے لئے ہو بلکہ انہوں نے انگریزوں کے فلسفہ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کو تقویت دے کر ان کی مدد ہی کی۔ کتاب کا غالب حصہ ساورکر کے سچ پر پردہ ڈال کر نیا بیانیہ لکھنے کی سازشوں سے بھرا پڑا ہے۔اسی طرح کی کتابوں کا نتیجہ ہے کہ آج ایک پوری ایسی نسل تیار ہوگئی ہے جو ساورکر کو محب وطن اور مصلح قوم مان کر مجاہد آزادی کا نہ صرف درجہ دینا چاہتی ہے بلکہ دوسروں سے زبردستی منوانا بھی چاہتی ہے۔حال ہی میں دہلی یونیورسٹی میں ساورکر کی مورتی راتوں رات لگادی گئی، طرفہ تماشہ یہ کہ اس مورتی کے ساتھ سبھاش چندر بوس اور بھگت سنگھ کی تصویریں بھی لگائی گئی ہیں، تاکہ اگر ان کو ہٹایا جائے تو وہ آخر الذکر مجاہدین آزادی کو ساورکر کی مورتی کے لیے ڈھال بنا سکیں۔

دوسری طرف ان اداروں/ افراد کو بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو سچ کے لبادے میں جھوٹ کو ماننے اور تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کشمیر سے دفعہ 370 کے خاتمے کے بعد پراگندہ ذہن رکھنے والوں نے وزیر اعظم نریندر مودی کو ڈریکلا بتانے والا پوسٹر شوسل میڈیا پر وائرل کیا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے یہ پوسٹر کیمپس

میں لگایا ہے۔ یونیورسٹی کو بدنام کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا ان طلبا کا علاج کیا جانا چاہئے حالانکہ انسانی خون میں لت پت اور ہاتھوں میں انسانی کھوپڑی والے اس ڈریکلا کی تصویر والا پوسٹر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نہیں تھا بلکہ یہ فوٹوشاپ تصویر تھی جو 15 اگست کو لندن میں ہوئے مظاہرے کی ہے، اس تصویر کو اپنے ٹوئٹر ہینڈل پر شیئر کرتے ہوئے علی گڑھ پولیس نے واضح کیا کہ ایسی کوئی تصویر یونیورسٹی میں نہیں لگائی گئی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یونیورسٹی کو بدنام کرنے والے اس فیس بک اکاؤنٹ کے خلاف خود علی گڑھ پولیس آئی ٹی ایکٹ کے تحت ایف آئی آر درج کر کیا اس کے خلاف کارروائی کرتی مگر ایسا نہیں ہوا۔

نوجوان ذہنوں میں جو سوالات اٹھتے ہیں وہی آگے چل کر کسی بھی ملک کی بنیاد بنتے ہیں، اظہار رائے کی آزادی آئینی ہے جس پر قدغن نہیں عائد کی جاسکتی ہے، اور اگر کوئی حکومت ایسا کرتی ہے تو وہ آواز دبانے والی قرار دی جائے گی۔ جے این یو کھلے ذہن اور سوالات اٹھانے کے لئے معروف ہے، جہاں ذہنوں میں نہ صرف سوالات کلبلاتے ہیں بلکہ ان کو اظہار بھی بہت پاورفل طریقے سے کیا جاتا ہے، اسٹیج سے لے کر ہر سطح پر اظہار رائے کی آزادی یہاں دکھائی دیتی ہے، جے این یو کے در و دیوار اس کے نہ صرف گواہ ہیں بلکہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں، ان ثبوتوں کو مٹانے کے لئے بڑے پیمانے پر کارروائی کی گئی اور یونیورسٹی کی دیواروں کو صفائی کے نام پر حکم دیا گیا کہ اب یہاں دیوار پر حکومت مخالف پوسٹر نہیں لگائے جاسکتے ہیں جبکہ اس یونیورسٹی کی سب سے بڑی خوبصورتی یہی تھی کہ آپ کسی بھی ہاسٹل اور شعبے میں چلے جائیں بڑے واضح الفاظ اور تصاویر میں طلبا کے ذہن کو پڑھ سکتے ہیں۔ یہ آواز دبانے کی بدترین مثال ہے۔ چونکہ انتظامیہ سنگھی ذہنیت کی حامل ہے اس لئے اس کے ذریعہ یہ کارروائی کرائی جارہی ہے۔ جس کا مقصد دیواروں کی صفائی اور یونیورسٹی کی خوبصورتی میں اضافہ نہیں بلکہ طلبا کے ذہنوں میں کلبلانے والے سوالات کو باہر آنے سے روک کر نیا بیانیہ خلق کرنا ہے جو آزادی اظہار رائے پر ایک بڑا حملہ ہے۔

لکھنؤ میں انجمن اصلاح المسلمین کے تحت چلنے والے ممتاز پی جی کالج کو آل انڈیا ودیارتھی پریشد (اے بی وی پی) نے اس بارنشانے پرلیااور 15اگست کوہونے والے پروگرام کے بعدنہ صرف وہاں کے حالات کوکشیدہ کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ کالج پر''وندے ماترم'' نہ گانے دینے کاالزام عائدکرتے ہوئے اس کی منظوری کومنسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔چونکہ یہ کالج مائنارٹی ہے اس لئے اس کوبھی بدنام کرنے کی کوشش کی گئی،حالانکہ ''وندے ماترم'' کی آئینی حیثیت کیا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں،اس کے باوجودمنصوبہ بندسازش کے تحت اے بی وی پی کی یونٹ نے اسٹیج سے مسلم مائنارٹی کالج میں''وندے ماترم'' گانے پراصرارکیا،ان کومعلوم تھا کہ اس کالج میں یہ کبھی نہیں ہوااوراس باربھی نہیں ہوگاجس کے بعدان کوموقع مل جائے گا۔

اسی نئے بیانیہ کی ایک کڑی اترپردیش مدرسہ بورڈ کاامدادیافتہ مدارس کے لئےوہ حکم نامہ ہے جس میں 15اگست کوہونے والے پروگرام کی ویڈیوگرافی کاحکم دیتے ہوئے اس کومتعلقہ ادارے میں جمع کرنے کاحکم دیا گیاتا کہ یہ مدارس اس کوبطورثبوت پیش کریں کہ یہ قومی تہوارمنایا گیااوراس میں ''راشٹریہ گان'' پڑھا گیا۔حالانکہ آرایس ایس کے ہیڈکوارٹرناگپورمیں ترنگاجھنڈا کے بجائے بھگواکوہی ہمیشہ ترجیح دی گئی،

اس کی عمارت پرترنگاجھنڈالہرانے پر 2001میں تین افرادکے خلاف آرایس ایس نے مقدمہ درج کرایاتھا،اس معاملے میں 2013میں عدالت بابامینڈھے،رمیش کلمبے اوردلیپ چٹوانی کوباعزت بری کردیاتھا۔چونکہ آرایس ایس یوم آزادی اوریوم جمہوریہ کےموقع پراپنے دفاترمیں ترنگاجھنڈانہیں لہراتاتھااس لئےان تینوں محبین وطن نے زبردستی ناگپورکےہیڈکوارٹرکی عمارت پرچڑھ کرترنگالہرایاتھا۔آرایس نے ایس نے 2002کےبعدیہ عمل شروع کیاہے۔چند دن قبل دیش بھکتی کاسوانگ رچنے والی آرایس ایس نے دراصل یہ موڑاس لئےلیا کیونکہ اس کو اندازہ ہوگیاتھا کہ اب حب الوطنی کانیابیانیہ تراشےبغیرمقاصدنہیں حاصل ہوسکتے ہیں،اس لئے عوام کاذہن تبدیل کرکےان کاووٹ حاصل کرنے کے لئے یہ سازش کی گئی۔آج جب بے

روزگاری اور معیشت میں گراوٹ اپنی آخری حدوں میں ہے،علاج کے بغیر بچے دم توڑ رہے ہیں،ایک بڑی آبادی کے سروں پر چھت نہیں ہے،وہ بھوکے پیاسے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں،نوجوانوں کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جارہا ہے ایسے وقت میں حکومت ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے ملک وقوم کو مزعومہ دیش بھکتی کی گھٹی ہی پلا رہی ہے اور قوم آر ایس ایس کے اس تراشے گئے جدید بیانیے میں مگن ہے جو ملک کے لئے بہت نقصان دہ ہے۔حب الوطنی کے نئے بیانیے کے مطابق اب ملک کے عوام،اس کی مٹی اور دنیا میں اس کو سرخ رو کرنے والی علامتوں سے محبت حب الوطنی نہیں ہوگی بلکہ حب الوطنی ان مظاہر سے محبت اور ان کا اظہار ہوگا جن کا تعلق خالص ہندتوا وادی نظریہ سے ہو آر ایس ایس کی کنٹرول والی حکومت اسی مزعومہ حب الوطنی کے بیانیے کی ترویج میں شدومد کے ساتھ مصروف ہے جس کے دوررس اور دیرپا منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

# ملک کی سلامتی اور ٹیرر فنڈنگ

ملک فرد سے بنتا ہے، فرد ملک کی بیک وقت سب سے چھوٹی اور سب سے بڑی اکائی بھی ہے جسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ملک کی سلامتی کے لئے ہر سطح پر انتظامات کئے جاتے ہیں خواہ داخلی ہو یا خارجی۔ حال ہی میں مرکزی حکومت نے یو اے پی اے (Unlawful Activities Prevention Act) ترمیم بل کو منظوری دی ہے۔ اس بل کے تحت حکومت ماورائے عدالت کسی کو بھی دہشت گرد قرار دے سکتی ہے۔ بلمیں کسی شخص کو دہشت گرد قرار دینے کے اہتمام کے غلط استعمال ہونے کے خدشہ کو بے بنیاد ٹھہراتے ہوئے وزیر داخلہ امت شاہ نے بل پر ہوئی بات چیت کے جواب میں کہا تھا کہ دہشت گردی سے مقابلہ کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے دلیل دی تھی کہ قانون میں اگر اس طرح کا اہتمام 2009 میں رہا ہوتا تو کولکاتہ پولیس کے ذریعے پکڑا گیا دہشت گرد یاسین بھٹکل کبھی نہیں چھوٹ پاتا اور آج این آئی اے کی گرفت میں ہوتا۔ شاہ نیکہا تھا کہیہ بڑے پیچیدہ معاملے ہوتے ہیں جن میں ثبوت ملنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ ایسے معاملے بین ریاستی اور عالمی قسم کے ہوتے ہیں۔

اس ہفتے مدھیہ پردیش سے ایک خبر آئی ،جس کو نہ تو قومی میڈیا نے موضوع بحث بنایا اور نہ ہی حکومت کی جانب سے کوئی بریفنگ دی گئی، حالانکہ بادی النظر میں یہ پہلا ایسا معاملہ تھا جس میں یو اے پی اے ترمیمی بل کے تحت کارروائی کی جانی چاہئے تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ مدھیہ پردیش کے ستنا میں سنیل، بلرام اور شبھم کو اے ٹی ایس نے گرفتار کیا ہے جبکہ دو افراد سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ جسے انڈین ایکسپریس نے رپورٹ کیا ہے۔ ستنا کے ایس پی نے بیان دیا ہے کہ یہ معاملہ "ٹیرر فنڈنگ" کا ہے۔ انہوں نے اس کی پوری تفصیلات بھی دی ہیں اور بتایا ہے کہ پاکستان سے ان لوگوں کو فنڈنگ کی جا رہی تھی تا کہ یہ ملک میں بدامنی کو ہوا دے سکیں۔ اہم بات یہ ہے کہ بلرام 2017 میں بھی بالکل اسی طرح کے معاملے میں گرفتار کیا گیا تھا اور ابھی چند ماہ

قبل ہی وہ ضمانت پر رہا ہوا تھا لیکن آنے کے بعد اس نے دوبارہ اپنے آقاؤں سے رابطہ کیا اور کام شروع کردیا۔اس باران لوگوں نے پاکستان میں دو نئے افراد تیار کئے جن سے ان کا رابطہ وہاٹس ایپ کالنگ کے ذریعہ ہوتا تھا۔پولیس کو 25 ایسے اکاؤنٹ کی تفصیلات معلوم ہوئی ہیں جن میں یہ رقم ٹرانسفر کی جاتی تھی۔چونکہ پارلیمنٹ میں اس بل کی اہمیت کی وضاحت کے لئے وزیر داخلہ امیت شاہ نے یاسین بھٹکل کے نام کا استعمال کیا تھا اور مدھیہ پردیش والے معاملے میں کوئی یسین بھٹکل یا اس طرح کے نام کا شخص ملوث نہیں پایا گیا بلکہ ایسے افراد اے ٹی ایس کی گرفت میں آئے جن کا تعلق اکثریتی طبقے سے ہے اس لئے سب کے سب خاموش ہو گئے۔

دوسری طرف 29 اگست کو صبح چنئی میں این آئی اے نے چھاپہ ماری کی جس میں پانچ مسلم افراد کو گرفتار کیا گیا جن میں ایک خاتون بھی ہے۔میڈیا نے اس کو بغیر آگے کی تفتیش کے اسلامک اسٹیٹ سے جوڑ دیا اور دو گھنٹے کے اندر این آئی اے نے بھی رپورٹ کرتے ہوئے پورے ملک کو بتادیا کہ پانچ مسلم گرفتار کئے گئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ قومی سلامتی سے متعلق ستنا کے اتنے اہم معاملے کو مرکزی حکومت نے کیوں نظر انداز کیا؟ قومی میڈیا نے اس معاملے کو موضوع کیوں نہیں بنایا؟ میڈیا نے دہرے معیار صرف اس لئے اختیار کئے ہیں تا کہ وہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے اپنے ایجنڈے پر گامزان رہ کر ملک میں سنسنی پھیلا سکے۔مرکزی حکومت کی بنیادیں قومی سلامتی پر ہیں، وہ دیش بھکتی کا ایسا پاٹھ پڑھاتی ہے کہ پوری قوم دوسرے معاملات اور پریشانیوں کی طرف سر اٹھا کر نہیں دیکھتی ہے۔وزیر اعظم نریندر مودی آبادی کو بھی دیش بھکتی سے جوڑ دیتے ہیں، وزیر داخلہ امیت شاہ ہر معاملے میں بس ایک بات کہتے ہیں کہ قومی سلامتی سے سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا ہے جب کہ میڈیا قومی سلامتی کے نام پر جھوٹ پیش کر رہا ہے، وہ اس طرح کی ذہن سازی کر رہا ہے گویا صرف ہندو ہی محبین وطن ہیں ان کے علاوہ سب کے سب ملک وقوم کے دشمن ہیں تبھی تو دارالعلوم دیوبند میں زیر تعمیر کتب خانے کو ہیلی پیڈ بتا کر وہاں ضلع کلکٹر کو مجبور کیا کہ وہ اس کی جانچ کریں۔لیکن

اس اہم معاملے میں دونوں خاموش ہیں۔

2016 میں لکھنؤ کی حاجی کالونی میں ہوئی فرضی مڈبھیڑ تو سب کو یاد ہوگی، بغیر کسی ثبوت کے ایک بے گناہ کو پہلے دہشت گرد بنایا گیا اور پھر گولیوں سے اس کا سینہ چھلنی کر دیا گیا۔اس کے اہل خانہ پر عرصہ حیات اس طرح تنگ کیا گیا کہ مرے ہوئے بیٹے کی لاش بھی لینے کی وہ ہمت نہ کرسکے۔اسی طرح مظفر نگر اور شاملی میں شک کی بنیادوں پر 2017 میں گرفتاریاں ہوئیں تھی جب مظفر نگر کے کٹے سرا گاؤں سے مسجد کے امام عبد اللہ مامون، اور دیگر چار افراد کو گرفتار کیا تھا۔یہ گرفتاریاں شک کی بنیاد پر ہوئی تھیں۔اکثر اس طرح گرفتار کئے گئے مسلم نوجوان دہائیوں کے بعد بے گناہ ثابت ہوکر رہائی پاتے ہیں، حال ہی میں کشمیر کے دونوجوان تیس برس کی قید تنہائی کے بعد اس وقت بے گناہ ثابت ہوکر رہا ہوئے جب ان کے والدین اس دنیا سے جا چکے تھے۔

اس طرح کے ایک دو نہیں ہزاروں واقعات ہیں جب پولیس، میڈیا اور حکومت نے ماورائے عدالت کسی مسلم کو دہشت گرد بتادیا، لیکن مدھیہ پردیش میں گرفت میں آئے لوگوں کے بارے میں ٹی وی پر ایک اسکرول بھی دکھائی نہیں دیا۔ویسے مجھے تعجب بالکل نہیں ہے کیونکہ جب کسی ملک میں حب الوطنی اور انصاف کے دہرے معیار قائم ہوں اور بے شرمی سے ان پر کاربند رہا جائے تو ایسے معاملات تو سامنے آئیں گے۔ملک کی پارلیمنٹ میں دہشت گردی کی ملزمہ سادھوی پرگیہ سنگھ بیٹھی ہے جس کو ٹکٹ ایک دیش بھکت پارٹی نے دیا تھا، ظاہر سی بات ہے جب اس کی دیش بھکتی کا معیار یہی ہے کہ ایک ہندو دہشت گرد نہیں ہوسکتا، وہ صرف محب وطن ہوگا تو پھر اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے۔علی گڑھ میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کے علامتی قتل کے معالے میں بھی لیپا پوتی اور برائے نام کرروائی سے کام چلایا گیا۔اگر ان ہی معاملات میں کوئی مسلم ہوتا تو کیا منظر نامہ یہی ہوتا؟

یواے پی اے ترمیمی بل ملک کی سلامتی کے لئے نہیں منظور کیا گیا ہے بلکہ یہ بل اس لئے پاس کیا گیا ہے تا کہ اس سے دو طرح کے فائدے اٹھائے جائیں۔ پہلا تو یہ کہ اس کے ذریعہ فکری مخالفین کو سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا جائے تا کہ کوئی آواز نہ اٹھا سکے اور ہندتوا طاقتیں آزادی کے ساتھ اپنے فکری ترویج کر سکیں، جس میں سب سے زیادہ مسلمان اور دیگر فکری اقلیتیں متاثر ہوں گی ۔ دوسرے یہ کہ سیاسی مخالفین کو اس قانون کے ذریعہ نمٹایا جائے۔ حکومت یواے پی اے کو لے کر ابھی خاموش ہے۔ اس کو نہیں لگتا ہے کہ سنیل، بلرام اور شبھم کو یواے پی اے ترمیمی بل کے دائرہ میں لایا جائے ۔ جب کہ اے ٹی ایس جو سرکار کا ہی ایک ادارہ ہے، اس نے خود گرفتار کیا ہے۔ تفتیش میں ٹیر رفنڈ نگ کے واضح ثبوت اس کو مل چکے ہیں اس کے باوجود اس معاملے کو شہ سرخیوں میں نہیں آنے دیا گیا۔ یواے پی اے کے تحت ان سبھی ملزمین پر کارروائی میں کیا حکومت کو اس سے بھی زیادہ شواہد کی ضرورت ہے؟

ملک میں امن وامان کے قیام اور انصاف کی فضا کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ حکومت اور میڈیا ہر شہری، ہر ملزم اور مجرم کو ایک نظر سے دیکھے، اگر وہ دوہرے پیمانے اختیار کرتی ہے ہے تو اس سے عوام کا اعتماد نہ صرف متزلزل ہوتا ہے بلکہ حکومت سے انصاف کی امیدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں اس بات کا خدشہ رہتا ہے کہ محروم طبقات دوسرے راستے اختیار کر لیں یا وہ ملک دشمنوں کے جال میں آسانی سے پھنس جائیں، اس لئے ضرورت ہے کہ انصاف کی دیوی اب اپنی آنکھوں سے پٹی اتار کر ہر شخص کے بجائے صرف ان کے خلاف کارروائی کرے جو ایک طرف تو ملک کو ماں کا درجہ دیتے ہیں اور دوسری طرف چند ٹکوں کے لئے اسی کی سلامتی کو فروخت کر دیتے ہیں جو حقیقت میں مجرم ہیں۔

# قیام امن کے نام پر انسانیت کی پامالی؟

کشمیر میں زندگی کو معطل ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔حکومت کے دعوؤں کے برعکس زندگی مفلوج ہے۔میڈیا اور کمیونیکیشن پر پابندی ہے اس لئے درست صورت حال سے بھی آگاہی نہیں ہے،البتہ برطانوی وزیر خارجہ ڈومینک ریب کا حالیہ بیان اور میڈیا رپورٹس نے تشویش پیدا کردی ہے۔انہوں نے صاف طور پر کہا ہے کہ کشمیر میں حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں سے متعلق ہر الزام کی جانچ ہونی چاہئے۔کشمیری عوام اور فوج کے درمیان کشمکش بہت پرانی ہے،ایک طرف سے پتھر اور دوسری طرف سے گولی یا گرفتاری کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن جس طرح سے ایک طویل عرصہ سے برف کی وادی میں زندگی چٹانوں میں دب کر کراہ رہی ہے وہ حقوق انسانی کا معاملہ ہے۔بچوں،مریضوں،بزرگوں کے حقوق کی پامالی،بنیادی ضروریات سے ان کی محرومی اور بولنے کی آزادی چھین لینے سے متعلق کچھ سماجی تنظیموں اور بائیں بازو کے کارکنوں کے سوا سب خاموش ہیں،کوئی بھی حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کو تیار نہیں ہے کیونکہ ہر کسی کو اس بات کا ڈر ہے کہ حکومت اس پر ملک سے غداری کا چارج لگادے گی،وہ اس سلسلے میں یواے پی اے ترمیمی بل ، کشمیر سے دفعہ 370 ہٹانے سے قبل ہی پاس کر چکی ہے۔حکومت اور اس کی ہم نوا تنظیموں کی ’’خود ساختہ دیش بھکتی‘‘ نے انسان کے اندر سے انسانیت کو مار دیا ہے۔بچے دودھ نہ ملنے پر بھوک سے بلک رہے ہیں،ایک ماہ سے گھروں سے باہر رہنے والے نوجوان ان سے رابطہ نہیں کر سکے ہیں،تناؤ میں وہ رات میں سوتے نہیں،مگر سب بے فکر خود ساختہ دیش بھکتی میں لین ہیں۔

حکومت اور میڈیا دونوں مل کر کشمیر کی ایسی تصویر پیش کر رہے ہیں جیسے وہاں حالات نہایت پرسکون ہوں،حالات بہتر ہوں یہ اچھی بات ہے لیکن پوری قوم کو گمراہ کیا جائے یہ غیر مناسب ہے۔اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں کہیں سے کوئی آواز نہیں سنائی دیتی ہے،کچھ غیر ملکی خبر رساں ایجنسیاں اس سلسلے میں کام کررہی ہیں جن کی رپورٹ حکومت کے پریس نوٹ اور اس کی پریس

کانفرنس سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، ایسے میں سب سے زیادہ دشواری ملک کے عوام کو ہوتی ہے کہ وہ درست صورت حال سے آگاہ نہیں ہو پا رہے ہیں۔ایک طرف حکومتی ترجمان روہت کنسل دعوی کرتے ہیں کہ حالات معمول پر آگئے ہیں اور پابندیاں ختم ہوگئیں ہیں۔نوے فیصد ایسے علاقے ہیں جہاں کوئی قدغن نہیں ہیں، البتہ کاروباری سرگرمیاں بحال نہیں ہیں کیونکہ حکومت مخالف افراد دوکانداروں کو دکانیں نہیں کھولنے دے رہے ہیں، جموں کے بارے میں حکومت کا دعوی ہے کہ پانچ اضلاع میں کمیونیکیشن شروع کردی گئی ہیں لیکن دوسری طرف کشمیر ٹائمس کے ایڈیٹر پربودھ جموال کہتے ہیں کرٹیکل علاقوں میں تو ابھی کوئی نرمی نہیں برتی گئی ہے البتہ جن پانچ اضلاع میں کمیونیکیشن کی بحالی کا دعوی کیا گیا ہے ان کی ابھی تک تصدیق نہیں ہوسکی ہے۔چونکہ حکومت کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں جن کے حصول کے لئے وہ ایسی خبریں پھیلاتی ہے تاکہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرلے اس لئے حکومتی ترجمان کی باتوں پر یقین نہیں کیا جاسکتا ہے جب کہ صحافی خود جموں کا باشندہ ہے جو خود ان حالات کو جھیل رہا ہے اس لئے اس کی بات قابل تسلیم ہونی چاہئے اور روہت کنسل یا حکومت کی باتوں پر اس لئے بھی یقین نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ کشمیر میں دفعہ 370 اور 35اے کے خاتمہ کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی گئی تھی، سرکار نے پاکستان اور دہشت گردانہ حملے کا ڈر دکھا کر امرناتھ یاتریوں تک کو کشمیر سے باہر نکال دیا تھا اور آخر وقت تک وہاں کے گورنر ستیہ پال ملک کہتے رہے کہ ان کو کچھ نہیں معلوم ہے تو اب بھلا ان کی یا ان کے ترجمان کی باتوں پر کیسے یقین کرلیا جائے؟

حالت جنگ سب سے غیر یقینی حالات ہوتے ہیں، ان میں بھی حقوق انسانی کی پاسداری لازم ہوتی ہے جو ایک عالمی قانون ہے، شہریوں کی زندگی کو اجیرن نہیں بنایا جاسکتا ہے لیکن کشمیر میں کشمیریوں کی زندگی اندھے کنویں میں دبی دکھائی دیتی ہے، کثیر تعداد میں بچوں کی گرفتاریاں کی گئی ہیں لیکن اس سلسلے میں ابھی تک ان کی تعداد کا انکشاف نہیں کیا گیا ہے۔منگل کو سرکاری ترجمان روہت کنسل کی پریس کانفرنس میں اس سلسلے میں جب سوال کیا گیا کہ گرفتار شدہ بچوں

کی تعداد کتنی ہے؟اور کیا ان کی گرفتاری کے وقت جوینائل بورڈ کو مطلع کیا گیا تھا تو انہوں نے جواب دینے کے بجائے انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔اب سوال یہ ہے کہ جب جواب ہی نہیں دینا تھا تو پھر پریس کانفرنس کیوں کی؟ دراصل اس طرح کی پریس کانفرنسوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا، کیونکہ اس طرح کی بریفنگ حالات کی درست آگاہی کے بجائے خاص ایجنڈوں کے لئے ہوا کرتی ہے۔اہم بات یہ کہ نامہ نگار کھلے عام کہتا ہے سرکاری افسران اس طرح کے سوالات کا جواب نہیں دیتے ہیں۔گرفتار شدہ کشمیری بچوں سے متعلق سرکار کو اپنا موقف واضح کرنا چاہئے۔جب جوینائل بورڈ ہے تو اس کو مطلع کیوں نہیں کیا گیا ہے۔پریس کے ذریعہ بتانا چاہئے تھا کہ ان گرفتار شدہ بچوں کو کہاں رکھا گیا ہے، یہ بھی بتایا جانا چاہئے تھا یہ اصلاح گھروں میں ہیں یا جیلوں میں، ان کو بچوں والے حقوق دیئے گئے ہیں یا ان سے محروم رکھا گیا ہے۔ترجمان کی خاموشی بتاتی ہے کہ کچھ ایسا ہے جس کی پردہ داری کی جارہی ہے۔ہر ریاست میں بچوں کے اپنے حقوق ہوتے ہیں جو ان کو ملنا چاہئے، حکومت کے ترجمان نے بچوں کی گرفتاری سے متعلق سوال پر خاموش رہ کر حکومت کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے، جس کے بعد سے بچوں کی فلاح سے متعلق کام کرنے والی تنظیمیں اور حقوق انسانی کی تنظیموں کے کان کھڑے ہو گئے ہیں۔

حکومت کشمیر میں کی گئی گرفتاریوں سے متعلق خاموشی اختیار کئے ہوئے تھی اب اس نے منھ کھولا تو بتایا کہ اب تک 4500 افراد پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت دو برس کے لئے گرفتار کئے گئے ہیں۔یہ تعداد تو حکومت نے بتائی ہے۔کشمیر میں گرفتاریاں کس طرح ہو رہی ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عالمی ادارے کو بھیجے گئے اپنے پیغام میں کشمیر کے ضلع حویلی کے ایک نوجوان نے بتایا کہ 21 اگست کو اس کے گاؤں کے دو نوجوان صبح گھاس کاٹنے کے لئے گھر

سے نکلے تھے جو دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے، کئی دنوں کے بعد میڈیا کے توسط سے پتہ چلا کہ وہ گرفتار کر لئے گئے ہیں کیونکہ دونوں مجاہد تھے جو پاکستان سے بھیجے گئے تھے۔ پیغام بھیجنے والے نوجوان نے خبر رساں ادارے کو بتایا کہ ان میں سے ایک نوجوان دسویں کا طالب علم ہے جبکہ دوسرا محنت مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلاتا ہے۔ اگر اس نوجوان کا دعوی سچ ہے جو بعید نہیں تو یہ ظلم کی حد ہے۔ جس پر انصاف پسند افراد کو خاموش نہیں رہنا چاہئے۔ کشمیر ملک کا اٹوٹ حصہ ہے اس سے کسی کو انکار نہیں، وہاں قیام امن کے لئے سب کچھ ہو مگر انسانیت کی پامالی نہیں ہونی چاہئے۔ اگر انسانیت کی پامالی پر ہم خاموش رہتے ہیں تو ہم سب مجرم گردانے جائیں گے۔ داخلی اور ملکی معاملے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ملک کے ایک حصے میں انسان اپنے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جائے اور ہم خاموش رہیں، اس معاملے میں مسلمانوں سے تعلق رکھنے والی تنظیمیں بالکل خاموش ہیں، اس کی وجہ بھی ڈر اور خوف کے سوا کچھ نہیں ہے، حکومت نے جو ڈر کا ماحول بنایا ہے اس نے سماج کو تشنج میں مبتلا کر دیا ہے۔

5 اگست سے قبل کشمیر واحد ریاست تھی جس کی سرکاری زبان اردو تھی، دفعہ 370 کے خاتمہ کے بعد اب اردو کے وجود پر بھی سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ جموں و کشمیر میں بننے والی نئی اسمبلی اس کا فیصلہ کرے گی کہ اس کو اردو زبان کو فوقیت دینا ہے جو اس کی صدیوں سے سرکاری زبان تھی یا پھر قومی زبان ہندی اور کاروباری زبان انگریزی کو ریاست میں کام کاج کی زبان بنانا ہے۔ اس سلسلہ میں 4 ستمبر کو انڈین ایکسپریس نے ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ جس میں گورنر ستیہ پال ملک کے مشیر فاروق خان نے کہا کہ اب سب کچھ نیا ہوگا، سارا کام نئے سیٹ کے ساتھ ہوگا، ریاست اس طرح ہوگی جیسے کسی بچے نے جنم لیا ہو۔ انہوں نے کہا کہ نئی سرکاری زبان کا انتخاب بھی نئی اسمبلی ہی کرے گی۔ ان کے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ صرف کشمیری ہی نہیں اردو بھی اس دفعہ 370 کے خاتمہ کا شکار بنی ہے۔ جب کہ تاریخ کے مطابق 1889 میں ڈوگرہ حکمرانوں

نے اردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنایا تھا۔اس سے قبل تین صدیوں سے فارسی وہاں کی سرکاری زبان رہی تھی۔ روینیو، آراضی اور محکمہ پولیس کے ریکارڈ (لوور جوڈیشیری اور ایف آئی آر) کی زبان اردو ہی ہے۔ کشمیر میں کشمیری، ڈوگری، گوجری، لداخی، پہاڑی، بالٹی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔یہی زبان وہاں کی تہذیب وثقافت کی عکاس ہے۔محبان اردو کو اس سلسلے میں ابھی سرگرم ہوجانا چاہیئے ۔نئ اسمبلی سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ خود سے اردو کو وہاں کی سرکاری زبان قرار دے گی بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ قومی زبان ہندی کو اس کی جگہ دی جائے ۔اس لئے محبان اردو کو ابھی سے سرگرم ہوجانا چاہیئے ورنہ یہ واحد ریاست بھی اردو سے محروم ہوجائے گی۔

# ملک میں نسل پرستی اور نسلی امتیاز

جمہوریت میں عوام کی حکومت عوام کے لئے ہوتی ہے اور یہی نعرہ بھارتیہ جنتا پارٹی کا بھی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ خوشنما نعرہ 'سب کا ساتھ سب کا وکاس اور سب کا اعتماد' ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کے رہنماؤں کے ساتھ ہی گلی کوچوں کے لیڈروں نے ایسے نعروں کی بنیاد پر نہ صرف اپنی پیٹھ تھپتھپائی بلکہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جب یہ دعویٰ نہ کیا ہو کہ وزیر اعظم نریندر مودی نے بیرون ممالک ہندستان کو وہ ''مان سمان'' دلایا ہے جواب تک نہیں ملا تھا اور ان ہی کی بنا پر عالمی سطح پر ملک کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح کی باتیں سن کر خوشی ہوتی ہے لیکن اس وقت جب سچ ہوں، کبھی کبھی گمان بھی ہونے لگتا ہے کہ واقعی سب سچ کہہ رہے ہیں لیکن پھر کچھ نہ کچھ ایسی چشم کشا باتیں سامنے آجاتی ہیں جو اس دعویٰ کی حقیقت بیان کر دیتی ہیں۔

عالمی سطح پر اس وقت ملک کی کیا پوزیشن ہے اس کا اندازہ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے جو حال ہی میں داخل کی گئی ہے۔ اقوام متحدہ نے 2017 میں ایک ریزیولوشن پاس کیا تھا، جس کے مطابق سبھی ممبر ممالک میں نسل پرستی اور نسلی امتیاز سے متعلق ایک رپورٹ تیار کرائی جانی تھی۔ ہندستان سے متعلق یہ رپورٹ ٹنڈائی ریشوم نے تیار کی ہے جو یو این او میں داخل بھی کر دی گئی ہے۔ ریشوم کی یہ رپورٹ ہندستانی حکومت اور عوام دونوں کے لئے حوصلہ افزا نہیں ہے بلکہ یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ اس وقت ملک میں حقوق انسانی کی کیا صورت حال ہے، کس طرح اسی ملک کے باشندے دوئم درجے کے شہری بنا دیئے گئے ہیں، اہم بات یہ ہے کہ اس رپورٹ میں صرف مسلموں کے مسائل کو نہیں اٹھایا گیا ہے بلکہ دلتوں اور قبائیلیوں سے متعلق بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اس رپورٹ نے جہاں ایک طرف 'سب کا ساتھ سب کا وکاس اور سب کا اعتماد' کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے وہیں اس نے حکمراں جماعت کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ چونکہ یہ رپورٹ ایک عالمی ادارے نے خود تیار کرائی ہے اس لئے اس پر اتنی آسانی سے نہ تو سوال اٹھائے جاسکتے ہیں اور نہ ہی کسی پر الزام عائد کیا جاسکتا ہے ہاں مجرمانہ خاموشی ضرور اختیار کی جا

سکتی ہے۔قومی میڈیا سے بھی رپورٹ غائب ہی رہی، ہندی اخبارات اور چینل جو خود ساختہ حب الوطنی میں ہمیشہ شرابور رہتے ہیں، جو وزیراعظم کے دوروں اور اوران کو ملنے والے انعامات کی رپورٹنگ میں حد سے گذر جاتے ہیں انہوں نے بھی ایک لائن یا ایک اسکرول کی خبر نہیں دکھائی ، کیونکہ یہ خبر حکومت اور بھاجپا کے لئے خوش کن نہیں ہے اس لئے اس کو مین اسٹریم کی میڈیا سے غائب کر دیا گیا، البتہ انگریزی کے اخبارات اور ویب سائٹوں نے ضرور اس خبر کو جگہ دی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ جمہوریت کا یہ چوتھا ستون ابھی منہدم نہیں ہوا ہے۔

رپورٹ میں صاف طور پر دلتوں اور مسلمانوں سے متعلق بی جے پی لیڈران کے بیانات کو مرکز بنا کر کہا گیا ہے کہ ہندستان میں نسلی امتیاز کو فروغ دیا جا رہا ہے، رپورٹ کے مطابق جب سے ہندو نیشنلسٹ بھاجپا اقتدار میں آئی ہے دلتوں، مسلموں، عیسائیوں اور قبائلیوں کا استحصال بڑھ گیا ہے جو بی جے پی لیڈران کے بیانات کا نتیجہ ہے، اس تناظر میں گری راج سنگھ، یوگی آدتیہ ناتھ، امیت شاہ اور خود وزیراعظم کے بیانات دیکھے جاسکتے ہیں ۔اسی طرح سے رپورٹ میں آسام میں این آرسی پر بھی خدشات کا اظہار کیا گیا ہے، اہم بات یہ ہے کہ جن خدشات کا اظہار مسلمان کر رہے تھے اس رپورٹ نے اس کو یقین کی حد تک پہنچا دیا ہے۔این آرسی کے مطابق 19 لاکھ افراد اپنی شہریت ثابت نہیں کر سکے ہیں جن میں تقریبا ساتھ لاکھ مسلم ہیں، اس سلسلے میں مرکزی وزیر داخلہ امیت شاہ اور آسام کے وزیر خزانہ ہیمنت بسوا کے بیانات خالص مذہبی بنیاد پر تھے جن سے خدشات بڑھ گئے ہیں ۔امیت شاہ نے ہندوؤں کو پریشان نہ ہونے کی یقین دہانی کرانے کے ساتھ ہی مسلمانوں کو دھمکی بھی دی کہ ان کو یہاں نہیں رہنے دیا جائے گا جبکہ وزیر خزانہ نے دوبارہ این آرسی کے لئے سپریم کورٹ سے رجوع ہونے کی بات کہی کیونکہ ان کو لگتا ہے کہ کثیر تعداد میں ہندو اپنی شہریت ثابت نہیں کر سکے ہیں جن کو دوبارہ موقع دیا جانا چاہئے،ان دونوں بیانات کے بعد خدشہ بڑھ گیا تھا کہ دوبارہ ہونے والی این آرسی میں کثیر تعداد میں مسلمانوں کے دستاویز مسترد کئے جائیں گے اوران کو غیر ملکی در اندازوں میں شمار کیا جائے گا۔ریشوم کی یہ رپورٹ اسی خدشے کو یقین میں بدلتی ہے وہ

لکھتی ہیں: اس سے یہ خدشات پیدا ہو گئے ہیں کہ مقامی حکام جنہیں مسلمانوں اور بنگالیوں کا دشمن تصور کیا جاتا ہے وہ دوبارہ ہونے والی این آرسی میں ان کے دستاویزات کو مسترد کر کے ان کو ہندستانی شہریت سے محروم کر دیں گے"۔ اقوام متحدہ کے یہ خدشات یوں ہی نہیں ہیں اس کے سامنے متعصب لیڈران اور اور افسران کے رویے ہیں جو ہر گام پر مسلمانوں، دلتوں اور قبائیلوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں جھارکھنڈ میں ہجومی تشدد کا شکار تبریز انصاری کے معاملے میں افسران نے ہی کھیل کر دیا تھا۔

اقوام متحدہ کی اس رپورٹ میں کشمیر معاملے کا ذکر نہیں ہے حالانکہ غیر بدیہی طور پر اس کا تعلق بھی نسلی اور مذہبی ہی ہے۔ بھاجپا خود ساختہ حب الوطنی کا ڈھنڈورا ضرور پیٹتی ہے لیکن اس کے مرکز میں حب الوطنی سے زیادہ ہندوتوا ہوتا ہے اور جہاں ہندوتووا ہوتا ہے وہاں نسلی امتیاز یقینی ہے۔ جب کشمیر سے دفعہ 370 اور 35 اے ہٹائی گئی تو بھاجپا کے سینئر لیڈر اور ہریانہ کے وزیر اعلیٰ نے کشمیری لڑکیوں سے متعلق نہایت نازیبا بیان دیا تھا، وہ بھی اس میں شامل ہونا چاہئے تھا کیونکہ اس کا تعلق بھی نسلی و مذہبی امتیاز سے ہی ہے، اسی طرح کشمیر میں اٹھارہ برس سے کم بچوں کو گرفتار کر کے رکھا گیا ہے۔ حقوق اطفال کارکن اناکشی گانگولی نے سپریم کورٹ میں رٹ داخل کر کے ان بچوں سے متعلق معلومات طلب کی تھیں کیونکہ ہائی کورٹ اس معاملے کو دیکھ رہی ہے۔ ابھی تک ان بچوں سے متعلق کوئی معلومات نہیں مل سکی ہے، جوینائل بورڈ ہونے کے باوجود ان بچوں کو قید میں رکھنا کسی بھی طرح سے درست نہیں ہے۔ اسرائیل واحد ملک ہے جو بچوں کا کورٹ مارشل کرتا ہے ابھی ہندستان کے بارے میں اس طرح کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی ہے لیکن بچوں کو اس طرح گرفتار کرنا اور ان سے متعلق جوینائل بورڈ کو بھی واقف نہ کرانا شک وشبہ ضرور پیدا کرتا ہے۔ یوں بھی اسرائیل اور ہندستان کے مابین جس سطح کی دوستی ہے اس سے کوئی بعید نہیں ہے کہ اسرائیل نے یہ تکنیک بتائی ہو کہ نفسیاتی طور پر زیر کرنے کے لئے بچوں کو ٹارگٹ کیا جائے جیسا کہ وہ

فلسطینی بچوں کے ساتھ خود کرتا ہے۔یہ معاملہ بھی حقوق انسانی اور نسلی امتیاز سے ہی جڑ جاتا ہے۔اگر اقوام متحدہ کی رپورٹ کشمیر کا بھی احاطہ کرتی تو یقینا بھاجپا سرکار کے کے لئے مزید شرمندگی کا باعث ہوتی۔

وزیر اعظم نریندر مودی اور وزیر داخلہ امیت شاہ جس طرح کی سیاست کر رہے ہیں اس سے یہ نہیں لگتا ہے کہ حکومت یا بی جے پی لیڈران کے رویے میں اس رپورٹ کے بعد بھی کوئی تبدیلی آئے گی، کیونکہ یہ دونوں لیڈر اس وقت ہندستان کے بے تاج بادشاہ ہیں، جمہوریت میں بھی بادشاہیت کر رہے ہیں، ایسے میں ان کے لئے اقوام متحدہ کی یہ رپورٹ کاغذ کے چند پرزوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہے لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس طرح کی رپورٹ سے کسی بھی ملک میں حقوق انسانی کی ریٹنگ ہوتی ہے جس سے ملک کا گراف بڑھتا یا گھٹتا ہے جس کے نتیجہ میں ملک کی شبیہ دنیا میں بنتی یا بگڑتی ہے۔

حقائق تو سب جانتے تھے لیکن اقوام متحدہ جیسے پلیٹ فارم کی رپورٹ آجانے کے بعد اب حکمراں پارٹی کو اپنا اور اپنے نعرے کا جائزہ لینا چاہئے۔اس رپورٹ سے ان کو اس بات کا بھی اندازہ ہو جانا چاہئے کہ انھوں نے ملک کے عزت و وقار میں اضافہ کے بجائے اس کی قدر و قیمت کو گرایا ہے، ریشوم کی یہ رپورٹ ایک دستاویز ہے جو اقوام متحدہ میں اپنے تمام حقائق کے ساتھ موجود رہے گی اور ہندستان کو شرمسار کرتی رہے گی۔جب تک حکمراں پارٹی اپنے رویے میں تبدیلی نہیں لاتی ہے اور زبان کے بجائے عمل سے ہر طرح کے امتیاز کو ختم نہیں کرتی ہے اس وقت تک ملک کی شبیہ عالمی سطح پر نکھر کر نہیں آسکتی ہے، اگر حقیقت میں ان سب کو ملک سے محبت ہے تو ملک کی اقلیتوں، دلتوں اور قبائلیوں کے ساتھ امتیازی سلوک ختم کر کے ان کو بھی ایک باعزت شہری کا مقام دینا ہوگا جس سے ملک کی ترقی کو پنکھ لگ جائیں گے۔

# آر ایس ایس کا ہندو- مسلم اتحاد کا ایک نیا بیانیہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستان گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے، جسے مغلوں نے بنا سنوار کر سونے کی چڑیا بنا دیا تھا، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہندستان کے ہندو اور مسلم صدیوں سے پیار محبت اور میل میلاپ سے رہتے آئے ہیں اور آج بھی وہ اسی طرح سے رہنا چاہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو ان دونوں کے مابین خلیج پیدا کر کے مستقل ان میں دوریاں پیدا کر رہے ہیں؟ اس کا جواب تو بہت آسان ہے لیکن رائٹ ونگ کے تاریخ دانوں اور مفکرین نے نہایت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ آسان جواب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نظریہ "ہندو، ہندی، ہندستان" ہے۔ جو بہر صورت ہندستان کو ہندواستھان میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں، اسی لئے وہ وقتاً فوقتاً اس بات کا بھی اعلان کرتے رہے ہیں کہ سیکولر آئین کو تبدیل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ پیچیدہ جواب یہ ہے کہ مغل غیر ملکی تھے جنہوں نے ہندستان پر بزور تلوار راج کیا اور مندر منہدم کر کے مساجد تعمیر کیں، اب ان سے بدلا لیا جانا چاہئے کیونکہ ہندستان کے جتنے بھی مسلمان ہیں سب ان ہی کی مجازی اولاد ہیں جنہوں نے ہم پر ظلم کیا تھا۔ اس طرح یہ لوگ ماضی میں جا کر تاریخ سازی کرتے ہیں اور پھر اس کے ذریعہ ہندستان کے پر امن مسلمانوں کو ویلن کے طور پر سماج میں پیش کر کے ان ہی پر تفریق کا الزام لگا دیتے ہیں کہ یہ لوگ سکون سے رہنا نہیں چاہتے، یہ متشدد ہوتے ہیں، قتل وخون اور غارت گری ان کا شیوہ ہے۔ اس سے ان لوگوں کو آسانی یہ ہوتی ہے کہ اپنے اعتبار سے مائنڈ سیٹ کر کے اکثریت کا ووٹ حاصل کر کے اقتدار کے مزے لیتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں داراشکوہ کے یوم وفات پر مسلمانوں سے فکری دشمنی رکھنے والی تنظیم آر ایس ایس نے ایک سیمپوزیم کا اہتمام کیا تھا جس میں آر ایس ایس کے سینئر لیڈر کرشن گوپال نے سوال کیا تھا کہ چھ سو برس ہندستان پر حکومت کرنے والے مسلم اس ملک میں کیوں خوفزدہ ہیں؟ جب کہ کم تعداد والی کمیونٹی یہودی، جین، پارسی اور بدھسٹوں میں کوئی خوف نہیں ہے۔ بادی النظر میں سوال تو بہت مناسب ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس خوف اور ڈر کا سبب وہ لوگ پوچھتے ہیں جو خود

اس کے سبب ہیں اور مسلسل خوف و ہراس پیدا کرنا چاہتے ہیں۔اس خوف کا سبب وزیر داخلہ امیت شاہ اور بھاجپا کی میٹنگ آر ایس ایس چیف موہن بھاگوت کے وہ بیانات ہیں جن میں وہ اعلان کرتے ہیں کہ آسام کے ان ہندوؤں، جینیوں، عیسائیوں اور بدھسٹوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو اپنی شہریت ثابت نہیں کر سکے ہیں، ہندوؤں کو ملک بدر نہیں کیا جائے گا۔اس کا سیدھا مطلب ہے کہ این آر سی ملک کی محبت میں نہیں مسلمانوں کی دشمنی میں کرائی گئی اور آئندہ بھی اس طرح کی این آر سی پورے ملک میں نافذ کی جائے گی۔مسلمانوں میں خوف کی وجہ وہ رائٹ ونگ کے تاریخ داں ہیں جو تاریخ نویسی کے بجائے تاریخ سازی میں یقین رکھتے ہیں۔ملک میں تاریخ نویسی کے تین اسکول آف تھاٹس ہیں۔رائٹ ونگ، لیفٹسٹ اور سینٹرل ونگ۔یہ تینوں اپنے تناظر میں تاریخ نویسی کرتے ہیں، جس میں ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو سب سے زیادہ نقصان رائٹ ونگ نے پہنچایا ہے، کیونکہ یہ لوگ تاریخ نویسی سے زیادہ تاریخ سازی میں یقین رکھتے ہیں۔ان تاریخ دانوں کی سمجھ میں اتنی چھوٹی بات نہیں آتی ہے کہ بادشاہت میں کوئی کسی کا میت نہیں ہوتا ہے، کتنے ایسے راجہ اور مہاراجہ اور بادشاہ ہیں جنہوں نے بادشاہت کے لئے اپنے ہی خاندان کو تہہ تیغ کر دیا، یہ تو حصول بادشاہت کا طریقہ ہے۔لیکن رائٹ ونگ کے تاریخ نویسوں نے داراشکوہ کو ایک ایسے شخص کے طور پر پیش کیا جس کو صرف اس لئے قتل کیا گیا کیونکہ اس نے اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو بالکل غلط ہے۔

اس وقت آر ایس ایس اسی مغل خاندان کے ایک شاہزادے کو ہیرو بنا کر پیش کر رہی ہے جس خاندان کو ڈاکو کہتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی ہے۔پانچ برس کی حکومت کے بعد داراشکوہ کے یوم وفات پر سیپوزیم کا اس کو خیال آجاتا ہے، ایسے میں اس کے اس عمل پر غور و فکر تو لازمی ہے۔سب سے پہلا سوال ہے کہ آر ایس ایس کو اس مغل شاہزادے سے محبت کیوں ہوگئی؟ آر ایس ایس کو اس مغل شاہزادے سے محبت یوں ہی نہیں ہوئی ہے، گنگا جمنی تہذیب کے بانی اور علمبردار اکبر اعظم کو درکنار کر کے آر ایس ایس نے داراشکوہ کو یوں ہی رول ماڈل بنا کر نہیں پیش کیا

ہے بلکہ اس کے پس پشت ایک نظریہ اور فکر ہے۔آج کے دور میں جنگیں توپوں اور ٹینکوں سے بہت بعد میں لڑی جاتی ہیں ،سب سے پہلے فکری سطح پر یہ جنگ ہوتی ہے،آر ایس ایس مسلمانوں سے فکری سطح پر جنگ کے لئے داراشکوہ کا استعمال کر رہی ہے اور اس کو نام گنگا جمنی تہذیب کا دے رہی ہے۔

چونکہ گذشتہ پانچ برسوں میں آر ایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیموں نے جناح،دو قومی نظریہ،وہابی ازم اور دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں کو خوب ٹارچر کیا،آج بھی کسی مسلم کی گرفتاری کے وقت آر ایس ایس زدہ میڈیا سب سے پہلے جس لفظ کا استعمال کرتی ہے وہ دہشت گرد ہے۔گھر واپسی کی مہم بھی سب کو یاد ہوگی۔آر ایس ایس کے یہ وہ اقدام ہیں جن کے ذریعہ اس نے مسلمانوں کو احساس کمتری کا شکار کیا ہے،اس عمل کے ذریعہ اس نے مسلم نوجوانوں کے اعتماد کو متزلزل کیا۔اب گنگا جمنی تہذیب کے نام پر داراشکوہ کو پروجیکٹ کر کے اس نے فکری یلغار کی جانب ایک اور قدم بڑھا دیا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ آر ایس ایس داراشکوہ کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کی خواہاں ہے،اگر ایسا ہوتا تو اس کی نظر اکبر اعظم پر پڑتی جو حقیقت میں اس تہذیب کا بانی ہے اور بادشاہت کرتے ہوئے عملی طور پر اس نے اس کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں،جبکہ داراشکوہ اس کے مقابلے میں کہیں نہیں ٹکتے کیوں اس کو حکومت کا موقع ہی کہاں ملا؟ایسے میں یہ کہنا کہ اگر داراشکوہ بادشاہ ہوتا تو ایسا ہو جاتا ویسا ہو جاتا بے معنی ہے،اکبر نے جو کیا وہ سب کے سامنے موجود ہے اس لئے موجود کو چھوڑ کر موہوم کی طرف جانا ہی آر ایس ایس کی نیت کو شک کے دائرہ میں پہنچا دیتا ہے۔

چونکہ آر ایس ایس ہندو-مسلم اتحاد کا ایک نیا بیانیہ قائم کرنا چاہتی ہے،جس میں وہ اچھا مسلمان اور برا مسلمان کا سرٹیفکیٹ ابھی سے دینے لگی ہے۔آر ایس ایس کی نظر میں وہ اچھا مسلمان نہیں ہے جو توحید اور مسلم کلچر کا قائل ہو،اس لئے اس کو ایسے مسلم چہرے کی ضرورت تھی جو ہندوازم میں لین ہو اور گیروا ستر دھاران کرتا ہو،ایسے میں داراشکوہ اس کو سب سے بہتر بہتر

محسوس ہوا۔ وہ چاہتی ہے کہ ہندستان کے مسلمان اپنی طرز معاشرت ترک کر کے ہندو میتھالوجی کے مطابق زندگی گذارنے لگیں اوراس بات کو کئی بار آر ایس ایس کے لیڈر دہرا چکے ہیں۔ وہ بزور طاقت تو کسی کو مجبور نہیں کر سکتے ہیں اس لئے انہوں نے گنگا جمنی تہذیب کے نام پر فکری یلغار کی کوشش شروع کر دی ہے۔ دیکھنے میں تو اس میں کچھ برا نہیں محسوس ہوتا کہ داراشکوہ کی فکر کو آگے بڑھایا جائے، یقیناوہ بہت بڑا عالم، مفکراور دانشور تھا، اس نے علمی اور فکری سطح پر واقعی ایسے کام کئے کہ آج نہیں بہت پہلے اس پر کام ہونا چاہئے تھا،لیکن اس وقت اس کا صرف علمی محاکمہ ہوتا لیکن اب ایک خاص تناظر میں اس کی علمی کاوشوں کا جائزہ لیا جائے گا اور فکری طور پر یہ راسخ کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اچھا مسلمان وہی ہے جو ہندو میتھالوجی میں یقین رکھتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ آر ایس ایس داراشکوہ اور اورنگ زیب کے ضمن میں ہندستان کے مسلمانوں کو دو صفوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہے، اس کے مطابق جو ہندو میتھالوجی میں یقین نہیں کرے گا، گیروا ستر دھارن نہیں کرے گا اس کو داراشکوہ کی صف کے برعکس اورنگ زیب کی صف میں کھڑا کر دیا جائے گا۔جس کے لئے اس کو داراشکوہ کی شکل میں ایک مہرہ مل چکا ہے۔لیکن ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ سازشیں بہت دنوں تک کامیاب نہیں ہوتی ہیں اور چاندی کے ورق میں زہرلپیٹ دینے سے اس کی خاصیت نہیں بدل جاتی ہے، ہندو مسلم اتحاد کے نام پر قائم کئے جانے والے اس نئے بیانیے سے مٹھی بھر جماعت کا تو وقتی فائدہ ہوسکتا ہے لیکن ملک کا اس سے نقصان ہی ہوگا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے داراشکوہ چیئر کے قیام کا منصوبہ یو جی سی کو دیا ہے، اگر اس چیئر کا قیام عمل میں آجاتا ہے تو داراشکوہ کی حیات وخدمات اور اس کی فکری جہات پر کام کیا جائے گا، اگر یہ کام معروضی انداز میں ہوتا ہے تو یقینا لائق ستائش ہے لیکن اگر کسی خاص تناظر میں ہوتا ہے تو اس کے دوررس منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

# مذہبی اور نسلی عصبیت پر مبنی سیاسی فکر

کسی بھی ملک کا مستقبل وہاں کی سیاست اور اس کی فکری بنیادوں میں پنہا ہوتا ہے۔ آزادی کے وقت اسی مستقبل اور مقدر کو خوشنما بنانے کے لئے جمہوری طرز حکومت کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن اس کے بعد سیاست کی جو بنیاد پڑی اس میں ایک نہیں کئی ٹیڑھی اینٹیں لگ گئیں۔ جس کا خمیازہ ملک آج تک بھگت رہا ہے۔ موجودہ دور میں حاوی سیاسی فکر مذہبی اور نسلی عصبیت پر مبنی ہے، اس فکر کے متوازی فکر میں وہ جان نہیں ہے جو حاوی فکر کا مقابلہ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ ملک میں جمہوری طرز حکومت کے باوجود اس پر جمہوریت کے عناصر کا غلبہ نہیں ہے۔ آئین میں کسی کو امتیازی حیثیت نہیں دی گئی ہے، لسانی، مذہبی اور علاقائی ہر طرح کی برتری کو آئین نے مسترد کرتے ہوئے سبھی شہریوں کو یکساں حقوق کی ضمانت دی ہے۔ وقتاً فوقتاً اس یکساں حق پر شب خون بھی مارے جاتے رہے ہیں۔ ایک بار پھر اسی کی نہ صرف تیاری ہے۔ ملک کی سب سے منظم اور طاقتور تنظیم دعویٰ تو کرتی ہے کہ وہ سیاسی نہیں ہےلیکن اگر اس کے درون میں دیکھا جائے تو خالص سیاسی ہے، جس کے مقاصد اور فکری بنیادیں سیاسی ہیں۔ اس کے سربراہ کھلے طور پر اعلان کر رہے ہیں کہ بھارت 'ہندو راشٹر' ہے۔ این آر سی میں اپنی شہریت ثابت نہ کر پانے والے ہندوؤں، جینیوں، بدھشٹو اور عیسائیوں کو تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے ان کو ملک بدر نہیں کیا جائے گا۔ یہ ایک غیر آئینی شخص کا بیان ہے، جس کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہئے لیکن اس ملک میں اسی بیان کی سب سے زیادہ اہمیت ہے کیونکہ طاقت اور حکومت کی کنجی اسی کے پاس ہے۔ اس تنظیم نے Deep State یعنی ''ریاست در ریاست'' کے ذریعہ وہ طاقت حاصل کر لی ہے جسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے وزیر داخلہ اس غیر آئینی شخص کے اعلان پر مہر تصدیق لگا رہے ہیں اور وہ خود اسی بات کا اعلان کر رہے ہیں۔

ایسے میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں مثلاً کیا مذہبی تفریق پر مبنی اس طرح کا بیان آئین مخالف نہیں ہے؟ اگر آئین مخالف ہے تو آئین کے رکھ والے کیا کر رہے ہیں؟ اور اگر آئین کے رکھ

والے ہی اس کی دھجیاں اڑائیں تو پھر ان سے جواب کون طلب کرے گا؟ ملک کے سماجی تانے بانے کو کمزور کرنے والے اور خوف و ہراس پیدا کرنے والے کیا مجرم قرار نہیں دیئے جانے چاہئے؟ کیا یہ لوگ واقعی دیش بھکت ہیں؟ان کی نظروں میں دیش بھکتی کی تعریف کیا ہے؟اس طرح کے بہت سے سوالات ہیں جو ذہن میں کوندتے ہیں اور بغیر جواب پائے ختم ہوجاتے ہیں ،جواب نہ ملنے کی بھی ایک بڑی وجہ ہے وہ یہ کہ پورے ملک کا ایک خاص انداز میں مائنڈ سیٹ کیا گیا ہے جس میں سب سے اہم کردار میڈیا نے ادا کیا ہے۔موجودہ حکومت نے دیش بھکتی کی نئی تعریف گڑھی ہے جس کی بنیادی فکر فسطائیت اور ہندوازم پر ہے۔وزیر داخلہ این آرسی کو دیش بھکتی سے جوڑتے ہیں مگر جب وہ مذہبی بنیاد پر تفریق کا اعلان کرتے ہیں تو اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔

اگر این آرسی لائی گئی ہے تو حب الوطنی کا تقاضہ یہ ہے کہ جو بھی اپنی شہریت ثابت نہیں کرسکا ہے اس کو ملک بدر کردیا جاجانا چاہئے اس میں کسی طرح کی تفریق اور تعصب نہیں ہونا چاہئے۔ہندستان کے جتنے بھی شہری ہیں خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ایک قوم ہیں ،اور جتنے بھی باہری ہیں وہ خواہ کسی بھی ملک اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں باہری ہیں ۔اگر حکومت اس اصول پر کاربند رہے تو سب اس کے ساتھ ہیں لیکن حکومت اس کے بجائے گھسپیٹھیا( درانداز )اور شرنارتھی( مہاجر ) کی اصطلاح کا استعمال کر کے تفریق کرنے لگی ہے۔جو مسلمان ہیں وہ حکومت کی نظر میں درانداز اور جو ہندو،جین، پارسی اور عیسائی ہیں وہ مہاجر ہیں۔یہاں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی بنیاد پر کوئی درانداز اور مہاجر کیسے ہوسکتا ہے؟اصطلاح میں تو دونوں درانداز اور گھسپیٹھئے ہیں اس لئے ان کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہئے۔وزیر داخلہ کا دراندازوں کے مابین مذہبی بنیادوں پر مہاجرت کا خط امتیاز صرف ان کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ملک کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین ہے جس کا نقصان پورے ملک کو اٹھانا پڑے گا۔

دوسری طرف ہمارے ملی قائدین ہیں جو اس طرح کے بیانات کے باوجود اہل اقتدار سے نہ صرف بھلائی کی امید رکھتے ہیں بلکہ وہ بطور آلہ کار استعمال بھی ہوتے ہیں۔ہر شخص جانتا ہے کہ

بھاجپا کے پردے میں اقتدار تک پہنچنے والی تنظیم کی فکری بنیادیں کن تعلیمات پر مبنی ہے، اس تنظیم کی آبیاری کرنے والوں کی کیا فکر تھی ۔اس کے باوجود وہ ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں۔مکالمے سے راہیں کھلتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن جب سب اس ملک کے برابر کے شہری ہیں تو مکالمہ بھی برابری کی سطح پر ہونا چاہئے ۔ایک طرف اہل اقتدار اور حکومت چلانے والے لوگ کہتے ہیں کہ کسی کوخوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کسی کو پریشان نہیں کیا جائے گا بلکہ سب کے ساتھ یکساں رویہ اختیار کیا جائے گا۔دوسری طرف یہی لوگ مذہبی بنیادوں پر تفریق کا نہ صرف اعلان کرتے ہیں بلکہ مسلمانوں کو چھوڑ کر سب کے لئے سیٹیزن شپ بل لانے کی بات کرتے ہیں۔دیش بھکتی کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی دوسرے ملک کے کسی بھی شہری کو یہاں رہنے کی اجازت نہ دی جائے خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو اس سے ملک میں خوف وہراس کا ماحول پیدا ہوگا اور امتیازی سلوک کو راہ ملے گی جو آئین کے منافی ہے، جس سے ملک کی سالمیت کو نہ صرف خطرہ لاحق ہوگا بلکہ اس کی معاشی رفتار پر بھی منفی اثرات پڑیں گے۔اس لئے ارباب حکومت کو این آر سی میں اپنی شہریت نہ ثابت کر پانے والوں کے لئے سٹیزن شپ بل کے بارے میں ہر طرح سے سبھی پہلوؤں پر غور کر لینا چاہئے اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا چاہئے کیونکہ اس بل کے اثرات بہت وسیع ہوں گے۔

# عدالتی نظام میں فکری دخل اندازی

جمہوریت کی یہ سب سے بڑی خوبصورتی ہے کہ کوئی بھی 'راجہ اور رنک' نہیں ہوتا بلکہ سب یکساں حقوق کے حامل ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرے اور انسان کی فلاح و بہبود میں حتی المقدور کوشش کرے۔ اظہار خیال کی آزادی مذہبی بھی ہے اور انسانی بھی، متمدن دنیا کا کوئی ایسا خطہ نہیں ہے جہاں اس پر قدغن ہو، ہندستان کے عوام کو بھی آئین کی دفعہ 19 کے تحت اس کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ حالانکہ اس آزادی پر شب خون بھی مارے جاتے رہے ہیں۔ ایمرجنسی اس کی واضح مثال ہے جب آئین تک معطل کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ عمل ایک سیاست داں کی طرف سے ہوا تھا جس کا خمیازہ کانگریس آج تک بھگت رہی ہے اور جب بھی ایمرجنسی کی بات آتی ہے تو اس کا گلا سوکھ جاتا ہے اور ہاتھ میں رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اسی طرح کا عمل ایک آئینی ادارے اور جمہوریت کے اہم ستون عدلیہ کی طرف سے ہو تو اس کو کیا کہا جائے گا؟ یہ ایک بڑا سوال ہے۔

جس طرح سے مظفر پور کی ایک عدالت نے ملک کے دانشوروں کے ذریعہ وزیر اعظم لکھے گئے خط پر ان کے خلاف پولیس کو حکم دیا کہ مقدمہ درج کیا جائے اور پولیس نے درج بھی کیا ہے اس نے کئی طرح کے سوال کھڑے کر دیئے ہیں۔ یہ اکیسویں صدی کا ہندستان ہے، جس میں معروضیت ہی سب سے اہم ہے، اسی پیمانے پر اب ہر شے دیکھی اور پرکھی جاتی ہے، دنیا میں وہی قومیں ترقی بھی کرتی ہیں جو معروضیت اختیار کرتی ہیں، ایسے میں عدلیہ غیر ممسوس یعنی 'انچھیل' نہیں رہ سکتی ہے، اس کا جائزہ بھی معروضیت کے ساتھ لیا جانا چاہئے کیونکہ جج کی کرسیوں پر بھی بیٹھنے والے بھی انسان ہی ہیں وہ کسی دوسری دنیا سے نہیں آئے ہیں، ایسے میں ان میں بھی بہت سی انسانی آلائشیں ہونے کا امکان رہتا ہے۔

بادی النظر میں مظفر پور جج کا فیصلہ مرکز کی بی جے پی حکومت کی طرفداری میں ہے کیونکہ جن دانشوروں نے وزیر اعظم کو دلتوں اور مسلمانوں کی ماب لنچنگ کے خلاف خط لکھا تھا، انہوں نے

کھلا خط لکھا تھا اور اس میں صرف حالات کی درستی کا مطالبہ ہی کیا گیا تھا۔ ملک کا ہر شہری وزیر اعظم تک نہ پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی ان سے ملاقات کر سکتا ہے ایسے میں خط سے زیادہ بہتر اور کوئی راستہ نہیں ہوسکتا جسے انہوں نے استعمال کیا مگر عدالت نے بھی اس کو حکومت اور وزیر اعظم کی شبیہ سے وابستہ کرتے ہوئے ان کے خلاف مقدمہ درج کرنے کا حکم دے دیا جس پر معروضیت پسند شہریوں کا برآفروختہ ہونا یقینی ہے۔ اگر عدالتی تاریخ کا معروضیت کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو کئی ایسے مواقع آتے ہیں جب خاص فکری نہج پر ججوں نے فیصلے کئے یا پھر ان کی تقرری ہی اس لئے کی گئی تاکہ اپنی فکر کے مطابق ان سے کام لیا جاسکے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ایمرجنسی ہے۔ اندرا گاندھی نے اے این رے کی تقرری کی تھی جن کی صدرات والی پانچ رکنی بنچ نے 1975 میں ہیبیس کارپس کیس معاملے میں ایمرجنسی کے دوران نظربندی کے خلاف عوام کے اپیل کرنے کے حق کو مسترد کر دیا۔ جس کے منفی اثرات عدلیہ پر مرتب ہوئے اور اعتماد بحال کرنے میں اس کو برسوں لگ گئے۔

آر ایس ایس خاص ہندتوا فکر کی حامل تنظیم ہے جس کی بہت سی ونگ ہیں، اس نے یہ ونگ اسی لئے بنا رکھی ہے تاکہ ہر شعبہ حیات کے لوگوں کو اس سے جوڑا جائے اور اپنی فکر کو ان میں پھیلا یا جائے، اس کی ایک ونگ وکلا کی ہے، جو عدالتوں میں نہ صرف پیروی کرتی ہے بلکہ خاص تناظر میں اس پورے نظام میں وہ دخیل بھی ہے، اس نے ہمیشہ سے اس بات کی کوشش کی کہ ہندوتوا فکر کے حامل افراد عدلیہ میں داخل ہوں جس کے لئے اس کی طلبا یونٹ 'اے بی وی پی' کی 1998 کی کانفرنس میں مزعومہ 'گروسبھا' کی تشکیل کی تجویز پیش کی گئی تھی، جس کا کام یہ ہوتا کہ سپریم کورٹ کے ججوں کی تقرری کرے، اس سلسلے میں موجودہ بی جے پی ممبر پارلیمنٹ سبرامنیم سوامی نے 'آر ایس ایس گیم پلان' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے عزائم کس طرح تھے۔

2001 میں پنجاب وہریانہ ہائی کورٹ میں اے کے گویل کی تقرری ہوئی، جن کے بارے

میں خفیہ ایجنسی کی جانچ میں دو برس بعد یعنی 2003 میں پتہ چلا کہ وہ آر ایس ایس کی وکلا ونگ 'اکھل بھارتیہ ادھوکتا پریشد' کے جنرل سکریٹری تھے۔ اہم بات یہ کہ اس وقت صدر جمہوریہ کے آر نارائنن نے ایک بار فائل واپس کرتے ہوئے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا، جس کے بعد اس وقت کے وزیر قانون ارون جیٹلی نے اس رپورٹ کو متھ قرار دے کر وزیر اعظم اٹل بہاری کے دستخط کے ساتھ فائل دوبارہ صدر جمہوریہ کو بھیج دی، انہوں نے دستخط تو کر دیا لیکن ساتھ ہی ایک نوٹ بھی لگا یا تھا جس کا مفہوم تھا کہ تقرری میں وہی طریقہ استعمال کیا جانا چاہئے جو قانونی ہے اور میرے خیالات سے چیف جسٹس کو مطلع کیا جانا چاہئے تھا۔ یہ وہی جج ہیں جنہوں نے گذشتہ برس ایک بنچ کی صدارت کرتے ہوئے ایس سی ایس ٹی پر ہونے والے مظالم کو روکنے والی دفعات کو نرم کر دیا تھا جس کے بعد اس طبقے نے ملک گیر تحریک شروع کر دی تھی۔

دوسرے جج ارون کمار مشرا کو بھی عہدے میں ترقی دے کر سپریم کورٹ لایا گیا، اکنامک اینڈ پولیٹکل ویکلی میں شائع ایک مضمون کے مطابق جانچ میں پتہ چلا تھا کہ ان کے آر ایس ایس سے قریبی روابط ہیں۔ اس کے باوجود ان کی تقرری سپریم کورٹ میں کی گئی۔ سابق سالسٹر جنرل گوپال سبرامنیم کو صرف اس لئے مودی حکومت نے ہٹا دیا تھا کیونکہ وہ سہراب الدین انکاؤنٹر کیس میں امیت شاہ کے خلاف پیروی کر رہے تھے۔ یہ وہ واقعات ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک خاص فکر کس طرح سے عدالتی نظام میں دخیل ہو چکی ہے۔ ایسے میں کیا امید کی جا سکتی ہے؟

مظفر پور کی عدالت کے معاملے ہر طرف خاموشی ہے، محض چند افراد ہیں جو اس فیصلہ کے خلاف کھل کر بول رہے ہیں البتہ حمایت کی آواز صرف آر ایس ایس کی جانب سے اٹھی ہے۔ وجے دشمی کے موقع پر آر ایس ایس سربراہ موہن بھاگوت نے عدالت اور اس کے فیصلے کا ذکر تو نہیں کیا البتہ انہوں نے ماب لنچنگ کرنے والے گروہ کی دبے لہجے میں حمایت کی اور خط

لکھنے والوں کو کھری کھوٹی سناتے ہوئے ان پر الزام لگایا کہ یہ لوگ ملک کو توڑنا چاہتے ہیں کیونکہ چند افراد کے عمل کو پورے سماج سے وابستہ کر کے ان کے خلاف لوگوں کو اکسا رہے ہیں حالانکہ وہ یہ بھول جاتے ہیں اس وقت ہندستان میں مسلمان دہشت گردی کے نام پر معتوب ہیں، تو کیا سبھی مسلمان اسی عمل میں ملوث ہیں؟ ان کے مطابق وہ پورے ہندستان کی فکر رکھتے ہیں تو کیا کبھی اس سلسلے میں انہوں نے بات کی؟ اسی موقع پر ان کو کہنا چاہئے تھا کہ مسلمانوں کو دہشت گرد کہنا یا ان کو شک کی نگاہ سے دیکھنا غلط ہے مگر انہوں نے ایک خاص تناظر میں ہی بات کی۔

دوسری طرف عدالت کے فیصلے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک بار پھر 248 افراد نے کشمیر میں حقوق انسانی کی پامالی کے خلاف حکومت کو کھلا خط لکھ کر واضح کر دیا ہے کہ عوام ڈرنے کے بجائے اپنے حقوق کے لئے لڑیں گے اور آواز اٹھاتے رہیں گے، ان کے اس عمل سے اس ڈر اور خوف کے ماحول میں کمی آئی ہے جو مظفر پور کی عدالت کے فیصلے سے پیدا ہوا تھا جو جمہوریت کے لئے مفید اور فلاح انسانی و حقوق انسانی کے لئے ضروری ہے۔ عدلیہ پر آج بھی عوام کا سب سے زیادہ اعتبار ہے، اس لئے عدالتوں کو بھی اس بات کا خیال رکھنا ہوگا، سماج میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ عدلیہ پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی ہے کیونکہ فوراً ہتک کا معاملہ درج ہو جائے گا، پورے سماج کو اس ڈر اور خوف سے باہر نکالنا بھی عدالت کی اخلاقی ذمہ داری ہے، اس سے اس کی توقیر میں کوئی کمی آنے کے بجائے عوام کا اس پر مزید اعتبار بحال ہوگا جو مضبوط اور طاقتور جمہوریت کے لئے ضروری ہے۔

# فکری موڑ کے دوراہے پر کھڑا ہندستان

متشدد فکر دوسرے افکار ونظریات کو کبھی برداشت نہیں کرتی ہے بلکہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے متوازی فکر/ افکار ونظریات کا قلع قمع کیا جائے پھر اس کے بعد عملی سطح پر تو کامیابی مل ہی جائے گی، اس وقت ملک میں یہی ہو رہا ہے۔ ہندستان تہذیبوں کا گہوارہ ہے، کوئی بھی تہذیب کسی دوسری پر غالب نہیں ہے بلکہ سب نے مل کر ایک مرقع کی شکل جب اختیار کی تو ہندستانی تہذیب وجود میں آئی لیکن متشدد فکر کے حاملین کو یہ کہاں راس آسکتی ہے اس لئے وہ تہذیب کے پردے میں مذہب تک کو نشانہ بنا رہے ہیں کیونکہ مذہب ہی کسی تہذیب کا مصدر ہوتا ہے۔ ہندستان ایک ایسے فکری موڑ کے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں سے قوموں کے مستقبل کے فیصلے ہونے ہیں، ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اپنی فکری صلابت کی بنا پر ایک صدی سے ایک خاص نہج پر کام کر رہے ہیں، جن کے پاس ایک خاص لائحہ عمل ہے، دوسرے طرف وہ لوگ ہیں جن کے پاس اپنے وجود کو بچانے کے لئے نہ کوئی فکر ہے اور نہ ہی لائحہ عمل۔ ایسے میں کامیابی کس کے ہاتھ لگے گی اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے، چونکہ ہندستان صدیوں سے ایک ایسے مشترکہ کلچر کا حامل اور نقیب رہا ہے جس میں متعدد مذاہب اور متنوع تہذیبوں وثقافتوں نے خود کو رچا بسا لیا ہے، اس لئے ان کا خاتمہ اور ان پر ایک ہی تہذیب وثقافت کا کلی غلبہ اتنا آسان بھی نہیں ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بڑی بڑی تہذیبیں دنیا سے مٹ چکی ہیں، ان کے نام ونشان تک مٹ چکے ہیں، ایسے میں یہ سوچ کر بیٹھ جانا کہ گنگا جمنی تہذیب مٹے گی نہیں بڑی عاقبت نااندیشی ہوگی۔ کہتے ہیں پانی کی بے بضاعت بوند بھی گرتے گرتے پتھر کے جگر میں شگاف ڈال دیتی ہے بس یہی ہماری اس مشترکہ تہذیب کے ساتھ ہو رہا ہے کہ دھیرے دھیرے اور تسلسل کے ساتھ اس پر حملوں نے اس میں جگہ جگہ شگاف ڈال دیئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اب لوگوں کا نہ دل صاف ہے نہ ہی ذہن۔

وقتاً فوقتاً ہندو، ہندوتوا اور ہندو راشٹر کی آواز اٹھتی رہتی ہیں تو سب سے پہلے یہ جان لیں کہ یہ

ہے کیا اور ان لفظیات کی تہہ میں کیا ہے اور ان کے استعمال کے مقاصد ہیں۔ 1870 میں بنکم چٹر جی کے ناول آنند مٹھ میں پہلی بار 'ہندوتوا' لفظ کا استعمال ہوا تھا لیکن بطور اصطلاح بال گنگا دھر تلک اور ونا یک دامودر ساور کر نے اس کو رائج کیا، یہ لفظ دراصل ہندو شناخت کے لئے بنایا گیا تھا تا کہ اسی لفظ کے توسط سے ہندوؤں کو ایک خاص نقطے پر متحد کیا جا سکے، ہندوتوا ہی ہندو راشٹر کا مصدر و منبع ہے۔ بال گنگا دھر تلک اور ساور کر کی رتنا گیری میں ملاقات کے بعد اسی مقصد کی تکمیل کے لیے آر ایس ایس کا قیام عمل میں آیا اور اس کے رضا کاروں نے اس لفظ کی تشہیر کی۔ اس طرز فکر کے حامل افراد کبھی خود کو نیشنلسٹ نہیں کہتے ہیں بلکہ ہندو نیشنلسٹ کہتے ہیں، رائٹ ونگ کا یہی فکری تشدد ان کو نہ صرف دوسرے ہندوؤں سے الگ کرتا ہے بلکہ ان کے فکری ارتکاز اور انجماد کی دلیل بھی ہے۔ دراصل ہندو شناخت اور ہندوتوا آئیڈیالوجی کی بات اس ہندستانی مشترکہ کلچر کو تباہ کرنے کے لئے کی گئی تھی جو ہندستان کی شناخت تھی جسے گنگا جمنی تہذیب کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کا مقصد سبھی مذاہب اور تہذیبوں کو ختم کر کے ہندستان کی شناخت صرف ہندو اور ہندوتوا کے طور کرانا تھا، جس کے لئے ایک صدی سے کام کیا جا رہا ہے۔

حال ہی میں ہندستان کی سب سے بڑی اور طاقتور تنظیم کے سربراہ نے گوا میں اعلان کیا کہ ہم 'ہندو راشٹر' ہیں، ہندو کسی پوجا، زبان اور علاقے کا نام نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے جو ہندستان میں رہنے والے سب کی تہذیبی وراثت ہے۔ یہاں انہوں نے اپنے گرو کے ہی نظریے کے خلاف بات کہہ دی ہے۔ گولوالکر متشدد ذہنیت کے حامل شخص تھے وہ اپنی کتاب ''گرو جی وژن اینڈ مشن'' میں ایک باب قائم کرتے ہیں ''ہندو دی سن آف دز مدر لینڈ' یعنی ہندو اس بھارت ماتا کے بیٹے ہیں۔ ان کی اس اصطلاح میں مسلمان، پارسی اور عیسائی شامل نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو ہندو ہیں۔ دراصل انہوں نے یہ بات بھی پردے میں چھپا کر کہی ہے، سیاسی نظریات کے حامل افراد ہمیشہ آدھی باتیں کرتے ہیں، ان کی بات اس وقت پوری ہوتی ہے جب وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ان کی کامیابی ہی ان کی پوری بات ہوتی

ہے۔آرایس ایس کے سربراہ نے اپنے نظریہ کے برخلاف سبھی کو ہندوتہذیب کا حصہ مانا ہے ،اس کے دومقاصد ہیں اول یہ کہ صرف لفظ ہندو اپنے لئے بول کروہ دنیا کوخود سے برگشتہ نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ وہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندو اس ملک کی شناخت ہے اور وہی اس کی تہذیب ہے جس میں سب شامل ہیں، دوسرے وہ سبھی کوشامل کرکے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارا منصوبہ سبھی کو ہندوتہذیب میں بدل دینے کا ہے، آج اگر کچھ تہذیبیں اس سے الگ ہیں تو وہ کل نہیں رہیں گی، وہ کل کو آج پر محمول کرتے ہوئے اپنے عزائم کا اظہار کررہے ہیں۔یوں بھی ہندوراشٹر کا قیام آر ایس ایس کا ابتدا سے مقصد رہا ہے جس پر اس نے پہلے دن سے فکری اور عملی دونوں سطح پر کام کیا جس کا نتیجہ ہے کہ آج آرایس ایس کی سیاسی ونگ بھاجپا دوسری بار مرکز میں اکثریت کے ساتھ اقتدار میں آچکی ہے۔

گروگولوالکر نے مذکورہ کتاب میں ایک باب 'ہماری شناخت اور ہماری قومیت' کے عنوان سے قائم کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں ہندستان کا طرز زندگی ہندوتہذیب کی بنیاد ہے اسی لئے ہم ہندوراشٹر ہیں۔گولوالکر کے افکار ونظریات کی بنیاد پر ہی تاریخ داں رام چندر گواہاں نے ان کو 'نفرت کا گرو' قرار دیا تھا۔آرایس ایس سربراہ نے ان ہی کی بات کو نہ صرف دہرایا ہے بلکہ اس کا اعلان کیا ہے۔آرایس ایس نے ہمیشہ خود کو غیر سیاسی تنظیم قرار دیا ہے لیکن کام اس نے ہمیشہ سیاسی ہی کئے ہیں، یہ اس کی سیاست ہی تو تھی کہ اس نے اپنی سیاسی ونگ قائم کی اور اس کو اقتدار تک پہنچایا۔اقتدار تک پہنچنے سے آرایس ایس نے Deep State یعنی ریاست در ریاست / پس پردہ حکومت کے لئے زمینی سطح پر کام کیا اور اس نے ہر شعبے میں اپنے لوگوں کو پہنچا دیا ۔کہنے کو تو کانگریس اور مخلوط حکومتیں رہیں لیکن حقیقت میں حکومت اسی نے کی ،لیکن اب وہ Deep State سے نکل کر Open state کی شکل اختیار کرچکی ہے۔جس بات کا اعلان حکومتوں کو کرنا چاہئے اس کا اعلان اس تنظیم کے سربراہ کررہے ہیں۔ہندستان ہندوراشٹر ہے یا ڈیموکریٹک اور

لبرل اس کا فیصلہ اور اعلان پہلے ہی آئین نے کر دیا ہے لیکن آئین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اس کو وہ ہندوراشٹر ہونے کا اعلان کر رہے ہیں، اسی طرح سے مسلم خوش ہیں یا ناخوش اس کے اسباب وعوامل کیا ہیں اس پر حکومت کو اپنی رپورٹ اور لائحہ عمل کے تناظر میں گفتگو کرنا چاہئے مگر وہ خاموش ہے اور بول رہی ہے آر ایس ایس۔ اس کا ہر مسئلے پر فرنٹ پر آ کر اسٹینڈ لینا اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ تنظیم جو خود کو سیاست سے الگ بتاتی رہی ہے اب وہ اوپن اسٹیٹ میں بدل چکی ہے۔ کسی بھی جمہوری ملک میں کسی غیر سیاسی جماعت کا ملک کے سیاسی معاملات میں اس طرح دخیل ہونے کا مطلب ہے کہ وہ کھلے طور پر حکومت کی نکیل اپنے ہاتھ میں سنبھال چکی ہے۔ جو ملک کی سالمیت اور اس کی ترقی کے لئے سب سے زیادہ نقصان دہ ہے کیونکہ ایسے میں اس طرح کی تنظیمیں ہر شعبے میں دخل دے کر اپنی فکر کے مطابق اسکیمیں اور لائحہ عمل تیار کراتی ہیں تا کہ ان کے افکار ونظریات کے مطابق سماج کی تشکیل ہو سکے۔

ہندوراشٹر کی بات پہلے ذہن میں تھی پھر کاغذ پر اتری اور کتاب میں آئی، اس کے بعد اب وہ جلسوں جلوسوں تک پہنچ گئی ہے، اس کا آخری اسٹیج ملک میں نفاذ ہی ہے جواب بہت زیادہ مشکل نہیں ہے، آئین میں تبدیلی کی بات پہلے لوگ کہہ چکے ہیں اور من مانی تبدیلیاں بھی ہو رہی ہیں ایسے میں اس کو ہلکے میں بالکل نہیں لینا چاہئے بلکہ سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سیکولر اور جمہوری ڈھانچے کی حفاظت کے لئے لوگ سامنے آئیں اور سرکار سے باہر ایک عام تنظیم کے ذریعہ ملک کے سلسلے میں دیئے جا رہے اتنے خطرناک بیان کی خطرناکی سے عوام کو واقف کرائیں۔ اگر وقت رہتے ہوئے ابھی سے اس فکر کی مخالفت نہ کی گئی اور اس کے سامنے سد سکندری نہ بنائی گئی تو یہ فکر صدیوں کی ہندستانی تہذیب کلچر کو نگل جائے گی، اس وقت ہمارے پاس سوائے کف افسوس کے کچھ نہیں ہوگا۔

# ظلم وتشدد کی علامت اسرائیل اور جامعہ ملیہ

ہندستان عدم تشدد کا نہ صرف ہمیشہ سے پیروکار رہا ہے بلکہ اس کا وہ داعی اور مبلغ بھی ہے، اس نے ماضی بعید میں جہاں دنیا کو 'گوتم بدھ' دیا وہیں ماضی قریب میں گاندھی جیسا اہنساوادی اور اس کا پر چارک دیا۔ تشدد اور خون خرابہ نہ یہاں کی شرست میں ہے اور نہ ہی یہاں کی مٹی اس کی اجازت دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان کی ہمدردی برطانوی نو آبادی ہونے کے باوجود اس سے نہ ہو کر افریقہ سے تھی کیونکہ افریقی ممالک کے عوام بھی مظلوم و مجبور تھے، ان پر بھی ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے اس لئے دو مظلوم ایک ساتھ مل کر ایک ظالم سے پنجہ آزمائی کر رہے تھے، اگر چہ اس وقت ان دونوں کی حیثیت برطانیہ کے مقابلے صفر تھی ، لیکن جہد مسلسل نے دونوں کو وہ دن دکھائے جب ایشیا اور افریقہ کے عوام نے کھلی فضا میں سانس لی۔ پوری دنیا کے عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ زندگی گذاریں ، اپنے وسائل پر ان کا حق ہو اور اپنے فیصلے وہ خود کریں ۔ اقوام متحدہ کی تشکیل بھی اسی لئے عمل میں آئی کہ وہ پوری دنیا میں جمہوریت اور مساوی حقوق کو بحال کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔

ہندستان روز اول سے مظلوموں کے ساتھ کھڑا رہا ہے، اس نے یہی پالیسی فلسطین کے ساتھ بھی اختیار کی۔ اس روئے زمین کے نقشے پر جب سے اسرائیل وجود میں آیا اس نے انسانیت کو شرمسار کرنے والی پالیسی پالیسی اختیار کی جس پر کاربند بھی ہے، ہندستان نے کبھی ظالمانہ اور جابرانہ پالیسی کی حمایت نہیں کی بلکہ اس نے ہمیشہ فلسطین کی آزادی کی بات کی اور اس کا ساتھ بھی دیا۔ لیکن حالات کے بدلنے کے ساتھ منظر نامے اور ذہنی وفکری رویے بھی بدل جاتے ہیں۔ اہنسا کے پجاری موہن داس کرم چند گاندھی کا اسی ملک میں قتل ہو جاتا ہے، شروع میں تو اس کی مذمت کی جاتی ہے اور لوگ اس کو برا بھی تصور کرتے ہیں لیکن آج حالات یہ ہو گئے ہیں کہ گاندھی کا مجسمہ بنا کر اس کو کیمرے کے سامنے گولی ماری جاتی ہے اور فخر کے ساتھ ہندستان کے پہلے دہشت گرد ناتھورام گوڈسے کی جے جے کار کی جاتی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے

امید کی جاسکتی ہے کہ ہندستان اوراس کی حکومت اپنے دیرینہ رویے پر قائم رہے گی اور وہ ان ہی اصولوں پر کار بند رہے گی جو بنائے گئے تھے۔اب تو باضابطہ یہاں کے وزرااسرائیل کا دورہ کرتے ہیں اور وزیر اعظم نریندر مودی پہلے ایسے وزیر اعظم ہوئے جنہوں نے اسرائیل کا دورہ کیا۔مانا یہ جاتا ہے کہ خارجی پالیسیوں کے اثرات بھی خارجی ہوتے ہیں، داخلی امور پر ان کے اثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں لیکن یہ اصول ہر جگہ کارگر نہیں ہوتا ہے، کچھ خارجی پالیسیاں ایسی ہوتی ہیں ہیں جن کے اثرات داخلی اور خارجی دونوں ہوتے ہیں۔اسرائیل کے سلسلے میں اختیار کردہ پالیسی ایسی ہی ہے، جس کے اثرات ملک پر بھی پڑ رہے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندستان کا ایک اہم تعلیمی ادارہ ہے بالخصوص ہندستانی مسلمانوں کے لئے یہ ادارہ نہایت اہمیت کا حامل ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بعد یہ دوسرا ادارہ ہے جہاں سب سے زیادہ مسلم بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔آرزوؤں اور تمناؤ کے چمن میں اگر زاغ و زغن گھس آئیں یا چمن کا مالی ان کو دعوت دے کر بلائے کہ آؤ اس کی خوبصورتی کو پامال کردو، اس کے حسن کو تباہ کردو، چمن کے پودوں میں زہر ڈال دو اور یہاں کے بلبلوں کو خوش نوائی اور خوش الحانی کے بجائے کاؤں کاؤں سکھا دو تو ظاہری بات ہے کہ چمن کے بلبل و قمریوں میں ہڑ بونگ مچ جائے گی اور وہ اپنی بے بضاعتی کے باوجود حتی الامکان اس بات کی کوشش کریں گے کہ اپنے چمن کو زاغ و زغن کے برے اثرات اور ان عمل داری سے محفوظ رکھیں۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبا بھی آج ایسی ہی نا عاقبت اندیش مالی کی کرتوت اور اس کو تباہ کرنے والوں سے بچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔جامعہ ملیہ میں گلوبل ہیلتھ زینتھ 2019 کے نام پر اسرائیلی وفد کو یہاں داخلہ کی اجازت دی گئی جس سے طلبا میں ناراضگی ہے، انتظامی امور کی ذمہ داری کا مطلب اس کی روح سے چھیڑ چھاڑ کی اجازت نہیں مل گئی ہے، انتظامیہ نے جب جامعہ ملیہ کی روح کے منافی قدم اٹھایا تو طلبا کا مشتعل ہونا لازمی تھا، جس کے بعد جو کھیل کھیلا گیا اور طلبا کی پٹائی کیمپس کے اندر ہوئی وہ رونگٹے کھڑے کردینے والا ہے۔طلبا پر یہ حملہ صرف ان پر حملہ نہیں ہے بلکہ ایک فکر پر حملہ

ہے اور اس فکر کی آواز کو دبانے کی کوشش ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے اس کے مقاصد کی وضاحت ہو جاتی ہے لیکن یہاں کی انتظامیہ ایسے لوگوں کو کیمپس میں مدعو کرتی ہے جن کے ہاتھ معصوم فلسطینی بچو کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، ان کو تو یورپی یونین جیسے مما لک سے سبق لینا چاہیے جنہوں نے اسرائیل کے ناجائز قبضے والے علاقے میں قائم فیکٹریوں میں تیار اشیا کا بائیکاٹ کرتے ہوئے اس کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کر دی تھی تا کہ وہ فلسطینیوں پر ظلم میں شریک نہ سمجھے جائیں مگر یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی انتظامیہ کو اس بات کی کوئی فکر نہیں، ان کو اس لئے اسرائیلی وفد کو داخلہ دینا ہے تا کہ وہ لوگ خوش ہوں جن سے ان کے مفاد وابستہ ہیں حالانکہ لیبل یہ لگایا جائے گا کہ یہ ملک اور عوام کے مفاد میں اٹھایا گیا قدم تھا لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب کسی فکر کی مخالفت کی جاتی ہے تو وہاں مفاد کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

دیکھنے میں تو یہ بہت معمولی واقعہ ہو سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے، اس کے عواقب بڑے خطرناک ہیں، اسرائیلی وفد کو اس یونیورسٹی میں داخلہ صرف ایک یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ہے بلکہ اس فکر کو سبوتاژ کرنے کی کوشش ہے جس کے ذریعہ ہندستانی مسلمان اور نوجوان اسرائیل کے بجائے فلسطین کی حمایت کرتے ہیں۔اسرائیل کی خواہش ہے کہ وہ ہندستان میں اپنی بنیادوں کو مزید مضبوط کرے اور یہاں کے مسلمانوں کی سوچ کو تبدیل کر سکے۔اسرائیل اپنے مفاد کے لئے ایسی تنظیموں کا سہارا لے رہا ہے جو اکے مقاصد کی تکمیل میں معاون ہو سکتی ہیں، جس کے بدلے وہ ایسی تنظیموں کی ہر سطح پر مدد بھی کرتا ہے۔فکری سطح پر دونوں میں توافق ہے اس لئے دونوں ایک دوسرے کے لئے کام کر رہے ہیں مگر آلہ کار بن رہے ہیں انتظامی امور کے وہ ذمہ داران جن کی نظر میں قوم وملت کی سربلندی کے بجائے وقتی مفادات ہوتے ہیں۔اس طرح کے مفادات کی عمر بہت کم اور سطحی ہوتی ہے جبکہ اس کے عواقب اور نقصانات کئی صدیوں تک نسلوں کو جھیلنا پڑتا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ملت کے نونہالوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا تا کہ ہندستان کے ساتھ پوری ملت کو ایسے افراد مل سکیں جو اس بیمار قوم کی مسیحائی کر سکیں، جامعہ ملیہ کے منتظمین کو اپنے ذہن میں اس کے تاسیسی مقاصد کو رکھتے ہوئے ہی کوئی قدم اٹھانا چاہیے ،اسرائیلی وفد کو دعوت، شرکت اور اس کے خلاف دھرنا پر طلبا پر کارروائی سے واضح ہوتا ہے جامعہ ملیہ اپنے تاسیسی مقاصد سے دور جا رہی ہے جس کے لئے ذمہ دار اس کی منتظمہ اعلی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے۔ ملک و قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ جامعہ ملیہ اور ان جیسے دیگر اداروں کو کسی فکر کی تبلیغ اور مقاصد کی برآری کے لئے تختہ مشق نہیں بننے دینا چاہئے اور اگر تخریبی فکر کے حاملین اپنے ان مقاصد میں کامیاب ہو گئے تو ہماری نسلیں اس فکر سے تہی دامن ہو جائیں گی جس کی وجہ سے وہ ظلم و جور، ظالم و قاتل اور اخوت و محبت کے مابین فرق کرنا سیکھتے ہیں۔ اسرائیل ظلم و تشدد کی علامت ہے جس کی پوری قبا معصوموں کے خون میں لت پت ہے۔ اس کو کم از کم جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پلیٹ فارم نہیں دیا جا سکتا ہے۔

# کشمیر، پریس کی آزادی اور میڈیا کا رویہ

جمہوریت میں سب سے زیادہ اہم جمہوری اقدار کی بحالی ہے، اگر ان جمہوری اقدار پر شب خون مار دیا جائے تو جمہوریت نہ صرف لہولہان ہو جاتی ہے بلکہ اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ آج کے دور میں پریس کی آزادی بے حد اہم ہے، یہیں سے جمہوریت کا آغاز ہوتا ہے، کیسے بھی حالات ہوں ہم پریس پر پابندی نہیں لگا سکتے ہیں، خبروں میں کتر بیونت نہیں کر سکتے ہیں، جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی رپورٹنگ سچائی اور ایمانداری سے ہونی چاہئے لیکن اس سچائی اور ایمانداری پر اسی وقت عمل ہوسکتا ہے جب ریاست اس پر کوئی قدغن نہ لگائے۔

حال ہی میں آسٹریلیا کی میڈیا نے پوری دنیا کے سامنے جو مثال پیش کی ہے وہ صرف لائق ستائش ہی نہیں ہے بلکہ قابل عمل بھی ہے، اسٹریلیا کی حکومت نے جب عوام کے جاننے کے حق پر شب خون مارا اور اطلاعات پر پابندی کے لئے چور دروازے کا استعمال کرتے ہوئے صحافیوں کے گھر پر چھاپہ ماری شروع کی تو وہاں کے سبھی میڈیا گروپ ایک پلیٹ فارم پر آ گئے اور حکومت کے اس قدم کی بہت واضح انداز میں مخالف اس طرح کی کہ صبح کے سبھی اخبارات کے پہلے صفحے پر سطریں تو ضرور تھیں مگر وہ اس قابل نہیں تھیں کہ ان کو پڑھا جا سکے وہ صرف علامتی تھیں اسی طرح سے چینلوں نے ایسی کلپ تیار کی جس کا مفہوم نہیں تھا جو اس بات کا اعلامیہ تھا کہ اب ہم اس دور میں پہنچ گئے ہیں جہاں دیکھنے میں تو محسوس ہوگا کہ سب کچھ ہے لیکن ہے کچھ نہیں۔ آسٹریلیائی میڈیا کے اس ردعمل نے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور وہاں کی سرکار گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئی کیونکہ اس سے اس کی بدنامی ہونے لگی تھی۔ آسٹریلیائی میڈیا نے یہ صرف اس لئے کیا تھا کہ عوام کے جاننے کے حق سے ان کو محروم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جمہوریت کے چوتھے ستون نے اپنا فریضہ انجام دیتے ہوئے عوام کو بھی بتا دیا کہ حکومت کس طرح کے اقدام کر رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے عوام نے بھی میڈیا کا بھرپور ساتھ دیا۔

اس کے برعکس ہندستانی میڈیا کا رویہ کیا ہے یہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے، یہاں سرکار کی

پریس ریلیز کی اشاعت کو ہی معراج تصور کیا جاتا ہے بلکہ سب سے بڑا اور اہم میڈیا گروپ اسی کو تصور کیا جاتا ہے جس کے پاس سرکاری پریس ریلیز سب سے زیادہ اور سب سے پہلے آتی ہوں۔میڈیا نے سرکار کے لئے گھٹنے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں، جس میں صحافی اور مالکان دونوں برابر کے شریک ہیں۔یہاں اگر کوئی میڈیا گروپ یا میڈیا سرکار کے خلاف خبریں شائع کرے اور اس پر سرکاری عتاب نازل ہوتو دوسرا میڈیا گروپ اس کے ساتھ کھڑا نہیں ہوتا۔دی ہندو نے جب رافیل سے متعلق دستاویز شائع کئے تو اس کے ساتھ کوئی کھڑا نہیں ہوا۔کئی ایسے صحافی ہیں جو اپنی سچائی اور ایمانداری کی سزا بھگت رہے ہیں، ان کو ملازمت سے باہر کردیا گیا مگر کسی بھی میڈیا گروپ یا صحافی نے اس کے خلاف آواز نہیں بلند کی۔ابھی کتنے دن ہوئے جب مرزاپور میں ایک اسکول میں میڈ ڈے میل میں نمک روٹ دیئے جانے کی خبر ایک صحافی نے دی تو اس کے خلاف سرکار کو بدنام کرنے کا مقدمہ کردیا گیا۔کتنے صحافی تھے جو اس ایماندار صحافی کے حق میں کھڑے ہوئے۔پریس کونسل آف انڈیا کا رویہ بھی حوصلہ افزا نہیں ہے، وہ بھی مذمت سے آگے نہیں بڑھتا ہے جبکہ آسٹریلیا کی طرح اس کو بھی سبھی میڈیا گروپ کو متحد کر کے ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہئے۔

اخبارات میں کشمیر کے ہندستان کا اٹوٹ حصہ ہونے کی بڑی بڑی سرخی کے ساتھ خبریں شائع ہوتی ہیں، ٹی وی چینلوں پر اینکر چیختے چنگھاڑتے ہیں مگر ان کو کشمیریوں کی ذرہ برابر فکر نہیں ہے، اس معاملے میں بھی میڈیا نے سرکار کی پریس ریلیز کو ہی کافی تصور کیا اور اسی کے مطابق رپورٹنگ کی ہے۔کسی بھی میڈیا گروپ نے اس پر سوال نہیں اٹھایا کہ جب سرکار کے مطابق سب کچھ ٹھیک ہے تو بھلا صحافیوں کو وہاں جانے سے کیوں محروم کیا جارہا ہے، وہ بھی جائیں اور آپنی آنکھوں سے ''سب کچھ ٹھیک ہے'' دیکھ کر دنیا کو دکھائیں لیکن نہ سرکار نے اس کی اجازت دی اور نہ میڈیا نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔میڈیا کا بنیادی فریضہ تو یہی ہے کہ جو عوام کی آنکھوں سے دور ہے اسے وہ دکھائیں اس نے اپنا فریضہ انجام نہیں دیا۔ویب پورٹل ''کارواں

’’نے ایک دل دلا ہنے والی رپورٹ دو کشمیری خواتین کے حوالے سے شائع کی ہے جو دل دہلانے والی ہے۔ہم اپنے فوجیوں اور پولیس کے ساتھ ہی تفتیشی ایجنسیوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہیں لیکن حقوق انسانی کی خلاف ورزی پر اس پر انگلی بھی اٹھائیں گے،کسی کے ہونٹوں میں سوئیاں چبھونا وہ بھی بغیر کسی غلطی کے یہ سراسر انسانیت کے خلاف ہے اور اگر غلطی ہوتی تو ملزم کو چھوڑا نہیں جاتا۔آئی ڈی کارڈ واپس لینے کے بہانے بلا کر ان پر تشدد کرنا کہیں کا انصاف نہیں ہے،اسی طرح کثیر تعداد میں بچوں کی گرفتاری بھی سوالات کے زد میں ہے،جس کے خلاف سپریم کورٹ میں سنوائی بھی چل رہی ہے۔ہماری میڈیا حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتی؟اور اگر یہ غلط ہے تو وہ سچ جاننے کی کوشش کیوں نہیں کرتی ہے۔ابھی چند دن پہلے کشمیری صحافی آصف سلطان کو ان کی غیر موجودگی میں امریکہ میں انٹرنیشنل فریڈم ایوارڈ دیا گیا جو اس وقت جیل میں ہے،یہ ایوارڈ صرف اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ وہ کشمیر کی آواز اٹھا رہا تھا۔ہندستانی میڈیا سے زیادہ باخبر اور اپنے فریضہ کے تئیں بیدار یوروپی یونین کے پارلیمنٹ کرس ڈیوس نکلے جن کو جب کشمیر کے دورے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ ضرور جائیں گے لیکن سرکاری افسران یا فوج کے سنگینوں کے سائے میں نہیں بلکہ صحافیوں کے ساتھ جائیں گے اور جس سے میرا دل چاہے گا گفتگو کروں گا،میں خود اپنی نظروں سے سب کچھ دیکھنا چاہتا ہوں میں وہ نہیں دیکھنا چاہتا جو سرکار دکھانا چاہتی ہے۔بس اسی بات پر ان کا دعوت نامہ منسوخ کر دیا گیا۔اس وفد کا اہتمام ایک غیر سرکاری تنظیم ’ویمنس اکنامک اینڈ شوسل تھنک ٹینک‘ نے کیا جبکہ فنڈنگ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار نان الائنڈ اسٹڈیز نے کیا ہے۔کرس ڈیوس نے بعد میں کہا کہ’میں مودی سرکار کے پی آر اسٹنٹ میں حصہ لینے اور یہ دکھانے کو تیار نہیں تھا کہ آل از ویل‘۔جس کا اعلان مودی نے امریکہ کے ایک جلسے میں کیا تھا۔اس وفد میں یوروپی یونین کے متشدد نظریات کے حامل ممبران پارلیمنٹ شامل ہیں طرفہ تماشہ یہ کہ اس کے ممبران کشمیر میں پریس کے آزاد ہونے کا بیان کیمرے پر دے رہے ہیں

،جس سے ان کی غیر جانبداری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کہنے کو یہ دورہ غیر سرکاری ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، کیونکہ حکومت نے ہندستانی ممبران پارلیمنٹ کو کشمیر جانے کی اجازت نہیں دی ہے، ایسے میں اس نے یوروپی یونین کے اس وفد کو بلا کر اپنی شبیہ سازی کی کوشش کی ہے۔ ہماری میڈیا نے ہندستانی ممبران پارلیمنٹ کو روکے جانے اور یوروپی وفد کو مدعو کئے جانے کا بھی معروضی انداز میں تجزیہ نہیں کیا اور نہ حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ میڈیا کا یہ رویہ جمہوریت کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے، میڈیا کو جمہوریت کا آلہ کار ہونے کے بجائے اس کے عمل اور اقدام پر نظر رکھنا چاہئے تاکہ انسانی حقوق وہ سلب نہ کر سکے کیونہ جہاں سے یہ عمل شروع ہوتا ہے سرکاریں جمہوریت سے ڈکٹیٹر شپ کی طرف جانے لگتی ہیں۔ جمہوریت کے چار ستون بتائے گئے ہیں جن میں میڈیا بھی شامل ہے لیکن ان سبھی ستونوں پر عوام بھاری ہوتے ہیں ان کو بھی جاننے کے حق کے لئے آواز اٹھانا چاہئے مگر یہ افسوس کی بات ہے کہ کشمیر کے حوالے سے لیفٹ کے علاوہ کسی نے آواز نہیں آٹھائی ،کوئی دھرنا اور مظاہرہ نہیں ہوا اور مسلمانوں کی طرف سے تو بالکل خاموشی کا مجرمانہ مظاہرہ ہوا ہے۔ عوام کو میڈیا کے اس رویے کے خلاف بھی سامنے آنا چاہئے جو اس نے اختیار کر رکھا ہے ورنہ جمہوریت کے معنی صرف سرکار اور میڈیا ہو کر رہ جائیں گے، جہاں کسی کو کچھ نہیں معلوم ہوگا، کشمیر کی طرح سب کچھ اندھیرے میں رہے گا۔

# سپریم کورٹ کے فیصلے پر یہ کیسا یقین؟

کسی بھی ملک میں انصاف کا عمل سب سے اہم مانا جاتا ہے، جمہوری ملک کا یہ خاصہ ہے کہ ریاست اور اس کے ادارے غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے اقلیت و اکثریت دونوں کا اعتماد سرکار اور اس کے اداروں پر بحال رہتا ہے، لیکن جہاں اس کے ادارے جانبداری سے کام لیتے ہیں وہیں انصاف اپنی موت مرجاتا ہے اور پھر شر پسندی عام ہونے لگتی ہے۔ اس وقت ملک کے سب سے اہم معاملے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے والا ہے، چونکہ یہ فیصلہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کی جانب سے سنایا جائے گا، جس سے بڑی کوئی عدالت نہیں، اس لئے اس کو تسلیم کرنے کا مسلم طبقہ کی جانب سے پہلے ہی اعلان کیا جاچکا ہے، لیکن کچھ افراد ایسے بھی ہیں جن کو عدالت کے فیصلہ پر یقین نہیں ہے۔ جس کا وہ اظہار بھی کرتے ہیں مگر سرکاری ادارے خاموش ہیں، کوئی تادیبی کارروائی بھی نہیں کرتے ہیں جس سے قیام امن میں خلل کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔

بابری مسجد ہندستانی سیاست کا وہ ٹرننگ پوائنٹ ہے جس نے ہندستان کی سیاست کا پورا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ آزادی کے بعد یہ واحد قومی سطح کا معاملہ تھا جس نے پورے ملک کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ہزاروں جانوں کی ضیاع کا سبب بھی بنا۔ اسی معاملے کے دوش پر سوار ہوکر پارٹیاں اقتدار تک پہنچیں۔ اگر اس معاملے کی تہہ میں جھانک کر دیکھا جائے تو سمجھ میں آئے گا کہ یہی وہ معاملہ ہے جس نے قوم کو پولرائز کیا، اور ایک ایسے نقطے پر جمع کردیا جہاں سے راستہ محبت کی وادی کے بجائے نفرت کے صحراء کی طرف جاتا ہے۔ اسی معاملے کو مرکز میں رکھ کر ملک کی فضا خراب کی گئی، ایک ساتھ رہنے والے ہندو مسلم کے دلوں میں کدورتیں بھری گئیں، یہ خوشی کی بات ہے کہ فیصلہ آنے کے بعد پورے ملک کو ایک ایسے نزاعی معاملے سے نجات مل جائے گی جس کی بنا پر نفرتوں کا بازار گرم تھا۔ فیصلے کے بعد حالات کو قابو میں رکھنے کیلئے دوطرفہ کوششیں بھی شروع ہو گئیں کہ کسی طرح کا کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے ملک کی فضا خراب ہو۔ لیکن رائٹ ونگ کی سیاست کرنے والے ونے کٹیار کے بیان نے ایک بار پھر فضا کو نہ صرف مکدر کردیا ہے

بلکہ ان کے عزائم ایسے ہیں جس سے ملک اس مسئلے سے نجات کے بعد نفرت و کدروت سے نجات نہیں پائے گا بلکہ اگر انہوں نے اپنے اعلان پر عمل کیا اور اور سرکار اور اس کے اداروں نے اس پر قدغن نہیں لگائی تو حالات ابتری کی طرف ہی جائیں گے۔ ونے کٹیار کی تضاد بیانی تو دیکھئے کہ ایک طرف وہ کہہ رہے ہیں کہ بابری مسجد معاملے میں سپریم کورٹ جو بھی فیصلہ دے گی وہ قبول کریں گے لیکن اجودھیا میں رام جنم بھومی یعنی رام مندر کے علاوہ اور کچھ بھی قبول نہیں کریں گے، عدالت کا یہ کیسا احترام ہے؟ کیا کسی نے اب تک اس پر سوال اٹھایا؟ وہ خوف کی سیاست کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رام جنم بھومی کا مسئلہ حل ہو چکا ہے اب کاشی اور متھرا کی باری ہے۔ انہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ جلد ہی ''دھرم استھان مکتی یگ سمیتی'' کی میٹنگ طلب کر رہے ہیں اور آئندہ کے منصوبوں سے متعلق فیصلے کئے جائیں گے۔ واضح رہے کہ یہ وہی کمیٹی ہے جس کی 1984 میں ایک میٹنگ میں رام مندر تحریک کو تیز کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے بعد جو ہوا سب کے سامنے ہے۔

کیا سرکار اور انتظامیہ کو ایسے بیانات دینے والے اور عزائم کا اظہار کرنے والے افراد پر قدغن نہیں لگانا چاہئے؟ کیا اس کو صرف مسلمانوں سے ہی خطرہ ہے؟ جس طرح سے انتظامیہ مسلم علما اور ائمہ کو مدعو کر کے ان کو سبق پڑھاتی ہے کہ وہ اپنی قوم کو کسی بھی حرکت سے باز رکھیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان ہی سب سے زیادہ خونخوار ہیں، وہی ملک کے حالات کی خرابی کا سبب ہیں ۔ بہرائچ میں واقع مدرسہ ہدایت العلوم کے ناظم مولانا محمد سرور خاں قاسمی نے اس ضمن میں اس وقت بڑی اچھی بات کہی جب قیام امن کے سلسلے میں میٹنگ کے لئے ضلع انتظامیہ نے ان کو مدعو کیا۔ انہوں نے کہا کہ جمعیۃ علما کے ساتھ ہی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بہت پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ سپریم کورٹ کا جو بھی فیصلہ ہوگا ہم اسے بغیر کسی قیل وقال کے تسلیم کریں گے اور ضلع انتظامیہ سے قبل ہی اس کی کوششیں بھی شروع ہو چکی ہیں لیکن صرف ایک طبقے پر دباؤ بنانے سے حالات پر امن نہیں رہتے ہیں بلکہ ان لوگوں کو سمجھایئے جو علی الاعلان کہتے ہیں کہ اجودھیا میں

بابری مسجد کی جگہ پر رام مندر کے علاوہ ہم کچھ قبول نہیں کریں گے۔انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ گذشتہ دنوں درگا پوجا اور مورتی وسرجن کے دوران اکثریتی فرقہ کے نوجوان متنازعہ کیسٹیں بجاتے رہے اور مائک سے اعلان کرتے رہے کہ رام للا ہم آئیں گے مندر وہیں بنائیں گے۔اسی طرح ان کو اپنی حکومت ہونے کا بھی زعم ہے جس کا وہ اظہار بھی کرتے رہتے ہیں لیکن اس وقت پولیس اور انتظامیہ سب تماشائی بنی رہی ۔یہ نہایت اہم بات ہے، ضلع انتظامیہ کو اس بات کو سمجھنا چاہئے ،اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ جن کے ساتھ مسلسل لنچنگ ہورہی ہے، جو اپنے گھروں سے نکلتے ہوئے خوف زدہ رہتے ہیں، جن کو ہر وقت اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ اس کے سر پر ٹوپی یا چہرے پر داڑھی ہے جس کی وجہ سے کہیں بھی شر پسند ان کو نشانہ بنا سکتے ہیں وہ ملک کے حالات کیا خراب کریں گے۔آج تک کسی مسلم تنظیم یا فرد کی جانب سے کوئی ایسا بیان نہیں آیا جس میں یہ کہا گیا ہو کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو قبول نہیں کریں گے لیکن اس کے برعکس دوسرے فریق کی جانب سے کبھی صاف طور پر یہ نہیں کہا گیا کہ اگر ان کے حق میں فیصلہ نہیں آتا ہے تب بھی وہ تسلیم کریں گے جبکہ دوسری طرف چینلوں پر ہونے والی عام ڈبیٹ میں بھی رائٹ ونگ کے لوگ بڑی دیدہ دلیری سے کہتے سنے گئے کہ رام مندر وہاں نہیں بنے گا تو کیا مکہ میں بنے گا اور ونے کٹیار کی طرح تو ہزاروں ایسے ہیں جو تضاد بیانی سے کام لے رہے ہیں اور حکومت و انتظامیہ کے لئے چیلنج بن رہے ہیں لیکن ان پر لگام لگانے کی کوشش نہیں کی جارہی ہے۔

ریاست اگر منصف نہ ہو تو وہ ظلم و جور کا بازار گرم ہو جاتا ہے جس کے بطن سے امن وامان کے بجائے شر پسندی جنم لیتی ہے۔اس لیئے ریاست اور اس کے اداروں کو خوف کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ان لوگوں کو بھی اس امن مسئلہ میں نہ صرف شامل کرنا چاہئے بلکہ سب سے زیادہ زور ان ہی پر دینا چاہئے جو اب تک ماورائے عدالت فیصلے کا اعلان کرتے رہے ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے ہم تو یہی کریں گے۔اگر انتظامیہ ایسا نہیں کرتی ہے تو اس کے بڑے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

# درماندہ فکری کے بجائے منصوبہ بندی

انسانی فکریات کی تشکیل ان عوامل سے ہوتی ہے جن سے کسی بھی سطح پر انسان کی زندگی متاثر ہوتی ہو، یہ اثر مثبت اور منفی دونوں ہو سکتے ہیں، رام مندر اور بابری مسجد کے قضیہ میں جو فیصلہ آیا ہے اس کے بھی اپنے اثرات ہوں گے جو ظاہر تو ہو چکے ہیں مگر ان کو قبول دھیرے دھیرے کیا جائے گا۔ مثبت پہلو پر تو ہر ایک کی نظر ہے جس کو امن سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اس کے منفی نتائج پر توجہ نہیں دی جا رہی ہے، حالانکہ کئی ماہرین قانون اس بات کا برملا اظہار کر چکے ہیں کہ اس فیصلے کے اثرات اقلیتی اور اکثریتی فکر میں خلیج کے طور پر سامنے آئیں گے۔

جو ہونا تھا ہو چکا، مسلمانوں کے لیے اب اس مقدمے میں پانے کے لیے کچھ نہیں بچا ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس مقدمے نے تنازع کو ختم کر دیا ہے وہ شدید فکری غلطی پر ہیں سچائی یہ ہے کہ اب اکثریت کو ایک راہ مل گئی ہے، یوں بھی بی جے پی لیڈروں نے کٹیار بیان دے چکے ہیں کہ بابری مسجد کے بعد اب کاشی اور متھرا کی باری ہے، اس لیے کسی کو، خاص طور پر انتظامیہ کو اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ رام مندر کے حق میں فیصلہ کے بعد ایک نئے ہندستان کا جنم ہوا ہے جہاں اکثریت اور اقلیت کے مابین فکری تفریق اور ذہنی خلیج لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جائے گی۔ ایک میں احساس برتری پروان چڑھے گی اور دوسرے میں احساس کمتری میں اضافہ ہوگا جس سے دونوں میں بعد بڑھتا جائے گا اور انتہا بعد المشرقین ہوگی۔ اس لیے ان حالات سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو تیاری کا آغاز کر دینا چاہیے، ان کو تسلیم کرنا چاہیے کہ بابری مسجد سے متعلق فیصلہ ہندستانی مسلمانوں میں نئی فکر کو تشکیل دے گا۔ یہ فکر وہ ہوگی جس کے تحت ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کو بھی ظلم سے تعبیر کیا جائے گا۔ کیونکہ عدلیہ کے فیصلے پر سوال اٹھانے کو گناہ تصور کیا جائے گا۔ حالانکہ اکثریتی فکر اس کے برخلاف ہوگی، ابھی کتنے دن ہوئے عدلیہ نے سبری مالا سے متعلق جب فیصلہ دیا تو ہر طرف اس کی نہ صرف مخالفت ہوئی بلکہ وزیر داخلہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ عدلیہ کو ایسے فیصلے نہیں دینا چاہئے جن کا نفاذ مشکل ہو۔ آج بھی

سبری مالا سے متعلق عدالت کے فیصلے کو نزاعی ہی تصور کیا جاتا ہے جب کہ بابری مسجد سے متعلق آئے فیصلے میں متاثر فریق نے ابھی تک اپنی آواز بھی بلند نہیں کی ہے، بس اتنا کہا کہ فیصلہ امیدوں کے مطابق نہیں آیا اس کا جائزہ لیا جائے گا۔ پاپولر فرنٹ آف انڈیا واحد ایسی تنظیم ہے جس نے اس فیصلے کے خلاف پرامن احتجاج شروع کیا ہے۔ کسی بھی فیصلے کی مخالفت یا موافقت انسان کا بنیادی حق ہے، جس سے کسی بھی طرح سے دستبردار نہیں ہونا چاہئے، تا کہ آنے والی نسلوں کو بھی معلوم ہو کہ ہر طرح سے ہمارے پورو ج حق کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح وہ فکری پسماندگی کے اندھے غار میں جانے سے بچ جائیں گے اور ان میں بھی حق کے ساتھ کھڑے ہونے اور غلط کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت پیدا ہوگی۔

بابری مسجد اب حقیقت سے تاریخ میں تبدیل ہوگئی ہے جو عجب نہیں چند برسوں بعد تاریخ کے اوراق میں بھی نہ ملے، کیونکہ رائٹ ونگ کے لوگوں اور تاریخ دانوں کو مغلیہ افراد اور ان کی بنا کردہ نشانیوں سے اللہ واسطے بیر ہے، سوائے داراشکوہ کے، کیونکہ وہاں کے نظریات کے خانے میں فٹ بیٹھتا ہے، اس لیے دھیرے دھیرے سبھی نشانیوں کو ختم کیا جائے گا، یوں بھی نئی تاریخ سازی کا پورا منصوبہ ہے، ایسے میں بابری مسجد اگر تاریخ کے اوراق سے بھی غائب ہو جائے تو کوئی بعید نہیں ہیں، ہندو مہا سبھا نے مسجد کے لیے دی گئی زمین کے خلاف رویو پٹیشن کا عندیہ دیا ہے جس کی حمایت بھی متشدد نظریات کے حامل افراد کر رہے ہیں، ان کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ اول اگر حکومت نے مسجد کے لیے زمین دی تو اس کے خلاف دھرنا و مظاہرہ کیا جایے گا اور دوم بابر کے نام سے پورے ملک میں کہیں بھی مسجد نہیں تعمیر ہونے دی جائے گی، ہمیں کرنا بھی نہیں ہے کیونکہ اس سے کچھ ملنے والا نہیں لیکن اس شدت کے خلاف آواز ضرور بلند کرنا ہے۔ اس لئے عدلیہ کو خود بتانا چاہئے کہ اس نے کس مسجد کے لیے زمین دینے کا حکم دیا ہے؟ اور مسجد کا نام کیا ہوگا اس کی بھی عدالت کو ہی وضاحت کر دینا چاہیے تا کہ ملک کے امن و امان کو کسی بھی طرح سے خطرہ لاحق نہ ہو. خیر!

عدالت کا جو فیصلہ آنا تھا آچکا، رویو پٹیشن کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے کیونکہ بادی النظر میں فیصلہ حقائق کی بنیاد پر نہیں ہے، یہ بات صرف مسلم پرسنل بورڈ نہیں کہہ رہا ہے بلکہ سابق جج اور تاریخ داں بھی یہی بات کہہ رہے ہے، سابق جج اے کے گنگولی اور تاریخ داں ڈی این جھا اور سابق جج مارکنڈے کاٹجو نے بھی اس فیصلہ پر حیرت کا اظہار کیا، ڈی این جھا ان چار تاریخ دانوں میں سے ہیں جنہوں نے آزادانہ طور ''اے ہسٹارینس رپورٹس ٹو دی نیشن'' تیار کر کے 1992 میں مسجد کی شہادت سے قبل حکومت کو سونپی تھی، پروفیسر سورج بھان سنگھ، اطہر علی اور اے آر شرما کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس رپورٹ کے مطابق بھی مسجد کے نیچے کوئی مندر نہیں تھا، اور عدالت نے بھی تسلیم کیا ہے لیکن اب یہ سب تاریخ کا حصہ بن چکا، میرے خیال میں مسلم پرسنل لا بورڈ کو رویو پٹیشن ضرور ڈالنا چاہیے تاکہ حصول انصاف کا یہ عمل بھی مکمل ہو اور دنیا دیکھ لے کہ ہندستان میں کس طرح انصاف کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ بابری مسجد کے فیصلے سے قبل اور اس کے بعد جس طرح سے ہندوستانی مسلمانوں نے حب الوطنی کا ثبوت دیا، اور اپنے افعال و اعمال سے جس طرح سے ملک کی سالمیت کو یقینی بنایا وہ بھی تاریخ میں زریں حروف میں لکھا جائے گا۔

خواہ کوئی کتنا بھی کہے اس مسئلے کو ہار جیت کے تناظر میں نہیں دیکھنا چاہئے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، 1992 میں جب رتھ یاترا شروع ہوئی تھی تو اعلان کیا گیا تھا کہ مندر وہیں بنائیں گے، عدلیہ نے بھی اس پر مہر لگا دی ہے۔ ایسے میں اس فیصلہ کو صرف یہیں تک محدود نہ رکھا جائے، ایک بات اور ذہن نشیں رہے 9 نومبر 1989 کو شیلا نیاس ہوا تھا اور اسی تاریخ کو 2019 میں رام مندر کے حق میں فیصلہ آیا ہے، کیا تاریخ کی ان کڑیوں کو نہیں جوڑا جائے گا؟ یا نہیں جوڑا جانا چاہئے؟

8 نومبر کو دہلی کے نہرو میموریل میوزیم و لایبریری میں مسلمانوں سے میٹنگ کے لیے کی تھی جس میں آر ایس ایس کے جوائینٹ جنرل سکریٹری کرشن گوپال شریک ہوئے تھے، یہ تنظیم کہنے کو حکومت میں شامل نہیں ہے لیکن حقیقت کیا ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں ہے، اسی پروگرام میں کہا گیا تھا

کہ ہمیں مسلمانوں کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ہمارا ووٹر نہیں ہے،ایک دوسرے صاحب نے میگزین ’دی کاروان، ہندی‘‘ کے شاہد تانترے سے ایسی بات کہی جس نے بہت کچھ واضح کر دیا ،انہوں نے یقینی طور پر رام مندر کے حق میں فیصلے کی بات کہی جب تعجب کا اظہار کیا گیا تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہا ’’سپریم کورٹ کی کیا اوقات ہے یار سرکار کے سامنے‘‘۔یہ پوری رپورٹ ویب میگزین پر دیکھی جاسکتی ہے۔

بابری مسجد کے بعد مسلمانوں کو اس طرح کے واقعات کو بھی ذہن میں رکھ کر نئے منصوبے تیار کرنے ہوں گے۔فیصلے سے یقینا مسلمانوں کو دھچکا لگا ہے لیکن ایسے حالات کو بھی اگر متحدہ بیداری کا ذریعہ بنالیا جائے تو کیا برا ہے،رام مندر کے حق میں فیصلہ کو اگر بیداری کا اعلامیہ بنالیا جائے تو مستقبل کے اندیشوں سے بھی نجات مل سکتی ہے،حالات کو بھی سازگار بنایا جاسکتا ہے اور نئی منفی فکر سے بھی قوم کو بچایا جاسکتا ہے۔تعلیمی منصوبے سے بہتر کوئی منصوبہ نہیں ہوسکتا ہے۔قوم کے اہل حل وعقد کو حالات کو سمجھنا ہوگا اور طویل مدتی منصوبے کے ذریعہ ایک ایسا ذہن تشکیل دینا ہوگا جو ماضی کی طرح مستقبل میں بھی حب الوطنی اور ملک میں امن وامان کو اولیت دینے کے ساتھ اپنے حقوق کے تیئں فکر مند بھی ہو۔جب تعلیم ہوگی تو ان کو اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کا علم ہوگا،ان کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے ایک ووٹ کی کتنی اہمیت ہے،منتشر اور متحد ووٹ میں کتنا فرق ہوتا ہے،اس لیے اس سطح پر نئے سرے سے منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔

## ”ان مسلمان ہر تجنن پر کوٹن ہندو واریئے‘

ہندستان کی سب سے قدیم زبان سنسکرت مانی جاتی ہے جس کو دیو بانی بھی کہا جاتا ہے،لیکن سنسکرت کبھی عام زبان نہیں بن سکی جس کی سب سے بڑا سبب زبان پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر برہمنوں کا بیٹھنا اور اس کی عمل داری میں کسی کو داخل نہ ہونے دینا ہے،اس وقت بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبہ مذہبی تعلیمات میں ایک مسلم کی تقرری کی وجہ سے ایک نئ بحث چھڑ گئ ہے، حالانکہ یہ دیو بانی صدیوں پہلے اپنی اہمیت کھو چکی ہے،اس کے باوجود اس زبان کو یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے تا کہ زبان کو بچایا جاسکے۔بادی النظر میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلبا کا مطالبہ اور ان کا مظاہرہ جائز محسوس ہوتا ہے کہ ایک مسلم شخص 'ہندو کرم کانڈ' یعنی مذہبی امور کی انجام دہی کیسے سکھا سکتا ہے،لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے،چونکہ اس ٹیچر کا تقرر مذہبی امور کے شعبہ میں ہوا ہے اس لیے اس کی مخالفت کی جارہی ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ ان کا تقرر تو ضرور شعبہ مذہبی امور میں ہوا ہے لیکن ذمہ داری سنسکرت ادب کی مذہبی کتب پڑھانے کی ہے،اگر آپ اس شعبے کا نصاب دیکھیں تو بخوبی اندازہ ہوجایے گا کہ وہ مذہبی امور کی نجام دہی کے بجائے کمار سنبھوم اور رام چرترم پڑھائیں گے۔مظاہرہ کرنے والے لوگ اس بات کو چھپا کر مذہبی تناظر کو سامنے رکھ رہے ہیں جس سے عوام کو محسوس ہوتا ہے کہ اس مسلم ٹیچر کی تقرری غلط ہوئی ہے، چونکہ یونیورسٹی انتظامیہ کو معلوم ہے کہ انہوں نے جس شخص کا تقرر کیا ہے وہ نہ صرف بہتر شخص ہے بلکہ ضابطوں کے مطابق اس کی تقرری ہوئی ہے اس لیے وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی صدارت میں قائمہ کمیٹی کی اسکریننگ کے بعد ہی یہ تقرری عمل میں آئی ہے اس لیے اتنا آسان بھی نہیں ہے کہ اس مسلم ٹیچر کو محض مذہبی بنیادوں پر ہٹایا جاسکے۔یہی وجہ ہے کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کا ماحول اس وقت تناؤ سے پر ہے۔دھیرے دھیرے یہ لبرل اور تنگ خیال طلبا میں ٹکراؤ کی طرف بڑھ رہا ہے جسے مذہب کے پردے میں سیاسی لوگ ہوا دے رہے ہیں،آج کے حالات میں اس کے عواقب کو صرف یونیورسٹی کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے

دو قوموں کے مابین خلیج کے طور ہر دیکھنا چاہئے۔

زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ جو لوگ جو زبان بولتے ہیں یا جس زبان میں لوگوں کو ان کے مذہبی مقتدا تعلیم دیتے ہیں، دھیرے دھیرے وہ زبان اسی مذہب سے وابستہ کردی جاتی ہے،اس میں کسی بھی طرح سے زبانوں کا اپنا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ ہندستان کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو عربی وفارسی کو مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا گیا ہے حالانکہ فارسی پارسیوں کی زبان تھی، اسی طرح گورمکھی اور شاہ مکھی کو سکھوں سے وابستہ کردیا گیا جبکہ پالی اور پراکرت بودھوں کی مذہبی زبان کہی گئی اور سنسکرت کو ہندوؤں کی مذہبی زبان بتایا گیا،جس کا سبب اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ابتدائی ایام میں ان ہی زبانوں کے توسط سے مذہبی تعلیمات عام کی گئی تھیں اور ان ہی زبانوں میں اس وقت مذہب کے اصول وضوابط قلم بند کیے گیے تھے،سوچیں اگر سنسکرت کی جگہ عربی ہوتی اور شاہ مکھی کی جگہ فارسی ، فارسی کی جگہ سنسکرت ہوتی تو کیا اس سے کچھ فرق پڑ جاتا؟ ہر ایک کا یہی جواب ہوگا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اس وقت وہی زبان اس مذہب کی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ ہوتی، ایسے میں یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ کسی بھی زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور خاص مذاہب کی تعلیمات کسی خاص زبان میں زیادہ مہیا ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اس کو اسی مذہب سے متعلق کردیا جاتا ہے،اس لیے ضروری ہے کہ زبانوں کے اس تناظر کو دیکھا جائے۔

ہندستان ایک سیکولر ملک ہے، یہاں کی تعلیم گاہوں اور دیگر وسائل پر سب کا برابر حق ہے، جس میں کسی بھی طرح کا کوئی بھید بھاؤ نہیں کیا جاتا ہے اور اگر ایسا کچھ ہوتا ہے تو عدلیہ آئین کی روشنی میں انصاف کرکے حق دار کو اس حق دلاتی ہیں۔اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ زبان کو اس کے اپنے وسیع تناظر میں دیکھا جائے اور کسی بھی زبان کو مذہب سے وابستہ نہ کیا جائے، اس سے زبان اور کلچر دونوں کے فروغ میں رکاوٹیں درپیش آتی ہیں اور پھر وہ زبان آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف کا سفر شروع کردیتی ہے۔پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ زبان، ادب اور اس کا کوئی

خاص پہلو/تناظر سب الگ الگ ہیں، بنارس ہندو یونیورسٹی کے معاملے میں سنسکرت زبان کا تعلق مذہبی تناظر سے ہے، نومقرر ٹیچر کو وہ زبان اور کتابیں پڑھانا ہے جن کا تعلق مذہبیات سے ہے، اس لیے یہ ان لوگوں کا مطالبہ مذہبی تعصب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ تقرری یو جی سی کے ضابطوں کے مطابق ہوئی ہے، جب تک امیدوار نے یو جی سے کے معیارات کو نہیں پورا کیا ہوگا، اے پی آئی سسٹم پر وہ کھرے نہیں اترے ہوں گے اس وقت تک ان کو انٹرویو میں ہی نہیں بلایا گیا ہوگا، اگر تقرری میں اصول وضوابط پر عمل نہیں کیا گیا ہے تو اس کی جانچ ہو سکتی ہے، اس پر گفتگو اور مباحثہ و مواخذہ بھی ہو سکتا ہے لیکن صرف مسلمان ہونے کی بنا پر ان کے ساتھ جانبداری نہیں برتی جا سکتی ہے۔ ہمارے آئین نے سبھی کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع دیئے ہیں کسی کو کسی پر کسی بھی شعبہ میں فوقیت کسی بھی بنا پر نہیں دی ہے جبکہ یونیورسٹی میں مظاہرہ کرنے والے طلبا فوقیت کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کا ماننا ہے کہ اس فیکلٹی میں صرف وہی پڑھا سکتا ہے جو ہندو ہو اور گروکل طریقہ تعلیم سے پڑھ کر آیا ہو، کچھ طلبا نے تو آن اسکرین مذہبی امور کے حوالے کے ساتھ ذات برادری کو ہندو مذہب کا جز لاینفک قرار دیتے ہوئے کہا کہ 'ورن سسٹم' کو ملک میں برقرار رہنا چاہیے، جس. سے ان کے شعور، سوچ اور فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے چونکہ ماضی میں سنسکرت سے نیچی ذاتوں کو دور رکھ کر اس پر پوری طرح سے اپنی عمل داری برقرار رکھی تھی، اس لئے وہ آج بھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کوئی ان کی عمل داری میں دخل دے۔

عربی ادب میں ایک کتاب 'کلیلہ دمنہ' ہے، جو پنچ تنتر کا ترجمہ ہے یہ کتاب سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کی گئی ظاہری بات ہے عبداللہ ابن مقفع نے بغیر سنسکرت جانے تو اس کا ترجمہ نہیں کر لیا ہوگا، اسی طرح سے مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی بہت سے مسلمان تھے جو نہ صرف سنسکرت سے شغف رکھتے تھے بلکہ ان کی شناخت بھی یہی زبان ہے سید عبدالرحیم 'رسکھان' کو کون نہیں جانتا؟ خالص سنسکرت میں اشلوک کے علاوہ ویدک جیوتش پر دو کتابیں 'کھیٹکو تکم' اور ''دداترشد ھوگا وَلی''، لکھیں، ایسے ہی لوگوں کے لیے بھارتیندو ہریش چند نے کہا

تھا ''ان مسلمان ہر تجنن پر کوٹن ہندو وار یئے'' اتنا ہی نہیں اورنگ زیب عالمگیر پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کا سخت مخالف ہی نہیں تھا بلکہ اس نے ہزاروں کا سر قلم کیا، مندر توڑے لیکن یہ الزام لگانے والے یہ نہیں بتاتے کہ اس نے اس زبان کو نقصان کیوں نہیں پہنچایا، اس زبان میں لکھی کتابیں دریا برد کیوں نہیں کرائی، ان میں آگ کیوں نہیں لگوائی جبکہ ماضی میں اس طرح کا قوموں کا رشتہ زبان سے کاٹ کران کو نہ صرف ماضی سے دور کیا گیا بلکہ دھیرے دھیرے ان کو ان کی تہذیب و ثقافت سے بھی دور کردیا گی جس کی سب بدترین مثال اسپین ہے، یہاں کبھی عربی بولی جاتی تھی لیکن اب اس کے نام نشان بھی نہیں ہیں، لیکن اورنگ زیب نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ تو سنسکرت سے محبت کرنے والا شخص تھا۔ ایک بار ان کے بیٹے محمد معظم نے بادشاہ کو آم بھیج کران کا نام رکھنے کی گزارش کی تو بادشاہ اورنگ زیب نے آموں کا نا 'سدھارس' اور 'رسناولاس' نام رکھا جو خالص سنسکرت ہیں۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، زبان کے معاملے میں وہ کس قدر لبرل اور غیر متعصب تھے۔

موہن داس کرم چند گاندھی جی نے 20 مارچ 1927 کو ہردیوار کے گروکل کا گڑی اور 7 ستمبر 1927 کو مدراس کے پچیپا کالج میں کہا تھا کہ سنسکرت کو پڑھنا صرف بھارت کے ہندوؤں کا ہی حق نہیں بلکہ مسلمانوں کا بھی کرتو یہ (فرض) ہے، لیکن اب بھلا گاندھی کو تعصب کی عینک والے کہاں پسند کرتے اور سنتے ہیں، ٹھیک ہے مت سنئے مگر بنارس ہندو یونیورسٹی کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ کی ہی سن لیجئے، یوورسٹی کی ویب سائٹ پر ان کی تصویر کے ساتھ ان کا پیغام آویزاں ہے، یہ وہ پیغام ہے جو ہر ہندستانی اور خاص طور بی ایچ یو کے متعلقین کو وہ دینا چاہتے ہیں ''ہندستان صرف ہندوؤں کا ملک نہیں ہے بلکہ یہ مسلم، عیسائی اور پارسیوں کا بھی ملک ہے۔ ملک اسی وقت ترقی اور طاقت حاصل کرسکتا ہے جب مختلف طبقات کے لوگ آپسی محبت اور بھائی چارہ کے ساتھ زندگی گذاریں گے۔ یہ میری خواہش اور دعا ہے کہ روشنی اور زندگی کا یہ مرکز جو وجود میں آرہا ہے وہ ایسے طلبا مہیا کرے گا جو شعوری سطح پر دنیا کے دوسرے بہترین طلباء کے برابر

ہوں گے بلکہ ایک اعلی وارفع زندگی گذاریں گے اور اپنے ملک سے پیار کریں گے"۔اب طلبا، بی جے پی کی ترجمان اور ان بزعم خود مسلم دانشوروں کو کو اپنا گریبان جھانکنا چاہیے جو 'شیلا پٹ' کا حوالہ دے کر عوام کا ذہن پراگندہ کر کے ملک وقوم اور خود سنسکرت کا نقصان کر رہے ہیں، ان کا اگر یہی رویہ رہا تو غیر قومیں سنسکرت کی طرف رخ نہیں کریں گی جس سے ادب، تہذیب اور متنوع ثقافت جو ہندستان کی شناخت ہے اس کا نقصان ہوگا۔

# ایسے نہیں بدل سکتی فلسطین کی تقدیر

پھول جیسے بچوں کی گولہ و بارود سے مسخ لاشیں اگر کسی کو اٹھانا پڑ جائے تو سوچئے اس کے دل پر کیا بیتے گی، ان ماؤں کا جگر کیسا ہوگا جو اس کو برداشت کرتی ہوں گی، سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن میں جھرجھری پیدا ہو جاتی ہے۔لیکن دنیا میں ایک علاقہ ایسا بھی ہے جہاں یہ روز کا معمول ہے، ہر صبح اور ہر شام ان کی ایسے ہی گزرتی ہے جب وہ اپنے جگر گوشوں کی چِھتڑا لاش ہاتھوں میں اٹھاتے ہیں اور جا کر زمین میں دبا دیتے ہیں، ان کی آنکھوں سے اتنا آنسو بہہ چکا ہے کہ آنسو بھی نہیں نکلتے، بس آہ و بکا ہوتی ہے، کوئی کب تک روئے اور کتنا روئے۔یوں تو ان کی ہر صبح اور ہر شام خون آشام گزرتی ہے، لیکن چند دنوں قبل جو ہوا اس نے انسانیت پر بدنما داغ لگا دیا۔وسط غزہ میں واقع دیر البلح کے لوگ جب رات میں سوئے تو یہ نہیں معلوم تھا کہ صبح اتنی بھیانک ہوگی، جب ان کو ایک ہی گھر سے آٹھ چھتڑا لاشیں نکالنا پڑیں گی۔اسرائیل فسلطینیوں کا وہ شقی القلب دشمن ہے جو ان کی نسل کشی کو اپنا حق تصور کرتا ہے، اس نے اپنے اس حملے میں پانچ بچوں اور دو خواتین سمیت آٹھ بے گناہوں کو موت کی نیند سلا دیا جبکہ 38 افراد زخمی ہوئے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ خبر ٹی وی اور اخبار کہیں بھی دکھائی نہیں دی جس کی سب سے بڑی وجہ میڈیا پر اسرائیل اور یہودیوں کا کنٹرول ہونا ہے۔وہ اپنے مظالم کو دنیا کے سامنے آنے نہیں دیتے اور اگر ان کے پیر میں کانٹا چبھ جائے تو چیخ چیخ کر دنیا کے سامنے ایسا بیان کرتے ہیں گویا وہ کانٹا نہیں جان لیوا حملہ ہے۔یہ میڈیا پر ان کے کنٹرول کا ہی کمال ہے کہ دنیا اسرائیلیوں کے بجائے فلسطینیوں کو دہشت گرد سمجھتی ہے ہندستان کے اخبارات ہی فلسطینیوں کو دہشت گرد لکھتے ہوئے نہیں شرماتے، دو دن قبل ہی ایک اخبار نے لکھا کہ فلسطینی دہشت گردوں کو اسرائیلی فوج نے مارا۔اسرائیل نے دنیا کو اپنے بھونپو کے ذریعہ یہ باور کرا رکھا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے سب اپنے تحفظ کے لئے کر رہا ہے کیونکہ اس کو فلسطین سے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے، اس کو ایک ایسی ریاست سے خطرہ رہتا ہے جس کے پاس کوئی اپنی فوج اور فوجی طاقت نہیں جبکہ خود اسرائیل

دنیا کی طاقت ور فوج کا حامل ہے، اس کو ایسی ریاست سے خطرہ رہتا ہے جس کی چاروں طرف سے ان خود نا کہ بندی کر رکھی ہے، اس کا پورا کنٹرول اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے، اس کی آراضی پر زبردستی وہ اپنی بستیاں بسا رہا ہے، اس ریاست کے بچوں اور عورتوں کو اپنے جیلوں میں ٹھونسے ہوئے ایسی ریاست سے اس کو خطرہ رہتا ہے، اسی لئے وہ شہریوں پر جب چاہتا ہے حملہ کر دیتا ہے۔ عالمی میڈیا پر اس کو اتنا زبردست کنٹرول ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی خبر باہر نہیں آسکتی ہے، وہ تو بھلا ہو سوشل میڈیا کا کہ اس کے ذریعہ فلسطینی اپنی آواز دنیا تک پہنچا رہے ہیں لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ کل بھی وہ مر رہے تھے اور آج بھی وہ مر رہے ہیں، شاید ان کا مقدر مرنا ہی ہے۔

ایک ہفتہ قبل اقوام متحدہ میں شمالی کوریا، مصر اور زمبابوے کی جانب سے ایک بل ''The Right of the pelestinian people to Self Determination'' پیش کیا گیا، جس کے حق میں 166 ممالک نے ووٹنگ کی، جس میں ہندستان بھی شامل ہے، ہندستان نے ہمیشہ فلسطین کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا، کیونکہ وہ اہنسا کا مبلغ ہے، لیکن دوسری طرف امریکہ میں مقرر قونصل جنرل سندیپ چکرورتی نے جو بیان دیا ہے اس نے ہندستان کے دوسرے چہرے کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندستان کو کشمیر میں اسرائیل ماڈل اختیار کرنا چاہئے، کشمیری پنڈتوں کی آبادکاری کے تعلق سے اسرائیل کے ناجائز قبضوں کی ایک طرف ہندستان مخالفت کرتا ہے تو دوسری طرف ایک اعلیٰ افسر اس کو ماڈل قرار دیتا ہے جو افسوسناک ہی نہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے، ان کے اس عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاغذی خانہ پری کے لئے ہی اقوام متحدہ میں اس طرح کی ووٹنگ کی جاتی ہے ورنہ زمینی حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ کہنے کو تو فلسطین کے حق خود ارادیت کو تسلیم سب کرتے ہیں، اقوام متحدہ میں تو سب ایک ساتھ کھڑے ہو کر فلسطینی عوام کے دکھ درد پر آنسو بہاتے ہیں، بحث و مباحثہ کرتے ہیں لیکن ان کے یہ آنسو گھڑیالی ہوتے ہیں، حقیقت تو تب تسلیم کی جائے گی جب اسرائیل کو مجبور کیا

جائے کہ وہ عوام پر ظلم و جور کو بند کرے، لیکن اس سطح پر کوئی تیار نہیں ہوتا ہے بلکہ ہندستان کا ایک اعلیٰ افسر اسرائیل کو ماڈل مان کو کشمیر میں اس کے نفاذ کی بات کر رہا ہے۔

اسرائیک نے ہمیشہ اس طرح کے بل اور رزیولیشن کو جوتے کی نوک پر رکھا ہے، اس کو معلوم ہے کہ امریکہ کے ویٹو کے ذریعہ وہ جس طرح ہمیشہ بچتا رہا ہے آئندہ بھی بچ جائے گا۔ لیکن اسرائیل، امریکہ اور ان سبھی پانچ ویٹو پاور حاصل ممالک کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسرائیل کو مسلسل بچانے کی پالیسی سے ان کی جمہوریت کا خول اتر رہا ہے اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ کس طرح سازشوں کے ذریعہ دنیا میں جمہوریت کا ڈرامار چاجا رہا ہے۔ دنیا کو یہ بھی پتہ چل رہا ہے کہ اقوام متحدہ صرف طاقتوروں کے مفاد کی حفاظت کے لئے ہے، اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو فلسطین گذشتہ ستر برسوں سے لاشیں نہ اٹھا رہا ہوتا بلکہ اسرائیل کی ناک میں اب تک نکیل پڑ چکی ہوتی اور انسانیت کے ساتھ ہی جمہوریت بھی شرمسار ہونے سے بچ جاتی، مگر اس کی فکر کسی کو نہیں ہے اگر فکر ہے تو صرف اپنے مفادات کی۔

یہ کس قدر بے شرمی کی بات ہے کہ امریکہ اب ببانگ دہل اسرائیل کی ناجائز بستیوں کو جائز ٹھہرا رہا ہے، امریکی وزیر خارجہ مائک پومپیو نے محکمہ خارجہ میں 18 نومبر کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ''ٹرمپ انتظامیہ قانونی مباحث کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ غرب اردن میں قائم اسرائیلی بستیاں بین الاقوامی قانون سے متصادم نہیں ہیں'' امریکی وزیر خارجہ کا یہ بیان چار دہائیوں سے اختیار کردہ اس کے موقف سے انحراف ہے، اس سے قبل وہ قبضہ کی گئی آراضی پر آباد بستیوں کا ناجائز تصور کر رہا تھا، اس نے اعلان کیا تھا کہ فلسطینی آراضی پر زبردستی قائم بستیاں بین الاقوامی قوانین کے منافی ہیں۔ امریکہ کی اس طرح سے ایک ظالم کی پشت پناہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود نہیں چاہتا ہے کہ فلسطین میں امن قائم ہو۔ دوسری وجہ وہ عرب ممالک ہیں جن کے اہل حل وعقد کرسیوں سے جمے رہنا چاہتے ہیں، ان کو لگتا ہے کہ اگر انہوں نے اسرائیل کی مخالفت اور فلسطین کی حمایت کی تو ان کی کرسی چلی جائے گی۔ ان کا یہ خوف

ان کو آگے نہیں بڑھنے دیتا ہے۔

عرب ممالک کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے مشترکہ پلیٹ فارم کی تنظیم "عرب لیگ" امریکی موقف کے خلاف بیان جاری کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتی۔اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ امریکہ کو کسی بھی طرح کی دھمکی تک دے سکے۔اس تنظیم کا کام ہی صرف اتنا بچا ہے کہ فلسطین سے متعلق معاملے کی زبانی حمایت یا مخالفت کرے۔چند دنوں قبل اسرائیل نے وسط غزہ میں جو حملہ کیا،اس پر تو یہ ایک لفظ بولی تک نہیں،ان کو خود لگتا ہے کہ فلسطینی صرف مرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔

یو این او میں فلسطینی حق خود ارادیت کے حق میں ووٹنگ اور عرب لیگ کی امریکی موقف کی مخالفت زبانی جمع خرچ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے،اگر حقیقت میں دنیا کو فلسطینیوں سے ہمدردی ہے تو انہیں عملی قدم اٹھانا چاہئے ورنہ صرف صرف زبانی جمع خرچ قوموں کی تقدیریں نہیں بدلتی ہیں بلکہ اس کے لئے عملی اقدام سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے اور اسی میں تقدیروں کا الٹ پھیر مضمر ہے۔یہ تو سب کو معلوم ہے کہ جب ظلم حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو اس ظلم کی کوکھ سے ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کی شقاوت صدیوں تک یاد کی جاتی ہیں جس کے ذمہ دار وہ لوگ خود نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ ماضی ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی ایسی نفسیات تشکیل پاتی ہے،اس لئے ایسی کسی بھی منظرنامے سے قبل مثبت پیش رفت ہونی ہی چاہئے۔

# کشمیر میں اسرائیلی ماڈل

پھولوں اور مرغزاروں کا چمن کشمیر زخمی ہے، درد اس قدر شدید ہے کہ کراہ کی آواز بھی نہیں نکل رہی ہے۔یونیورسٹی میں جب کسی کشمیری دوست سے ملاقات ہوتی ہے اور اس سے کشمیر سے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو وہ حسرت ویاس کا نشان بن جاتا ہے، ان کے منھ سے بس ایک ہی جملہ نکلتا ہے کہ ہر طرف سے تباہ، ہم ہی ہو رہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ہمارا اس دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ایسے موقع پر سوائے خاموشی کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا ہے۔اس حسرت ویاس اور خاموشی میں جو کرب پنہا ہے اسے بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔

کشمیر چار ماہ کا عرصہ گذرنے کے باوجود اب بھی خاموش ہے، کشمیریوں کی کوئی آواز وادی سے باہر نہیں سنائی دے رہی ہے، ان بچوں کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے جو گرفتار کئے گئے تھے ہر طرف خاموشی لی خاموشی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے وہ لوگ بھی خاموش ہیں جن کے بارے میں حدیث نبوی ہے "المسلم اخو المسلم" کم از کم احتجاجی سطح پر تو آواز اٹھانا ہی چاہئے تھا اور سرکار سے سوال کرنا چاہئے تھا کہ آخر ہم کو ان تک اور ان کو ہم تک کیوں نہیں پہنچنے دیا جا رہا ہے ،ان کی آواز کی دبائی جا رہی ہے، لیکن اس طرح کے حقوق انسانی کے سوالات کرنا تو دور، مستزادیہ ہے کہ حکومتی اقدام کی توثیق ملکی اور غیر ملکی سطح پر کی گئی۔ملک سے محبت کو جزو ایمان کہا گیا ہے، یہ مقولہ ہے یا حدیث ہمیں اس سے مطلب نہیں لیکن حب الوطنی ہماری خمیر میں ہے، جب ہندستان کی دوسری قومیں سو رہی تھیں اور ملک عزیز جبر واستبداد کی غیر ملکی آہنی بیڑیوں میں کراہ رہا تھا تو بزرگان دین ہی سر بہ کفن ہو کر نکلے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حقوق انسانی کی پامالی پر خاموش رہا جائے۔

اسی خاموشی کا نتیجہ ہے کہ اب کشمیر میں اسرائیلی ماڈل اختیار کرنے کی بات شروع ہو گئی ہے، امریکہ میں کونسل جنرل سندیپ چکرورتی نے ایک ہفتے قبل جس طرح سے حکومت ہند کو مشورہ دیا کہ کشمیر میں اسرائیل ماڈل اختیار کیا جانا چاہئے وہ حیرت زدہ کرنے والا ہے۔عموماً آئی

ایف ایس افسران ملکی معاملات سے خود کو دور رکھ کر غیر ممالک میں ملک کی خدمات انجام دیتے ہیں، وہ جس ملک میں بھی تعینات ہوتے ہیں وہاں وہ ہندستان کے نمائندہ ہوتے ہیں، ان سے اس بات کی امید نہیں کی جاتی کہ وہ ملک کے اندرونی معاملات میں دخل کی کوشش کریں۔ اس کلیہ کو درکنار کرتے ہوئے آئی ایف ایس افسر سندیپ چکرورتی نے کشمیری پنڈتوں کے پروگرام میں کشمیر میں اسرائیل ماڈل اختیار کر کے کشمیری پنڈتوں کو وہاں دوبارہ بسانے کی بات کہی۔ کسی کو بھی اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ کشمیریوں کی باز آبادکاری ان کے اپنے آبائی مکان/علاقہ میں ہونا چاہئے۔ کانگریس سمیت بھاجپا کی مرکزی حکومت سے متعدد بار یہ سوال کیا جاچکا ہے کہ آخر وہ کشمیری پنڈتوں کی باز آبادی کیوں نہیں کر رہی ہے، کون سی طاقت ہے جو ان کو اس عمل سے روک رہی ہے؟ اس پر آج تک کوئی جواب نہیں ملا، اس کے برعکس وہ دوسرے بھی کام سیاسی پارٹیوں نے کئے جس سے ان کا ووٹ بینک مضبوط ہوسکے۔ کشمیری پنڈتوں اور ملک کے عوام کو حکمراں پارٹیوں سے اس بابت نہ صرف سوال کرنا چاہئے بلکہ ان کا ناطقہ بند کردینا چاہئے کیونکہ یہ ان کا حق ہے کہ ان کو ان کے آبائی علاقوں میں بسایا جائے۔ لیکن جس طرح سے ایک اعلی افسر نے اپنے ارادوں کا اظہار کیا ہے اس نے پیشانی پر بل ڈال دیا ہے۔ کشمیر میں یوں بھی حقوق انسانی کی خلاف ورزی کی باتیں ہورہی ہیں، برطانیہ سمیت امریکی کانگریس بھی اس معاملے کو اٹھا چکی ہے، لبرل اور جمہوری اقدار کے حامل افراد حکومت کے اس قدم کی تنقید کر رہے ہیں، ایسے میں ایک اعلی افسر نے جو بیان دیا ہے وہ اس بات کو مزید پختہ کرتا ہے کہ کشمیر میں حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہورہی ہے کیونکہ جس ماڈل کو اختیار کرنے کی انہوں نے وکالت کی ہے وہ دنیا کا سب بدنام ماڈل اور بدنام پالیسی ہے۔

اسرائیل فلسطینیوں کے خلاف ہمیشہ کریک ڈاؤن کو روا رکھتا ہے، وہ شہری بستیوں پر بم گرانے کو برا تصور نہیں کرتا ہے، فلسطینیوں کو ان کی زمینوں اور مکانوں سے بے دخل کرنے کے لئے ہر وہ حربہ اختیار کرتا ہے جس سے اس کے مکیں وہ علاقہ چھوڑ کر چلے جائیں، ان کی کاشت تاراج کرنے کے ساتھ ہی کسی کو کسی بھی وقت گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ اسرائیلی فوج سب سے زیادہ

چھوٹے چھوٹے بچوں پر تشدد کو روا رکھتی ہے، وہ ان بچوں کو انسان کے بجائے سنپولیا سمجھتی ہے ،اسی طرح سے وہ خواتین کو بھی شکوک وشبہات کی بنا پر پابند سلاسل کرنے کو برا تصور نہیں کرتا ہے بلکہ یہ سب عام باتیں ہیں۔اسی طرح سے اسرائیل فلسطین اور اردن کی غصب کردہ زمین پر بستی بسانے کو بھی جائز تصور کرتا ہے اگر چہ وہ بین الاقوامی قوانین کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔فلسطین کے چپہ چپہ پر اسرائیل نے فلسطینیوں کا خون بہایا ہے۔یہ اسرائیل کا وہ ماڈل جسے اختیار کرنے کا مشورہ دیا جارہا ہے۔

حکومت کا ایک اعلی افسر اگر مندرجہ بالا ماڈل کو اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے تو یہ نہایت خطرناک ہے، اس سلسلے میں حکومت کو اپنے موقف کی وضاحت کرنا چاہئے ،اس کو بتانا چاہئے کہ وہ آج بھی اہنسا کو ہی اپنا بنیادی فلسفہ مانتی ہے، یا پھر وہ ایریل شیرون کے ماڈل کو اپنا منشور سمجھتی ہے؟ہمیں یقین ہے کہ گاندھی کی سرزمین کبھی اسرائیلی ماڈل کو اختیار نہیں کر سکتی ہے، اس سے جانوں کا ضیاع ہوتا ہے اور انسانیت پامال۔شاید افسر اعلی نے حکومت کو یہ مشورہ صرف اس لئے دیا ہے کہ بھاجپا اور اسرائیل دونوں کی آئیڈیالوجی ایک ہے، جو اپنے نظریات میں شدت کی حامل ہیں اور دونوں کا بنیادی نظریہ نہ صرف قدامت اور احساس برتری کا ہے، مسلم مخالفت میں بھی دونوں ایک ہی راہ کے راہی ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ اسرائیل فلسطین میں ہر طرح کے ظلم وجور کو روا رکھتا ہے کیونکہ وہاں کے غالب عوام اس کے ساتھ ہیں جبکہ ہندستان چونکہ اہنسا کا مبلغ رہا ہے اس لئے نظریاتی مخالفت کے باوجود یہاں کے عوام کسی کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ملک کے کسی بھی حصے میں اسرائیلی ماڈل کو اختیار کر سکے۔آج بھی ہندستان میں سیکولر اور لبرل نظریات کے حامل افراد کی اکثریت ہے جو سینہ تان کر اقلیتوں کے حقوق کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں ،دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو نظریاتی سطح پر متشدد افراد کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ قالب سے باہر نہ آئیں، حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ہندستان کا جمہوری نظام بچا ہوا ہے۔

حکومت زبانی طور پر کشمیریوں سے اظہار ہمدردی کرتی ہے مگر وہ وہاں کے حالات کے بارے میں کھل کر نہیں بولتی بلکہ اس کے رویے کی وجہ سے پورے ملک اور سماج میں کشمیر سے متعلق ڈر اور خوف ہے جو اس کے خود ساختہ حب الوطنی کے بیانیے کی وجہ سے ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی اس حساس معاملے پر بولنے کو تیار نہیں ہے، لوگ یا تو خاموشی کو بہتر تصور کرتے ہیں یا پھر حکومت کے موقف اور اس کے اقدام کی حمایت میں، جس کی سب سے بڑی وجہ وہ خوف اور ڈر ہے جو حب الوطنی کے نام پر سماج میں پھیلایا گیا ہے، کوئی بھی مسلم زبان پر کشمیر کا نام لاتے ہوئے صرف اس لئے ڈرتا ہے کہ پتہ نہیں اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہو، جو ایک آزاد اور جمہوری ملک میں اس طرح کے خوف کی وبا کا عام ہونا نیک فال نہیں ہے، اس سے ملک کو طاقت نہیں ملتی ہے بلکہ اس سے اندر ہی اندر گھٹن پیدا ہوتی ہے جو بعد میں چل کر ملک و سماج سب کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ حکومت کو خود آگے بڑھ کر کشمیر کے عوام کو اس بات کی اجازت دینی چاہئے کہ وہ اپنے مسائل اور اپنی بات دنیا کے سامنے رکھ سکیں لیکن اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ان کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

حکومت کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ جو کشمیر ایک برہان وانی کے لئے ابل پڑتا تھا وہ آج خاموش کیوں ہے؟ اس کہ تہہ میں کیا چل رہا ہے؟ ان کی اس خاموشی کے معنیٰ کیا ہیں؟ دنیا کی کوئی بھی حکومت صرف طاقت کے زور دیر پا قیام نہیں حاصل کر سکی ہے بلکہ ایسی حکومتیں اپنے بدتر سلوک کے لئے پوری دنیا میں نہ صرف بدنام ہوتی ہیں بلکہ اس کی وجہ سے پوری قوم مطعون قرار دی جاتی ہے، اس لئے مرکزی حکومت کو اس جانب توجہ ضرور دینی چاہئے تا کہ کشمیر کی خاموشی ٹوٹے اور وہاں کی زندگی دوبارہ پھر رواں دواں ہو۔

# مسلم قیادت کی اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی

ہر تنظیم اور ادارے کا ایک فکری پس منظر ہوا کرتا ہے، جس کے مطابق ایجنڈے بنائے جاتے ہیں جن کے نفاذ کے لئے منصوبہ بند طریقے سے آگے بڑھا جاتا ہے، آر ایس ایک ایسی تنظیم ہے جس کے ایجنڈوں سے کوئی بھی نابلد نہیں ہے، سب کو یہ بھی معلوم ہے کہ بھاجپا آر ایس ایس کی سیاسی ونگ ہے، اس نے اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے ہی اس ونگ کا قیام کیا تھا اور دھیرے دھیرے وہ اپنے مقاصد حاصل بھی کررہی ہے۔ مرکزی حکومت کا پے درپے یہ تیسرا ایسا بل ہے جو آر ایس ایس کے ایجنڈے کے مطابق بڑی حصولیابی ہے۔ تین طلاق کے بعد کشمیر سے دفعہ 370 کا خاتمہ اور پھر اس کے بعد اب شہریت ترمیمی بل دونوں ایوان سے پاس ہوکر اس پر صدر جمہوریہ نے دستخط کرکے قانونی حیثیت دے دی ہے۔ یہ تینوں بل جہاں عوامی جذبات کے خلاف ہیں وہیں ملک کے قانون سے بھی متصادم ہیں، اس کے باوجود حکومت نے اس کو پاس کیا اور صدر جمہوریہ نے اس پر دستخط کئے کیونکہ ارباب حکومت کی نظر میں صرف حکومت اور آئین نہیں ہے بلکہ ان کے سامنے ان کے اپنے ایجنڈے ہیں جس کے لئے وہ 95 برس سے عملی طور کر کوشاں تھے۔ اس بل کی زد میں یوں تو مشرقی ریاستوں کی تہذیب وثقافت پر بھی آئے گی لیکن سب سے زیادہ اس سے مسلم متاثر ہوں گے اس کے باوجود مسلم قیادت ریگزار میں شتر مرغ بنی ہوئی ہے۔

قیادت کی یہ ذمہ داری ہوا کرتی ہے کہ وہ قوم کی ہر معاملے میں نہ صرف رہنمائی کرے بلکہ ہر معاملے میں وہ سب سے آگے رہے، جب وہ رزم میں قائدانہ کردار ادا کرتی ہے تو بزم میں سب سے اونچی مسند ملتی ہے، لیکن اگر کسی قوم کی قیادت رزم میں ہراول دستے میں سب سے آگے ہونے کے بجائے چھپنے کی کوشش کرنے لگے یا میدان چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرلے تو اس کو مسند ملنے کی بجائے ذلت اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کی قیادت کی روشن تاریخ رہی ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ جلدوں میں ”تاریخ دعوت وعزیمت“ لکھ کر ایسے

قائدین کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ نئی نسل کو روشنی دکھائی ہے، جس میں ہر میدان کے قائدین کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کن نامساعد حالات میں ہمارے بزرگوں نے قوم کی قیادت کی اور ان کی رہنمائی میں بڑے بڑے معرکے سر کئے، یہ معرکے فکری بھی تھے اور مادی بھی، لیکن شاید اس طرح کی کتابیں یا تاریخ صرف پڑھنے کے لئے لکھی گئی ہیں ان سے روشنی حاصل کرنے کے لئے نہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو شہریت ترمیمی بل پیش ہونے کے بعد ہماری قیادت اپنی ذمہ داریوں سے اس طرح راہ فرار اختیار نہ کرتی۔

پارلیمنٹ میں دوران بحث ایک طرف پروفیسر منوج کمار جھا اس بل پر بحث کے دوران یہ کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ ہندستان ایک نئے فلسطین کی طرف بڑھ رہا ہے، وہ اس بل کے ذریعہ ہندستان کو فلسطین بنانے جا رہا ہے جس میں حکومت کا کردار اسرائیل کا ہوگا اور مسلمان فلسطینیوں کی طرح ہوں گے۔ سماجی کارکن ہرش مندر یہ اعلان کرتے ہیں کہ میں اب سول نافرمانی کرتے ہوئے خود کو مسلمان بتاؤں گا۔ دوسری طرف مسلم پرسنل لا بورڈ کہہ رہا ہے کہ شہریت ترمیمی بل کے خلاف احتجاج بورڈ کے دائرہ سے باہر ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جب پورا ملک جل رہا ہے، ہر طرف اس بل کی مخالفت میں ہاتھوں میں مشعلیں ہیں، باضمیر افسر اعلی سرکاری ملازمتوں سے مستعفی ہو رہے ہیں، بنارس ہندو یونیورسٹی جیسے ادارے کے پروفیسر مخالفت میں اپنے سرکاری ایوارڈ واپس کرنے کے اعلان کر رہے ہیں، یونیورسٹیوں کے اساتذہ وطلبا سڑکوں پر ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا ہاسٹلوں میں کھانا ترک کر رہے ہیں، یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طالبات سڑکوں پر نکل کر حکومت وقت کے خلاف نعرے بلند کر رہی ہیں اور مسلم قیادت اعلان کر رہی ہے کہ یہ عمل بورڈ کے دائرے سے باہر ہے۔ ازہر ہند دار العلوم دیوبند کا ایک اعلان سوشل میڈیا پر گشت کر رہا ہے کہ طلبا درس وتدریس میں منہمک رہیں ،کوئی بھی طالب علم باہر نہ نکلے، غیر علمی سرگرمی میں ملوث نہ ہو، اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو ادارے سے اس کا تعلق ختم کر دیا جائے گا۔ اندازہ لگایئے اس بے حسی کا جس کا مسلم قیادت شکار

ہے۔ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ازہر ہند اپنی روشن تاریخ کو دہراتا اور حکومت وقت کو یہ باور کراتا کہ مدارس کا جو جال پھیلا گیا تھا اس کا تعلق صرف درس وتدریس سے نہیں ہے بلکہ ماضی کی طرح قوم کے جیالے پیدا کرنا ہے جو ہر محاذ پر ظلم کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو جائیں گے،اس کو کرنا یہ تھا کہ پورے ہندستان کے مدارس کے ذمہ داران کی قیادت کرتے ہوئے اس ظالمانہ بل کے خلاف ان کو متحد کرتا اور مدارس کے طلبا کو حکومت کے خلاف سڑکوں پر لا کر اس قوم کی طرف سے احتجاج درج کراتا۔

شہریت ترمیمی بل کس قدر خطرناک ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کی زد میں سب سے زیادہ مسلمان ہی آئیں گے اس میں کوئی شک نہیں،جس کی سب سے بڑی وجہ اس بل کا فکری پس منظر ہے۔ہاتھی کے دانت کھانے کے لئے اور ہوتے اور دکھانے کے لئے اور،یہی حال اس بل کا ہے۔کہنے کو تو مظلوموں کے آنسو پونچھنے کے لئے یہ بل لایا گیا ہے لیکن حقیقت میں ساورکر کے دوقومی نظریہ کو عملی شکل دینے کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا ہے،جس کے توسط سے ہندو اور مسلمانوں کے بین خط امتیاز ہی نہیں کھینچا جائے گا بلکہ ہندستانی مسلمانوں کو بغیر کا باشندہ بنانے کے منصوبے کو عملی شل دے دی جائے گی۔اسی لئے پروفیسر منوج کمار جھا ہندستان کو فلسطین بنتا دیکھ رہے ہیں۔یہودی لابی زیر اثر امریکہ میں بھی وزیر داخلہ پر پابندی کی سفارشیں ہو رہی ہیں کیونکہ مسئلہ بنیادی حقوق کی سلبی کا ہے لیکن مسلم قیادت خواب خرگوش میں مبتلا ہے۔اس وقت ملک میں تین سطح پر مظاہرے ہو رہے ہیں،مشرقی ریاستوں میں پر تشدد مظاہرے ہو رہے ہیں وہ سڑکوں پر اس لئے آ گئے ہیں کیونکہ ان کو اپنی تہذیب و ثقافت،زبان اور وسائل و ذرائع کی فکر ہے،یہی وجہ ہے کہ دیما پور یونیورسٹی سمیت متعدد دیگر یونیورسٹیوں کے اساتذہ تک طلبا کے ساتھ میدان میں ہیں،ان کو آنے والی نسلوں کو کی فکر ہے،وہ جانتے ہیں کہ یک ''لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد'' کی حالت میں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ فیصلہ کن لڑائی لڑ رہے ہیں،دوسری سطح پر وہ سماجی کارکن اس بل کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں

جو حقوق انسانی کے لئے لڑتے رہتے ہیں، وہ صاف طور پر دیکھ رہے ہیں کہ اس بل کے نفاذ کے بعد مسلمانوں کے حقوق سلب کر لئے جائیں گے، ان کی زندگی جہنم بن جائے گی، وہ اس ملک کے معزز شہری ہیں لیکن اس بل کی وجہ سے ان کی شہریت ہی خطرے میں پڑ جائے گی، اس لئے وہ سڑکوں پر نکل آئے ہیں اور تیسری سطح سرکاری تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم مسلم طلبا و طالبات ہیں جو ملک کا مستقبل دیکھ رہے ہیں، ان کو نظر آ رہا ہے کہ شہریت ترمیمی بل کے بعد مسلمان ایک اور اسپین سے گذریں گے، عز و شرف کی ان کی قبا پہلے ہی کیا کم چاک تھی اس بل کے بعد تو وہ تار تار ہی نہیں ہوگی بلکہ پوری طرح سے کھینچ لی جائے گی۔

ان تینوں گروہوں کی آواز دبانے کے لئے سرکار نے ٹیلی ویژن چینلوں کو ایڈوائزی تک جاری کر دی ہے کہ ان کے مظاہروں کو کور نہ کیا جائے تا کہ ملک کے عوام تک ان کی آواز نہ پہنچ سکے ،حکومت اظہار رائے کی آزادی پر بھی قدغن لگانے کی کوشش کر رہی ہے، اتنا سب ہونے کے باوجود اگر کوئی خاموش ہے تو مسلم قیادت اور سیاسی پارٹیاں ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اپنی سیاسی وجوہ سے دھرنے و مظاہرے کرتی ہیں، ان کی خاموشی سے ان کی بھی قلعی کھل رہی ہے لیکن مسلم قیادت کی خاموشی انتہائی درجے کی بے حسی کی علامت ہے ۔جمہوریت میں حکومت اور پارلیمنٹ ہی سب کچھ نہیں ہیں، ان دونوں سے زیادہ عوام کی قدر و قیمت ہے، وہ احتجاج کے ذریعہ حکومت کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلے واپس لے لیکن اس کے لئے ثابت قدمی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہاں جب قدم ہی باہر نہیں نکلے ہیں تو پھر ان کے ثابت رہنے کی بات ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔

قوم اس وقت بھی اپنی قیادت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے، وہ انتظار کر رہی ہے کہ کوئی اس کی قیادت کرنے والا سامنے آئے جس کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر وہ اپنے حقوق کی لڑائی لڑیں۔ اگر اس وقت ان قائدین نے ان کی قیادت نہ کی اور میدان میں نہ آئے تو نہ قوم بچے گی، یہ قائدین اور نہ ہی ان کی دستار و قبا سلامت رہے گی۔ مسلم قیادت کو اس بل کو وقتی تصور کرنے

کی غلطی نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کو اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہئے کہ ہندستان کی تاریخ میں ان کے وجود کے لئے اب تک کا سب سے خطرناک بل پیش کیا گیا ہے۔ یہ اس ملک کی خوش قسمتی ہے چند فتنہ پردازوں اور سازشوں کے مقابلے ایسے برادران وطن کی تعداد زیادہ ہے جو ہر طرح کے نامساعد حالات میں مسلم بھائیوں کے ساتھ نہ صرف کھڑے رہتے ہیں بلکہ ان کے حقوق کی لڑائی میں تن من اور دھن سے ان کا ساتھ دیتے ہیں، ساتھ دینے والے میدان میں آچکے ہیں، بس جن کو مدد کی ضرورت ہے وہی خواب خرگوش میں مبتلا ہے تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔

# ملک کو فکری سطح پر یرغمال بنانے کی کوشش

کثیر مذہبی سماج بغیر محبت اور آپسی بھائی چارہ کے نہ تو ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی آگے بڑھ سکتا ہے اور ان دونوں کے لیے فکری وسعت نہایت ضروری ہے۔ ہندوستانی سماج کی بنیاد بھی محبت اور بھائی چارہ پر ہی ہے، ہماری صدیوں کی روایت رہی ہے کہ کثیر جہتی و کثیر مذہبی سماج ہونے کے باوجود سب ایک لڑی میں پروئے رہے ہیں، لیکن دور حاضر کا یہ المیہ ہے کہ محدود سوچ اور فکر کے حامل چند افراد نے فکری سطح پر پورے ملک کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ جس میں میڈیا نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ میڈیا کو جمہوریت کا چوتھا ستون قرار دیا ہے جس پر اس کی بنیادیں استوار ہیں، لیکن مفاد پرستوں نے میڈیا کی معتبریت نہ صرف زک پہنچائی ہے بلکہ اس کا قالب ہی بدل کر رکھ دیا ہے، ہندستان میں ہندی میڈیا رجحان ساز ہے جس نے مثبت کے بجائے منفی رجحان سازی کو ترجیح دے رکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ میڈیا پر سے اب اعتبار ختم ہو کا ہے، ہوشمند افراد سماجی تانے بانے کے ادھیڑنے میں میڈیا کے کردار کو سب سے اہم مان رہے ہیں۔ جس نے اپنے فرض سے منھ موڑ کر اہل حل وعقد کی کاسہ لیسی کو اپنا وظیفہ بنا رکھا ہے۔ مخصوص فکر کے حامل چند افراد کی فکری دہشت کو عام کرنے اور ان کے ایجنڈے کے نفاذ میں میڈیا کے تعاون نے ملک اور سماج کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔

پہلا وہ ہے جو صدیوں پرانی روایات کا امین ہے جو ملک کی روح کو بچانے کے لیے سرگرداں ہے، جو ملک کے آئین میں یقین رکھتا ہے جو اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ فکری دہشت گردی عام نہ ہونے پائے تاکہ محبت کی فضا میں من حیث القوم ہم ترقی کی منازل طے کریں، اس کو معلوم ہے کہ جب تک آئین کے مطابق ملک نہیں چلے گا اس وقت تک سماجی انصاف قائم نہیں ہو سکے جو کسی بھی ملک کی ترقی کی شاہ کلید ہوا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ملک میں جب این آر سی اور سی اے بی لایا گیا تو وہ سڑکوں پر نکل آیا، کشمیر سے کنیا کماری تک وہ برسرِ پیکار ہو گیے تاکہ ملک کے آئین کو بچایا جا سکے، بادی النظر میں اس بل سے صرف مسلمان متاثر ہوں گے لیکن

حقیقت میں اس سے صرف مسلمان متاثر نہیں ہوں گے بلکہ پورے ملک کو قطار در قطار کھڑا ہو کر خود کو ثابت کرنا پڑے گا کہ ہم ہندوستانی ہیں، جس میں ایک کثیر تعداد بلا تفریق مذہب و ملت اپنی شہریت ثابت نہیں کر سکیں گے جیسا کہ آسام میں ہوا، جس کے بعد کی جو دشواریاں ہوں گی ان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اس عمل میں سب سے زیادہ غریب طبقے کو پریشان ہونا پڑے کیو کہ جس کے پاس سر چھپانے کے لیے چھت نہ ہو اور کھانے کے لیے کچھ نہ ہو، وہ بھلا دستاویز کیا رکھے گا، اس میں صرف مسلمان ہی نہیں ہوں گے، ہر مذہب کے ماننے والے ہوں گے جس مذہب اور علاقے کے لوگوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اسی اعتبار سے ان کا تناسب بھی ہوگا جیسا کہ آسام میں دیکھنے کو ملا۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو اس بات میں یقین رکھا ہے کہ ملک کے وسائل پر یہاں کے صرف ایک مذہب کے افراد کا ہی حق ہے، وہ ملک کو آئین کے مطابق چلانے کے بجائے ان اصولوں کے تحت چلانا چاہتا ہے جو ذات و برادری کے تفاوت میں نہ صرف یقین رکھتا ہے بلکہ ان اصولوں کے مطابق سماج کی تشکیل ہی اسی بنیاد پر ہوئی، خود کو محترم تصور کرتے ہوئے اپنے ہم مذہبوں کو ہی گری نظروں سے دیکھتا ہے، ان کے ساتھ قیام وطعام کو مذہبی تناظر میں درست نہیں تصور کرتا ہے، ان اصولوں کی وجہ سے سماج میں خلیج پیدا ہوئی اور پورا سماج کبھی ترقیات سے بہرہ مند نہیں ہو سکا، آزادی کے بعد ایسے سماج کی تعمیر و ترقی کے لیے ان کو ریزرویشن تک دیا گیا تا کہ وہ سماجی سطح پر انصاف قائم ہو اور سبھی ہندستانیوں کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہو سکیں۔ ان افراد نے سازش میں بڑی چابکدستی کا مظاہرہ کیا ملک کے مسلمانوں کو یہ اپنا پہلا دشمن تصور کرتے ہیں، ان سے لڑنے میں نہ صرف ان سماجی دبے کچلے افراد کو اپنا بھائی بند باور کراتے ہیں بلکہ ان کو سب سے آگے کر دیتے ہیں، چونکہ صدیوں کے یہ ستائے ہوئے لوگ تھے، جن کی فکری سطح اعلی وارفع نہیں تھی اس لیے وہ محبت کے دو بول کے جھانسے میں آ کر ان کا ساتھ دینے لگے، جب بھی کہیں فساد ہوتا ہے تو سب سے آگے ان افراد کو کر دیا جاتا ہے۔ خود کو اعلی وارفع تصور کرنے والوں کی

فکری دہشت اور وسائل پر قبضے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ وہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود غالب ہیں۔ ملک کے "مول نواسی" یعنی اصل باشندے آج بھی دوئم درجے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان میں اگر کوئی چنگاری دکھائی دیتی ہے یا کہیں کوئی شعلہ لپکتا ہے تو سب ایک ساتھ مل کر اس پر مٹی اور پانی ڈالنے لگتے ہیں، میڈیا بھونپو بن کر ان کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دیتا ہے، اربن نکسلائیٹ کی اصطلاح ان ہی لوگوں کے لیے کیا گیا تا کہ ان چنگاریوں اور شعلوں کا وجود ختم کیا جا سکے۔

ملک کو فکری سطح پر یرغمال کرنے والے ان سماجی دبے کچلوں کو مسلمانوں کے خلاف ہراول دستے میں رکھ کر اپنے مقاصد کا حصول چاہتے ہیں جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ جب بھی الیکشن اور مذہبی منافرت کی گرم بازاری کم ہوتی ہے ان افراد کو دوبارہ پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ جن کے دوش پر یہ اقتدار تک پہنچتے ہیں ان کو ہی اقتدار میں حصے داری دینے کے بجائے آئین میں کیے گیے سماجی انصاف کے اصول وضوابط/ ریزرویشن کے خاتمے کی باتیں عام ہونے لگتی ہیں اور جب ان کی ضرورت ہوتی ہے ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا کر آپسی اتحاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جسے کچھ لوگ سمجھتے بھی ہیں، اسی لیے جب بابری مسجد کا فیصلہ اکثریت کے حق میں کیا گیا تو یہ مطالبہ کیا گیا کہ رام مندر کا پروہت کسی دلت کو بنایا جائے جس پر ہر طرف سے خاموشی چھائی رہی۔

ملک وسماج کو فکری طور پر یرغمال بنانے میں ابھی یک لوگ مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکے ہیں، اسی وجہ سے وقتاً فوقتاً شعلے اور چنگاریاں نظر آتی رہتی ہیں، اس وقت جب ملک کے آئین کی روح کے منافی ایک ایسے سماج اور ملک کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس میں مسلمانوں کے لیے جگہ نہیں ہوگی ان کو دوئم درجے کا شہری بنا کر رکھنے کی کوشش ہوگی، پورا ملک سڑکوں پر آ گیا ہے۔ جس میں چنگاریاں شعلے بن کر سڑکوں پر کوندرہی ہیں، لیکن منواسمرتی کے نفاذ میں کوشاں افراد اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہے ہیں وہ یکے بعد دیگرے قدم آگے بڑھا رہے ہیں،

وہ اب نئی نسل کے ذہنوں کو ایک نیے انداز میں مسموم کرنے کے درپے ہیں جس میں آئینی عہدوں پر بیٹھے افراد بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔

یہ نیے و معصوم ذہنوں کو پراگندہ کرنے کی کوشش اور فکری دہشت گردی نہیں تو اور کیا ہے کہ منگلورو میں بابری مسجد کے انہدام کو اسٹیج کیا گیا وہ بھی ایک اسکول میں جس میں چھوٹے معصوم بچے زیر تعلیم ہیں، جس کے خلاف پاپولر فرنٹ آف انڈیا نے آئی پی سی کی دفعہ 295اے اور 298 کے تحت آیف آئی آر درج کرائی ہے، شری رام اسکول کی انتظامیہ اس کو معمولی بات بتا رہی ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ پلے صرف اس لیے کیا گیا تا کہ بچوں کو معلوم ہو سکے کہ ماضی میں کیا ہوا تھا۔اس پروگرام میں آئینی عہدے پر براجمان بلکہ آئین کے محافظ بھی موجود تھے لیکن ان کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہوا۔اہم بات یہ کہ یہ اسکول اسی غالب فکری دھارے کا ہے جو اس وقت ملک کو چلا رہی ہے۔عدلیہ کی شبیہ خراب کر کے اور اس کے معتبر وجود پر سوالیہ نشان لگا کر مسجد چھینی گئی، رویو پٹیشن خارج کرا کے انصاف کے امکانات کو ختم کیا گیا اور اب اس کی شہادت کو اسٹیج پر پیش کر کے نئے ذہنوں کو یرغمال بنا کر یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ماضی میں جو ہوا وہ ان کی ظفر مندی ہے ان ترغیب دی جا رہی ہے کہ مستقبل میں ایسے ہی وہ بھی قدم اٹھائیں۔

یہ بات ہر ایک کو سمجھنا چاہیے کہ ملک منافرت سے نہیں محبت سے ترقیاتی کی منازل طے کرے گا، ماضی میں جو ہوا جسے عدلیہ نے بھی غلط مانا اس کی ترغیب کے بجایے اس کو بھلا کر ہمیں آگے بڑھنا چاہیے، اور شوریہ کی گاتھا ملک کے سماجی تانے بانے کی تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔

# فکری ایجنڈے کے نفاذ کا سودا

فکری ایجنڈے کا نفاذ کا سودا جہاں ایک طرف عوام کا سکون و اطمینان غارت کر دیتا ہے وہیں وہ سیاسی جبر کا بھی سبب بن جاتا ہے، جس سے نہ صرف جمہوریت شرمسار ہوتی ہے بلکلہ انسانیت بھی داغدار ہو جاتی ہے۔ سیاست جب مذہبی آلائش سے آلودہ ہو کر اپنا ہدف مقرر کر لے تو ریاست کی نظر و٭ں میں انسان کی وقعت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ سیاست دانوں کی نظر انسانیت کے بجائے اس مذہبی ہدف پر ہوتی ہے، ایسے میں وہ آئین تک کی اہمیت کے نہ صرف انکاری ہو جاتے ہیں بلکہ اس کی روح کو کچل دیتے ہیں۔ اس سے ریاستی جبر وجود میں آتا ہے جس کے بعد خاک و خون میں لتھڑی ہوئی انسانیت اپنے وجود پر ماتم کرتی نظر آتی ہے۔

سی اے اے سیاسی فکر کے نفاذ کی طرف ایک بڑی کوشش ہے جو آئین، جمہوری روح اور عوامی جذبات کے خلاف ہے۔ جس کے بعد عوامی سطح پر تحریک شروع ہوگئی جس کی کمان نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے، آزادی کے بعد یہ پہلی ایسی تحریک ہے جو پورے ملک میں اتنے بڑے پیمانے پر شروع ہوئی۔ جس کے خلاف پہلے دن سے سیاست اور ریاست دونوں نے جبر کا رویہ اختیار کر لیا، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پولیس کی استحصالی کارروائی پر وزیر داخلہ کے رخ نے یہ طے کر دیا کہ ریاست عوامی جذبات اور امنگوں کے بجائے فکری ایجنڈے کے نفاذ میں یقین رکھتی ہے انسانیت اور آئین کے ذریعہ دیئے گئے عوامی حقوق کی پامالی اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ انہوں نے صاف طور پر کہا کہ پولیس نے جو کارروائی کی ہے اس کا جائزہ بعد میں لیا جایے گا کہ اس نے درست کیا یا غلط۔ ان کے اس بیان کے بعد ریاستی جبر میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جس طرح عوام کی محافظ پولیس نے کارروائی کی وہ انسانی روح کو کچلنے اور مسلنے والی رہی، جس پر فیکٹ فائنڈنگ کمیٹی کی رپورٹ بھی آگئی ہے۔ یونیورسٹی میں ہوئی پولیس کارروائی کا خود میں بھی گواہ رہا ہوں، پولیس مظاہرین پر عوامی املاک کی تباہی کا الزام لگا رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پولیس خود اس میں ملوث رہی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں

ہاسٹلوں کے باہر طلبا کی گاڑیوں کو جس طرح توڑا اور دو کمروں میں آگ لگائی اس نے اس کا مکروہ چہرہ بے نقاب کر دیا۔ وہاں طلبا نے کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی بلکہ آر پی ایف اور پولیس نے گاڑیوں کو توڑا جس پر ایس پی آکاش کلہڑی نے جائزہ کے بعد کارروائی کی بھی یقین دہانی کرائی، چونکہ علی گڑھ میں یہ کارروائی عوام کے محافظوں نے کی جس کی قیادت ایک ایسا پولیس افسر کر رہا تھا جس نے دن میں طلبا کو خطاب کرتے ہوئے طلبا کا دل یہ کہہ کر جیت لیا تھا کہ وہ بہر صورت ان کی آواز کو صدر جمہوریہ تک پہنچائیں گے اور ان کا ساتھ دیں گے، انسانیت کے پاسدار اور نرم دل رکھنے والے اس پولیس افسر کی قیادت والی پولیس جب ایسی کارروائی کر سکتی ہے تو بھلا وہ پولیس کیا کرے گی جس کے افسران اپنے سیاسی آقاؤں کے ایجنڈوں کے نفاذ میں اپنی ترقی دیکھتے ہیں اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

اتر پردیش کے وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ کے بیان ''بدلہ لیا جائے گا'' نے پولیس کے ہاتھ کھول دیئے اور اس کے بعد مظاہرین کے خلاف جس طرح سے اس نے کارروائی کی وہ انسانیت سوز ہے۔ ملک میں ہونے والے یہ پہلے ایسے مظاہرے ہیں جس میں اتنی تعداد میں ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ اب تک بیس سے زائد مظاہرین کی اموات ہو چکی ہیں اور کروڑوں روپے کی عوامی املاک تباہ ہو چکی ہے۔ چونکہ مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات دو بار میڈیا کو یہ ایڈوائزر جاری کر چکی ہے کہ وہ ایسا مواد نشر نہ کرے جس سے ملک میں حالات مزید خراب ہوں لیکن اس کا مقصد مظاہرین کی آواز کو دبانا تھا، یہی وجہ ہے کہ میڈیا مظاہرین کو ہمیشہ ''فسادی'' کے نام سے یاد کرتی ہے کبھی ان کو حقوق کی بازیابی کے لیے آواز بلند کرنے والا نہیں بتاتی ہے، ایسے میں اس میڈیا سے کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ پولیس کی کارروائی کا پوسٹ مارٹم کرے گی؟ اب تک ایک بھی خبر ایسی نہ نشر ہوئی ہے اور کسی اخبار میں شائع ہوئی جس میں پولیس کی انسانیت سوز کارروائی کو اجاگر کیا گیا ہو، پولیس نے جس طرح سے عوامی املاک اپنے ڈنڈوں اور اینٹ پتھر سے تباہ کیا ہے وہ شرمسار کرنے والی ہے لیکن اس کی ایک بھی کلپ میڈیا میں نہیں آئی، البتہ سوشل میڈیا کے

ذریعہ دسیوں ایسی کلپ سامنے آئیں ہیں جن میں پولیس کو ڈنڈوں سے توڑ پھوڑ اور پتھر کے ذریعہ گھر اور کار کے شیشوں کو توڑتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سی اے اے کے خلاف مظاہرہ میں صرف مسلمان سامنے نہیں ہیں بلکہ برادران وطن بھی شانہ بشانہ اور دوش بدوش کھڑے ہیں، جس کی وجہ سے اس تحریک کو مذہبی رنگ نہیں دیا جا سکا ہے لیکن اتر پردیش کے تناظر میں یہ بھی سچ ہے کہ اس میں اسی فیصد مسلم مظاہرے میں سامنے آیے ہیں اور ان کے خلاف کارروائی ہوئی ہے، وزیر اعلی کو اس حقیت کا علم تھا اسی لیے انہوں نے بدلہ لینے کی بات کہی اور پولیس نے ان کی اس خواہش کو پورا بھی کیا، مئو اور اعظم گڑھ میں ایک ہفتے سے زیادہ نہ صرف نیٹ بند رکھا گیا بلکہ سو سے زائد افراد کے خلاف کارروائی کے لیے ان کے پوسٹر چسپاں کرائے جارہے ہیں۔ اسی طرح سے مغربی اتر پردیش میں کارروائیاں کی جارہی ہیں، یہ پہلی بار ہوا ہے جب مظاہرین سے املاک کی تباہی کا معاوضہ وصول کیا جارہا ہے حالانکہ شوسل میڈیا کی کلپس میں مظاہرین کے بجائے پولیس املاک میں توڑ پھوڑ کرتے ہوئے اور اسے دکھائی دے رہی ہے۔

آئین نے عوام کو یہ حق دیا ہے کہ وہ مظاہروں کے ذریعہ اپنی آواز بلند کریں، لیکن پولیس نے اس کے اس حق پر شب خون مارا اور دفعہ 144 کے ذریعہ اس کی آواز دبانے کی مسلسل کوشش کررہی ہے، اولا وہ اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی ہے کہ کوئی مظاہرہ کرے، اس کی شروع سے کوشش رہی کہ عوام مظاہرہ نہ کرسکیں، جس کے لیے مظاہروں کی قیادت کرنے والوں پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا گیا اور جب وہ نہیں مانے تو ان سے بدلہ لیا گیا۔ اتر پردیش کے سرحدی ضلع بہرائچ میں یہی ہوا، عوامی تحریکات سے وابستہ مولانا محمد سرور قاسمی جب اپنے دستوری حق سے دستبردار نہیں ہوئے تو مظاہرے کے بعد پولیس نہ صرف ان کی اہلیہ اور بیٹی کو اٹھالے گئی بلکہ ان کے بھائی اور بھتیجے کو اٹھالے گئی جو بذات خود مظاہرے میں شریک بھی نہیں تھے، جن کو تین دن کے بعد چھوڑا گیا۔ کیا وزیر اعلی اور پولیس کے افسران یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ آخر بیٹی،

بیوی اور بھائی و بھتیجے نے کون سا گناہ کیا تھا؟ عاقل اور بالغ ہونے کے بعد ہر شخص اپنے عمل کا مکلف اور ذمہ دار ہوتا ہے، ایسے میں پولیس مظاہرین کے لواحقین کو کیوں پریشان کرتی ہے؟ یہ معاملہ صرف بہرائچ کا نہیں ہے بلکہ پورے اتر پردیش میں پولیس نے یہی رویہ اختیار کر رکھا ہے، راتوں میں پولیس مظاہرین کے گھروں پر چھاپے مارتی ہے اور عورتوں و بزرگوں کو زدو کوب کرتی ہے، فیروز آباد، بجنور، رام پور، مظفر نگر اور میرٹھ میں تو گھروں کا ساز و سامان تک تباہ کر دیا فریج اور گھر کے برتن تک توڑ دیئے، پولیس پر زیورات کی لوٹ کا بھی الزام ہے، آخر پولیس کو عوامی حقوق کی بازیابی کے لیے مظاہرہ کرنے والوں کے خلاف اس طرح کی کارروائی کی چھوٹ کیسے مل گئی؟ پولیس سیکڑوں سوشل میڈیا اکاؤنٹ بند کرنے کا دعوی کرتی ہے لیکن ایسے بھی اکاؤنٹ ہیں جو انڈین آرمی کی اوٹ میں نفرت پھیلا رہے ہیں، فیس بک پر انڈین آرمی کے نام سے ایک اکاؤنٹ ہے جس پر پولیس کی چھاپے ماری اور اس کی انسانیت سوز کارروائی پر مسلمانوں کا مذاق اس طرح اڑایا جاتا ہے کہ وہ ٹھٹھرتی راتوں میں گنوں میں سونے پر مجبور ہیں، ایک درد اور وجود کی لڑائی ہے اور دوسری طرف خوشی کے شادیانے، جس پر پولیس ایکشن نہیں لیتی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ سیاست اور پولیس دونوں یک رخی ہے اور جب بھی پانی کا بہاؤ تیزی سے یک رخا ہوگا تباہی یقینی ہے۔

ملک کے سیاست دانوں کو یہ بات حرز جاں کر لینی چاہیے کہ ان کی یہ کاروائیاں وقتی ثابت ہوں گی، وہ نہیں رہیں گے، ان کی پارٹیاں نہیں رہیں گی لیکن یہ ملک رہے گا، اس کا آئین رہے گا، ان کے ذریعہ لگائے گئے نفرت کے پودے جب بھی برگ و بار لانے کی کوشش کریں گے تو ملک سے محبت کرنے والے اور آئین میں یقین رکھنے والے عوام ان کے سامنے اسی طرح سینہ سپر ہو جائیں گے اور ایک دن ان کو پھر خزاں کا منھ دیکھنا پڑے گا۔ آئین میں یہ یقین کا ہی نتیجہ ہے کہ سینوں اور سروں میں گولیاں کھانے کے باوجود عوام سینہ سپر ہے اور اس وقت تک یہ سینہ سپر رہے گی جب تک یہ کالا قانون واپس نہیں لے لیا جاتا ہے۔

# پارلیمنٹ کے بعد اب سڑک پر حکومت

ہر ملک میں موجود سیاسی پارٹیوں کے کچھ نظریات ہوتے ہیں جن کے مطابق وہ قانون بناتی ہیں، یہ نظریات کئی طرح کے ہوسکتے ہیں مثلاً معاشی، علاقائی، تاریخی، روایتی، تجدد پسند اور سخت گیر، آخری الذکر دونوں نظریات کے تصادم سے سب سے زیادہ ذہنی اور طویل مدتی طور پر عوام متاثر ہوتے ہیں۔ چونکہ اول الذکر کا تعلق حال اور مستقبل سے ہوتا ہے جبکہ ثانی الذکر کا ماضی سے، ایسے میں صرف دو نظریات میں تصادم نہیں ہوتا بلکہ حقیقت میں وہ زمانوں ٹکراؤ ہوتا ہے۔

اس وقت ہندستان ایسی ہی نظریاتی کشمکش کا شکار ہے، پارلیمنٹ کے ایک سخت نظریاتی فیصلے نے ملک کے ماحول کو متاثر کر کے رکھ دیا ہے۔ جس دن سے پارلیمنٹ میں شہریت ترمیمی بل منظور ہوا ہے اسی دن سے پورے ملک میں عوام سڑکوں پر آگیے اور وہ مسلسل پولیس کی ظلم و بربریت کا شکار ہیں، تشدد کا صرف ایک پہلو نہیں ہے جس سے پولیس کو کٹہرے میں کھڑا کیا جائے اس کے دونوں پہلو ہیں لیکن چونکہ پولیس عوام کی محافظ ہوتی ہے اس لیے اس پر ذمہ داریاں زیادہ عائد ہوتی ہیں، اب اگر پولیس مظاہروں کو روکنے کے لیے عوامی تکالیف کے بہانے تراش کر ظلم و بربریت پر اتر آئے تو ایسی صورت میں اس کو ہی کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا، پولیس کے خلاف اتنے معاملات اور رپورٹ کے سامنے آنے کے باوجود ابھی تک کوئی جانچ اور کارروائی تو دور کی بات ایسے لوگوں کو حکومت تحفظ دیتی ہوئی نظر آئی ہے جنہوں نے آئین کے خلاف کام کیا ہے اور اس کے ایسے ثبوت بھی ہیں جن کا کوئی انکار نہیں کرسکتا، یہاں تک کہ خود متعلقہ افسر نے اس بات کو قبول کیا کہ ہاں اس نے ایسا کیا ہے مثلاً میرٹھ کے پولیس سربراہ کا مسلمانوں کو دھمکی اور پاکستان جانے کی بات کہنا، یوپی حکومت اس کے بچاؤ میں پوری طرح سے اتر آئی۔

شہریت ترمیمی بل آزاد ہندستان کا پہلا ایسا بل ہے جس کے خلاف اس طرح سے پورے ملک کے طول وعرض میں مظاہرے ہوئے اور پچیس سے زائد جانیں گئیں جن میں زیادہ تر

پولیس کی گولی سے گئیں، اس کے باوجود پولیس نہ صرف اپناؤ ہی رویہ اختیار کیے ہوئے ہے بلکہ اب وزیر اعظم بھی میدان میں آگیے ہیں۔ وہ عوام سے اس بات کا مطالبہ کرر ہے ہیں کہ وہ اس بل کے حق میں آن لائن اور زمینی سطح پر مہم چلائیں، یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اب اس ملک میں پارلیمنٹ کی قدر اتنی رہ گئی ہے کہ دونوں ایوان سے پاس قانون کے نفاذ کے لیے وزیر اعظم عوامی تحریک چلائیں۔ کم از کم وزیر اعظم سے تو ایسی امید نہیں تھی، جب انہوں نے اس قانون کو منظور کرایا تو اس کے نفاذ کے لیے عوامی مہم کی کیوں ضرورت پڑی؟ اس سوال کے وہ کئی جواب دے سکتے ہیں لیکن شاید وہ اس کے مضرات اور عواقب سے واقف نہیں اور اگر واقف ہیں تو اغماص سے کام لے رہے ہیں جو پارلیمنٹ کی توہین ہے۔

وزیر اعظم کی اس طرح کی اپیل ملک کے عوام کو باہم دست و گریباں کر سکتی ہے، بھاجپا کا دعوی ہے کہ وہ ممبران کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی ہے، ایسے میں ان کی اپیل پر ہزاروں اور لاکھوں ممبران سڑکوں پر آسکتے ہیں اور ان اس کے مخالفین سے برسرپیکار ہو سکتے ہیں حالانکہ پارٹی ورکر کبھی بھی جانبدار نہیں ہو سکتا ہے وہ تو پارٹی لائن اور نظریات کی بنیاد پر کام کرتا ہے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ وزیر اعظم پولیس فورس کے بعد اب پارٹی ممبران کے ذریعہ مخالفت کی اس آواز کو دبانا چاہتے ہیں؟ کیا ان کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ یہ ایسی تحریک ہے جو پچیس سے زائد شہادت، ہزاروں زخمیوں اور گرفتاریوں کے باوجود وہ اور ان کی انتظامیہ اسے ختم کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی ہے؟ کیا اب وہ یہ جنگ پارلیمنٹ کے بعد سڑکوں پر شروع کرنے کا منصوبہ بنا چکے ہیں؟ حالانکہ آخری سوال برائے سوال ہی ہے ورنہ ان کی اپیل کے بعد ان کا منصوبہ طشت از بام ہو چکا ہے اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ ایک بڑی جمہوریت کا سربراہ پارلیمنٹ میں جیت کر اب سڑک پر جنگ لڑ رہا ہے، جس کا خمیازہ عوام اور ملک کو ہی بھگتنا ہوگا۔

وزیر اعظم نریندر مودی اور ان کی حکومت اتنی مخالفت کے باوجود آخر اپنے فیصلے کو غلط ماننے کے لیے تیار کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ ملک میں اتنی نفرت اور دہشت کے بعد بھی لوگ اس کی

مخالفت کیوں نہیں ترک کر رہے ہیں؟ یہ وہ دو سوال ہیں جس پر مسلسل غور کر رہا ہوں اور قارئین سے بھی گزارش کرتا ہوں کہ وہ غور وخوض کریں، اب تک میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فریقین یعنی حکومت اور اس بل کے مخالف عوام کے مابین نظریاتی طور پر بُعد المشرقین ہے، ایک ندی کے اس کنارے کھڑا ہے اور دوسرا ندی کے اُس کنارے کھڑا ہے، دونوں اپنی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں اس لیے ہاتھ نہیں ملا رہے ہیں، ایک طرف نظریہ ہے اور دوسری طرف وجود اور آئین کی روح۔ حکومت اس بل کے ذریعہ ہندو راشٹر کی راہ ہموار کرنے کی کوشش میں ہے جو اس کی سیاسی فکر کی بنیاد ہے جس سے وہ ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہتی۔ حکومت مذہبی بنیاد پر خلیج پیدا کرنا چاہتی ہے، وہ اس کو قانونی حیثیت دے چکی ہے جس سے ملک کے مذہبی اور سماجی تنوع کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے، عوام اس خطرے سے ملک کو بچانا چاہتے ہیں اسی لیے وہ میدان میں ہیں، جبکہ حکومت چلانے والے نظریاتی اسیر بھی اس بات سے واقف ہیں کہ دھیرے دھیرے ان کے ہاتھ سے ایک کے بعد ایک ریاستیں پھسلتی جا رہی ہیں ایسے میں شاید ان کو دوبارہ یہ پوزیشن پارلیمنٹ میں نہ مل سکے، اس لیے وہ نظریاتی سطح پر اپنا پودا لگا کر ہی جانا چاہتے ہیں تاکہ ان کو وہ خواب پورا کرنے میں کامیابی مل سکے جسے دو قومی نظریہ ساز ساورکر نے دیکھا تھا کہ ہندستان صرف ہندوؤں کا ہے، یہاں مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اسی لیے آر ایس ایس تین محاذ پر کام کر رہی ہے ایک تو سیاسی سطح پر وہ ایسے قوانین وضع کرا رہی ہے جس سے اس کے نظریات زمینی شکل اختیار کر سکیں اور دوسرے وہ پورے سماج میں اپنا نظریہ پھیلا کر عوام کو اپنا ہمنوا بنا سکے یا کم از کم ان کے ذہنوں میں ایسے بیج ڈال سکے جو مستقبل میں اس کی اس راہ کو آسان کر دیں۔ حیدر آباد میں جو بیان موہن بھاگوت نے دیا کہ جو بھی ہندوستانی روایات کا امین ہے وہ ہندو ہے اسی کا غماز ہے۔ وہ ملک کے تنوع کو ختم کر کے اس کو بھی مذہبی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جو آئین کی روح کے منافی ہے۔ تیسرے شہریت ترمیمی بل کے خلاف اب آر ایس ایس میدان میں آ چکی ہے، اس نے مغربی اتر پردیش کے مرکزی دفتر میں میٹنگ کر کے نہ صرف اپنے ارادے

ظاہر کردیئے ہیں بلکہ یہ عندیہ بھی دے دیا ہے کہ پولیس فورس کے بعد اب آرایس ایس کے کارکن سڑکوں پر اتر کر دہشت پھیلائیں گے، ان کو معلوم ہے کہ اس کی سیاسی ونگ کی حکومت میں پولیس میں ہمت نہیں کہ وہ اس کے کارکنان کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھ سکے، تبھی تو کھلے عام نعرے بازی ہوتی" دیش کے غداروں کو گولی مارو.....' یہ گولی مارنے کی بات ایسے ہی نہیں کی جارہی ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک میکانزم اور گٹھ جوڑ ہے۔ آرایس ایس نے مرکزی وریاستی وزراء کے ساتھ ہی اب بھاجپا کے ممبران پارلیمنٹ واسمبلی کو پلان چارٹ دے دیا ہے کہ اس کو کس طرح کام کرنا ہے، ان کا یہ کام مخالفین کو سمجھانے اور ان کے غم و غصے کو کم کرنے کے بجائے حامیوں کی فوج تیار کرنے والا ہوگا تاکہ وزیر اعظم کی اپیل کا اثر بھی وہ سڑکوں پر دکھا سکیں، اسی لیے ریلیوں اور جلوس کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

حکومت، بھاجپا اور آرایس ایس کے منصوبوں نے یہ واضح کردیا ہے کہ شہریت ترمیمی بل کے خلاف عوام کی یہ جنگ طویل سے طویل تر ہوسکتی ہے، اس جنگ میں کسی کو بھی جیت اب عام مظاہروں کی طرح اس کے فوربعد نہیں ملنے والی ہے، حکومت کو بھی اندازہ ہوگی ہے کہ مخالفت کی آگ جلد بجھنے والی نہیں ہے۔ قرآن کی آیت ہے جس کا مفہوم کہ" وہ منصوبے بناتے ہیں، اللہ بھی منصوبے بناتا ہے اور اللہ زیادہ بہتر منصوبے بنانے والا ہے" ہمیں آیت پر کامل یقین رکھتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ نگر اور شاہین باغ میں ہونے والے مظاہروں کی طرح تشدد سے پاک مظاہروں کا اہتمام کرنا چاہیے، کوئی بھی ایسا موقع پولیس اور انتظامیہ کو نہ دیں جس کا بہانہ بنا کر وہ اس تحریک کو توڑنے کے اپنے منصوبے میں وہ کامیاب ہوسکے۔

تشدد سے پاک مظاہروں کے نقصانات کم اور فوائد زیادہ ہیں، اس کا نقصان یہ ہے کہ جمہوری نظام میں آئینہ دکھانے والا اور عوام وحکومت کے مابین پل کا کام کرنے والا میڈیا اب اس جانب توجہ نہیں دیتا، اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس مظاہرے میں تو کوئی ندرت نہیں لیکن جیسے ہی مظاہرہ تشدد میں تبدیل ہوتا ہے خواہ وہ کسی بھی طرف سے ہوفورا میڈیا کوریج شروع ہوجاتی

ہے جس سے ملک و بیرون ملک ایک فضا بننے لگتی ہے یہ منفی بھی ہو سکتی ہے اور مثبت بھی۔ تشدد سے پاک مظاہروں کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے پبلک پراپرٹی کو نقصان اور جانوں کا ضیاع نہیں ہوتا اور لوگ زخمی نہیں ہوتے۔ ملک پر امن رہتا ہے اور احتجاج جاری رہتا ہے۔ کہتے ہیں خاموشی کی ضرب بہت کاری ہوتی ہے تو اس طرح کے مظاہرے خاموشی، عزم و حزم کی علامت ہوتے ہیں جن کو توڑنا حکومتوں کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا ہے اور طویل جدو جہد میں تشدد سے کامیابی نہیں مل سکتی ہے کیونکہ تشدد وقتی ہوتا ہے اس میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا جبکہ عدم تشدد اس کے برعکس دیرپا اور اس کے نتائج مثبت و معنی خیز ہوتے ہیں گاندھی جی کی تحریکات ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

# آئین ہند، اخلاقی اقدار اور مذموم مقاصد

ایک متنوع سماجی روایات کے حامل ملک پر کوئی بھی شخص/ادارہ اپنی سوچ اور اپنے ایجنڈے نہیں تھوپ سکتا ہے، جب بھی اس طرح کی کوشش ہوتی ہے ملک و سماج ٹوٹ پھوٹ اور تباہی کی طرف جاتا ہے، ملک میں پھیلی ہوئی انارکی کا یہی سبب ہے کیونکہ چند لوگ ہیں جو پورے ملک کو اپنے مخصوص ایجنڈے کے مطابق چلانا چاہتے ہیں. وہ نظریاتی اور عملی دونوں سطح پر بہت سرگرم ہیں، جس کا نتیجہ ہے کہ سماجی تانا بانا بالکل ادھڑ چکا ہے. تعلیمی اداروں میں پڑھائی کے بجائے آئین کی روح کو بچانے کے لیے طلبا برسرپیکار ہیں، بازار بند یا ان پر بند ہونے کا خطرہ رہتا ہے، کوئی بھی شخص گھر و باہر محفوظ نہیں، ایک طرف پورے ملک کو قطار میں کھڑا کرنے کی تیاری ہوری ہے تو دوسری طرف ملک کے مذہبی تنوع کا گلا گھونٹنے کی کوشش، جس کا نتیجہ ہے کہ ملک اس وقت ایک شعلے میں بدل چکا ہے۔

مذکورہ ایجنڈے کے نظریاتی/فکریاتی پہلو پر پہلے نظر ڈالتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ بھاجپا سرکار عملی سطح پر جو کام کر رہی ہے اور وہ اس میں اتنی متشدد ہو چکی کہ اس نے پہلے ہی اعلان کر دیا ہے کہ وہ ایک انچ بھی اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹے گی، اس نے پوری طرح سے عوامی تحریک کو نظر انداز کر کے اس پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے. ایسی کیا وجہ ہے جو جمہوری ملک میں ہی جمہور کی آواز نہیں سنی جا رہی ہے سرکار نے اپنے کان اس طرح بند کر لیے گویا وہ بہری ہو چکی ہے بلکہ اپنے فیصلے کے نفاذ کے لیے مزید کوششیں کر رہی ہے، ان سب کے پس پشت کون سا مقصد ہے اس کا جاننا ضروری ہے۔

دسمبر 2019 کے آخری ہفتے میں آر ایس ایس کے سربراہ موہن بھاگوت حیدرآباد گیے تھے جہاں وہ تنظیمی پروگرام میں شامل ہوئے اور تقریر بھی کی. ان کا ایک بیان "ایک سو تیس کروڑ ہندستانیوں کو آر ایس ایس ہندو سمجھتا ہے" زیر بحث ہے اور اس کے خلاف ایف آئی آر بھی ہوئی. آر ایس ایس یا کسی کے بھی ماننے اور نہ ماننے سے حقیقتیں نہیں بدل جاتی ہیں، لیکن اس

طرح کے بیانات سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ افراد/ اداروں کے پوشیدہ ایجنڈے اور ان کے نظریات عوام کے سامنے آجاتے ہیں. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرایس ایس اپنے ہندوراشٹر کے ایجنڈے سے کبھی الگ نہیں ہوسکتا ہے، وہ مذہبی تنوع کے بجایے اس ملک کو ایک مذہب میں جکڑ کر رکھنا چاہتا ہے جو آئین کے بجایے منواسمرتی اور مذہبی روایات / پرمپرا کے مطابق چلے گا. جس کی طرف قدم بڑھانے کا ایک طرح اشارہ انہوں نے حیدرآباد کی تقریر میں بھی دیا لیکن اس حصے پر خاطر خواہ گفتگو نہیں ہوئی. موہن بھاگوت کی نظر میں آئین ہند پر نظر ثانی کی ضرورت ہے. ان کے مطابق آئین ہند ہندوستانی اخلاقیات اور روایات سے متصادم ہے جس کی دلیل وہ اس طرح دیتے ہیں کہ بہت سے قانون آئینی اعتبار سے درست ہوسکتے ہیں لیکن اخلاقی اعتبار سے نہیں، اس لیے آئین کو ہندستانی روایات کے مطابق بنانا ضروری ہے، وہ اس نکتے پر غور وخوض کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر بحث ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے قبل آئین اور اخلاقیات پر بحث ہونی چاہیے اور ان دونوں کے فرق کو عوام کے سامنے رکھا جانا چاہیے کہ کسی ملک کے لیے اخلاق کس حد تک ضروری ہیں اور قانون کی حد کیا ہوگی، ان دونوں کی ضرورتیں کن حالات میں اور کس مقدار میں ہوا کرتی ہیں، اس طرح کے بنیادی فرق پر بحث ضروری ہے۔

موہن بھاگوت کا مذکورہ بیان ایک خطرناک سوچ پر مبنی ہے، جس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جانی چاہیے کیونکہ یہ بیان بہت پرفریب ہے، اس طرح کے کسی بھی اقدام کی مخالفت کی جانی چاہیے، اس میں ان کا ایجنڈا چھپا ہوا ہے. عدلیہ نے جب سبری مالا میں خواتین کے داخلے سے متعلق حق یکسانیت کے تحت اجازت دی تو وزیر داخلہ نے عدالت کو نصیحت کی تھی کہ عدالت کو ایسے فیصلے نہیں کرنے چاہیے جن کا نفاذ ممکن نہ ہوں. اسی بات سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس پورے ٹولے کو آئین اور اس کی روح سے کوئی مطلب نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد اپنے ایجنڈے کا نفاذ ہے مرکزی وزیر اننت ہیگڑے نے بہت پہلے اس بات کا اعلان کردیا تھا کہ ہم لوگ آئین بدلنے آئے ہیں. موہن بھاگوت اپنی چکنی چپڑی باتوں اور اخلاقی اقدار کے حوالے کے ذریعہ آئین سے چھیڑ چھاڑ کی کوشش میں ہیں، وہ دانشوروں کو اس

کے لیے آگے لانا چاہتے ہیں تاکہ ان پر یا ان کی تنظیم پر کسی طرح کا الزام نہ لگ سکے۔

آر ایس ایس ایک فکری تنظیم ہے۔ جو بھاجپا کو ایک فکر دیتی ہے، راہ دکھاتی ہے جس کے اشاروں کے مطابق وہ عمل کرتی ہے، یہ اس کے اشاروں اور مذموم مقاصد کا ہی نتیجہ ہے کہ آج طلبا اور سیکولر ذہن کے لوگ بلا تفریق مذہب و ملت سڑکوں پر ہیں. وہ آئین مخالف عمل کی مخالفت میں دائیں بازو کے دانشوروں، سرکار، انتظامیہ اور متشدد ذہنیت کے حامل افراد سے نبرد آزما ہیں. فکری تشدد کا عالم یہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں تشدد برپا کیا جاتا ہے، اور اس کو بڑے فخر کے ساتھ حب الوطنی اور ہندوازم سے جوڑ دیا جاتا ہے یہ بھی ایک فریب ہے، خود ساختہ حب الوطنی میں کوئی گہرائی نہیں ہے بلکہ یہ صرف زبانی جمع خرچ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ اس کی کوئی زمینی حقیقت نہیں ہے، نہ اس کا کوئی ماضی ہے اور نہ ہی مستقبل اس کے مرکز میں صرف اور صرف ہندوازم ہے جس کا آئین منواسمرتی ہے جس میں سماج کے ہر فرد کو یکساں حقوق نہیں حاصل ہو سکے ہیں۔

آج کے اس برق رفتار دور میں ترقی اور ترفع کا پرفریب نعرہ دے کر ہندستان کو صدیوں پیچھے لے جانے کی کوشش ہے اور اس میں سرکار پوری طرح سے ملوث ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ عوام کی آواز کو نہ صرف نظر انداز کر رہی ہے بلکہ وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے بھی اختیار کر رہی ہے، وہ شہریت ترمیمی بل پر سڑک پر آنے کے بعد مسڈ کال مہم چلا رہی ہے جس میں دھوکے سے لوگوں کو مخصوص نمبر پر کال کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے اتنا ہی نہیں اب وہ اس معاملے میں عدالت بھی پہنچ چکی ہے اور عدالت سے درخواست کی ہے کہ وہ اس قانون کو آئینی حیثیت دے دے جس پر چیف جسٹس کو کہنا پڑا کہ کبھی ہم نے یہ سنا ہی نہیں کہ کسی منظور بل کو آئینی قرار دیے جانے کی درخواست دی گئی ہو، سرکار کے اس عمل پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے عدالت نے یہ بھی کہا کہ اس کا یہ عمل تشدد کو ہوا دینے والا ہے. اتنا سب ہونے کے باوجود سرکار پیچھے ہٹنے کو اس لیے نہیں تیار ہے کیونکہ آئین میں اس طرح کی ترمیم ہی اس کے مرکز اور محور میں ہے اور اسی طرح دھیرے دھیرے سرکار اپنی مرکزی

تنظیم کے پوشیدہ ایجنڈے کو آگے بڑھا سکتی ہے۔

جامعہ ملیہ سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جے این یو میں جو کچھ ہوا ہے، اور جس طرح اس کو لہو لہو کیا گیا ہے وہ صرف اس لیے نہیں کہ انتظامی امور میں اصلاح کے لیے یہ سب ضروری تھا بلکہ اس کا مقصد سوال کرتی زبانوں کو خاموش کرنا ہے، جے این یو میں اے بی وی پی کا حملہ اور بعد میں ہندو رکشا دل نے جس فخر و مباہات سے اس کی ذمہ داری لی اور اعلان کیا کہ اس کا اگلا نشانہ اے ایم یو ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ٹولے کو سوال کرتی زبانیں پسند نہیں ہیں بلکہ یہ ٹولہ ایسا نوجوان / اگلی نسل چاہتا ہے جو صرف تابعدار ہو، جس کی زبانوں پر تالے لگے ہوں. سرکار، آر ایس ایس اور اس سے وابستہ تنظیموں اور افراد کو معلوم ہے کہ ان اداروں کے طلبا صرف کتاب نہیں پڑھتے ہیں بلکہ وہ سماجی سروکار رکھتے ہیں، ترقی پسند ذہنیت کے حامل اکیسویں صدی کے نوجوان ہیں جو کسی بھی سطح پر کی جانے والی ظلم و ناانصافی کو صرف سمجھتے ہیں نہیں بلکہ اس کے خلاف آواز اٹھانے کی بھی ہمت رکھتے ہیں، وہ پڑھتے لکھتے ہیں اس لیے آئین اور اس کی روح کو بھی سمجھتے ہیں. اس لیے سب سے پہلے ان پر فکری اور جسمانی دونوں طرح سے حملہ کر کے ان کو مفلوج کرنا چاہتے ہیں .

ملک کے سماجی تانے بانے اس کے تنوع، آئین، اس کی روح اور سیکولر اقدار کو اگر بچانا ہے تو پورے ملک اور سماج کو سرکار کی تاناشاہی کے خلاف پر امن طور پر میدان میں آنا ہوگا، جامعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اور جے این یو پر حملے کو صرف ایک ادارے یا چند طلبا پر حملہ نہیں تصور کرنے کی غلطی نہیں کی جانی چاہیے بلکہ اس کو نئی نسل کو تباہ کرنے اور آئین میں تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں کی شہ رگ کاٹنے کی کوشش کے طور پر لیا جانا چاہیے. اسی طرح آر ایس ایس سربراہ کے بیان اور سرکار کے عمل کی کڑیوں کو ملا کر تفہیم کی بھی ضرورت ہے اس کے بغیر اس پورے کھیل کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ سیکولر ذہنیت کے حامل اور آئین میں یقین رکھنے والے افراد کو ایسے افراد کا سامنا ہے جو یک سطحی نہیں ہیں بلکہ ان کی کئی سطحیں ہیں جس کو سمجھے بغیر ان کے خلاف نہ منصوبے بنائے جا سکتے ہیں اور نہ ہی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

# کسانوں کی زندگی کے دیمک

ہندستان ایک زراعت پیشہ ملک ہے، جو پوری دنیا میں اپنی زراعت کے لیے جانا جاتا ہے، اس کے باوجود اگر یہاں کے کسان خودکشی پر مجبور ہوں، اور بھوک کے انڈکس میں وہ نیپال جیسے ملک سے بھی اوپر ہوتو یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی اگر کوئی بچی بھت بھات کہتے ہوئے دم توڑ دے تو پانچ ٹریلین کی معیشت کا خواب دیکھنے والوں کے لیے یہ کسی طمانچے سے کم نہیں ہے، کیونکہ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے ہر ایک کا پیٹ بھرا جایے، ہر ایک کو وقت پر علاج مہیا ہو، اور اچھی تعلیم کا انتظام کیا جایے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب سرکاری سطح پر اقدامات کیے جائیں۔ حکومتیں دعوے تو خوب کرتی ہیں لیکن سب کی سب کاغذی ہوتے ہیں جن کی حقیقت ایک خوفناک خواب سے کم نہیں ہوتی ہیں۔

گرین ریولیشن کے بعد اناج کے معاملے میں ہندستان خودکفالت کی طرف گامزن ہوا، کسانوں کی حالت بہتر ہوئی اس میں کوئی شک نہیں ہے، وہ لوگ جو دوسروں کے کھیتوں میں کام کرتے تھے، ان کے چھوٹے سے قطعہ اراضی میں اتنی پیداوار ہونے لگی کہ کم از کم وہ اوران کا کنبہ بھر پیٹ کھا کر سو سکے۔ یہ حالت مزید بہتر ہوسکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ کسانوں کا خون چوسنے والے لوگ اب بھی موجود ہیں۔ پہلے زمین کا مالک اور سود خور بنیا ان کے جسم کا قطرہ قطرہ نچوڑ لیتا تھا لیکن اب یہی کام سرکاری افسر کرتے ہیں اور بے خوف ہوکر کرتے ہیں۔

بی جے پی کی سرکار اقتدار میں صرف اس بنیاد پر آئی تھی کہ یو پی اے کی حکومت میں بدعنوانی ہے، وزیر اعظم نریندر مودی نے بہت زور و شور سے اعلان کیا تھا بلکہ نعرہ دیا تھا نہ کھاؤں گا نہ کھانے دوں گا عوام کو ان کے اس وعدے پر اعتبار بھی تھا اور سب کو یہ امید تھی کہ اب اچھے دن آجائیں گے اس کے انتظار چھ برس کا عرصہ گذر کا ہے، لیکن آج تک اچھے دن نہیں آئے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ بدعنوانی اور مہنگائی ہے۔ بدعنوانی تک سب کی نظر نہیں ہے اس لیے اس پر بات نہیں ہوتی ہے البتہ مہنگائی سب کو دیکھ اور جھیل رہے ہیں جس پر کبھی کبھار گفتگو ہوجاتی ہے

لیکن ابھی تک ایسی گفتگونہیں ہوسکی ہے سرکار اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب تک ملک کا کسان خوشحال نہیں ہوگا اس وقت تک ملک خوشحال نہیں ہوسکتا ہے، اور کسان اس وقت تک خوشحال نہیں ہوسکتا ہے جب ان کا خون چوسنے والے سرکاری افسران پر لگام نہ لگائی جائے اور ان کو کیفر کردار تک نہ پہنچایا جاسکے۔ زمینی سطح پر کام کرنے والے سرکاری ملازموں نے کسانوں کی زندگی اجیرن رکھی ہے، چونکہ آج بھی اکثر و بیشتر کسان اپنے حقوق سے ناواقف ہیں کیونکہ وہ آج بھی یا تو تعلیم یافتہ نہیں ہیں یا پھر اتنے کم پڑھے لکھے ہیں کہ وہ گہری باتیں سمجھ نہیں پاتے اور اگر سمجھتے ہیں تو ان میں اتنی ہمت نہیں کہ سرکاری ملازموں کے خلاف لڑ کر اپنے حقوق حاصل کرسکیں، ان کو لگتا ہے اگر انہوں نے ان سرکاری ملازمین وافسران کے خلاف آواز اٹھائی یا ایف آئی آر کرائی تو وہ ان کو مزید پریشان کریں گے۔ حالات یہ ہیں کہ سرکار تو کسانوں کی پیداوار کی اچھی قیمت دینے کے لیے قدرے بہتر قیمتوں کا اعلان کرتی ہے جس پر اس کی پیداوار کی خریداری سرکاری سطح پر کی جانی چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس مین نقب لگالی جاتی ہے اور کسانوں کا حق مار لیا جاتا ہے۔

وزیر اعظم نریندر مودی نے دعوے کیے تھے کہ کسانوں کی آمدنی دوگنی ہوگیی ہے اس سلسلے میں انہوں نے متعدد کسانوں سے گفتگو کر کے ملک کو یہ بات ور کرانے کی کوشش کی تھی کہ حقیقت میں زمینی سطح پر ایسا ہو چکا ہے لیکن ان کا یہ دعوی اس وقت بھی کھوکھلا ثابت ہوا تھا اور آج بھی کھوکھلا ہی ہے۔ اول سبھی کسان اپنی پیداوار سرکاری خریداری سینٹر تک پہنچا نہیں پاتا اور اگر کچھ کسان اپنی پیداوار آن لائن کارروائی کے بعد سرکاری خریداری سینٹر لیوی پر اپنی پیداوار لے کر جاتے ہیں تاکہ اس کی قیمت اس کے اکاؤنٹ میں آئے تو وہاں کا سکریٹری لوٹ وکھسوٹ مچاتا ہے اور وہ رقم اکاؤنٹ میں پہنچنے سے پہلے ہی ایسی سازش کرتا ہے کہ کسان کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ جو کسان سرکاری خریداری مراکز نہ جاکر منڈی اپنی پیداوار منڈی لے کر جاتے ہیں ان کو سرکاری قیمت کا صرف ساٹھ فیصد ہی قیمت ملتی ہے، ایسے میں کسانوں کی حالت کیسے بہتر ہوسکتی ہے۔

کسانوں کا حامی ہونے کا دعویٰ کرنے والی سیاسی پارٹی بی جے پی کی حکومت مرکز میں ہے اور اتر پردیش میں بھی اسی کی حکومت ہے لیکن یو پی میں ابھی دھان کی خریداری میں جس طرح سے بدعنوانی ہوئی ہے اور کسانوں کے ساتھ لوٹ کھسوٹ مچائی گئی ہے وہ رونگٹے کھڑے کر دین والی ہے۔ یہاں کی بی جے پی حکومت نے دھان کی حمایت یافتہ قیمت 1815 روپے فی کنٹل کا اعلان کیا تھا، 20 روپے بار برداری کے لیے دیا تا کہ کسانوں کو کسی طرح کی پریشانی نہ ہو لیکن کسانوں کو قیمت 1500 سے 1600 اور بہت کم کسانوں 1700 روپے فی کنٹل کی قیمت ملی ہے۔ ایک سوال ہوسکتا ہے کہ جب کسانوں کی پیداوار کی قیمت ان کے اکاؤنٹ میں براہ راست جاتی ہے تو اس طرح مختلف قیمتیں کیسے ممکن ہے؟ اور سوال بھی اہم اور بجا ہے لیکن لال فیتہ شاہی سے کون بچ سکا ہے، سرکاری ملازمین کے پاس پچاس راستے ہوتے ہیں، وہ گرفت سے بچنے کے راستے تلاش کر لیتے ہیں۔

اتر پردیش کے ضلع بہرائچ کے صرف دو سینٹروں کی مثال دوں گا جن سے میرا خود واسطہ ہے چونکہ میں ایک کسان کا بیٹا ہوں اس لیے زمینی سطح پر کام کرنے والے ملازمین وافسران سے براہ راست واسطہ پڑتا رہتا ہے، ان دو سینٹروں کے تناظر میں پوری ریاست میں ہونے والی خریداری کو دیکھا جاسکتا ہے۔ رسیا بازار اور دھرمن پور میں ایک ایک سینٹر ہے، جہاں جلی حروف میں دھان کی قیمت 1815 روپے لکھی ہوئی ہے لیکن کسان جب اپنی کھتونی آن لائن کرانے کے بعد یہاں پہنچتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ 1610 روپے فی کنٹل قیمت ملے گی، وہ اناج پورا لیتے ہیں اور سرکاری معیار کے مطابق پنکھا لگا کر اوسائی کرا کر لیتے ہیں لیکن جب دھان کی مقدار اور قیمت آن لائن کرنے کی باری آتی ہے تو غلے میں ڈنڈی مار جاتے ہیں دس کنٹل دھان کی سرکاری قیمت 18150 ہوتی ہے لیکن سیکریٹری صرف 16100 روپے کا دھان اس کے کھاتے میں درج کر کے باقی اناج الگ کر لیتا ہے اور یہ قیمت اس کے کھاتے میں آجاتی ہے۔

اگر کسان اپنی پیداوار سکریٹری کی بتائی ہوئی قیمت پر دینے کے لیے تیار نہ ہو تو اول وہ اس

کی پیداوار کی خریداری کرنے پر تیار نہیں ہوتا ہے اور اگر تیار ہو بھی جایے تو معیار میں کمیاں نکال کر واپس کر دیتا ہے، ایسے کسان جائے تو کہاں جائے کیونکہ دوبارہ بھی اس کو یہیں آنا ہے اور انہی لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے ایسے میں اس کے پاس مجبوری ہوتی ہے، کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا ہے۔

یہ صرف دو سینٹروں کی مثال ہے ورنہ یہی حال پورے اتر پردیش میں ہے، سکریٹری کسانوں کو مال برداری میں آنے والے خرچ کا حوالے دے کر ان کو ٹھگتے ہیں، ایسا نہیں کہ اعلیٰ افسران کو اس کا علم نہیں ہے، ان کو اچھے اس کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعض کسانوں سے تو سکریٹری یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ بھیا ہماری بھی کچھ مجبوری ہے، نیچے اوپر تک سب کو جاتا ہے میں اپنے گھر سے کہاں سے لا کر دوں گا، جس کا مطلب صاف ہے کہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ یوگی سرکار شفافیت کا بہت دعوی کرتی ہے لیکن یہ حقائق ان کے دعوؤں کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

یہی حال کسانوں کو گرین کارڈ پر کم شرح سود پر ملنے والے قرض کا ہے۔ کسانوں کو اپنی زمین کی کھتونی بینک کو دینی ہوتی ہے جس کے بعد 3 فیصد سے 6 اور فیصد (قرض کی مدت کے مطابق) ان کو سرکاری قرض دیا جاتا ہے، کسان جب اس قرض کے لیے جاتا ہے تو برانچ منیجر پہلے ہی اس میں اپنا حصہ واضح کر دیتا ہے۔ منیجر عموما قرض کا پانچ سے دس فیصد لے لیتا ہے، وہ یہ رقم نقد نہیں لیتا ہے کیونکہ اس میں اس بات کا ڈر ہے کہ وہ گرفت میں آجائے اس کے برعکس وہ طے کر کے جس وقت رقم ریلیز کرتا ہے تو اپنا حصہ خود ہی نکال لیتا ہے، ایسے میں وہ گرفت سے بچ جاتا ہے، کسان کو ملنے والی پوری رقم کا سود بھی ادا کرنا ہوتا ہے، جس سے کسان کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور اس کی بدحالی کی وہی پرانی تصویر باقی رہتی ہے جسے خوبصورتی میں بدلنے کے لیے وہ قرض لیتا ہے۔
وہ تو بھلا ہو بڑے شہروں کا جہاں وہ محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی کی گاڑی چلاتے ہیں ورنہ کھیتی کسانی کر کے زندگی گذارنا انتہائی دشوار ہے جس کی سب سے بڑی وجہ لاگت اور پھر پیداوار کی

کم قیمت ہے۔ کسان بیج تو آر سو سے پانچ سو روپے کلو خریدتا ہے، اس کی سینچائی کے لیے 70 روپے میں ڈیزل اور پھر وقتاً فوقتاً کئی بار اس میں کھاد ڈال کر موسم اور کیڑوں مکوڑوں سے بچاتا ہے، یہ رقم وہ بینک سے سود پر لا کر لگتا ہے جس میں پہلے سے ہی سیندھ ماری ہو چکی ہوتی ہے اور جب وہ اپنی پیداوار فروخت کرتا ہے تو سرکاری سطح پر بدعنوانی اور منڈی میں کم قیمت اس کو تباہ کر دیتے ہیں ایسے میں اس کی حالت کیسے سدھر سکتی ہے۔

نئی نسل اپنے بڑوں، بزرگوں کی حالت دیکھ رہی ہے اس لیے وہ کھیتی کسانی سے دوری اختیار کر کے دوسرے پیشے میں مستقبل تلاش کر رہی ہے لیکن یہ کوئی حل نہیں ہے کیونکہ جب اناج ہی نہیں پیدا ہوگا تو پھر لوگ کھائیں گے کیا؟ سفید پوشوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اور ان کے کنبے کا کوئی فرد کبھی کھیت کھلیان نہیں جائے گا اس لیے مستقبل کی فکر کریں۔ ملک اس وقت تک خوشحال نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ اس کا ان داتا خوشحال نہیں ہوگا، وہ زمین کا سینہ چیر کر آپ کا پیٹ بھرتا ہے اس میں وہ سردی اور گرمی کا خیال نہیں کرتا تو اس کی بھلائی کے لیے بھی آپ کو ہی سوچنا ہے۔ دیکھنے میں یہ بہت چھوٹی سطح کی بدعنوانیاں ہیں لیکن حقیقت میں کسانوں کی زندگی کے لیے یہی دیمک ہے، کسانوں کو لیوی کے سکریٹری، بینک منیجر، لیکھ پال اور تحصیلدار سے اگر بچا یا لیا جائے تو اس کی حالت بہت جلد سدھر جائے گی کیونکہ یہ سب اس کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔

# روایتوں کو توڑ کر نکل پڑی ہیں بیٹیاں

روایتیں جب ٹوٹتی ہیں تو ڈر اور خوف سب روند جاتا ہے، روایت کی جکڑ ندیوں کو توڑنے والوں کو پھر اس بت کا خوف نہیں ہوتا کہ آگے ان کے ساتھ کیا ہوگا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ روایتیں یوں ہی ٹوٹتی بھی نہیں ہیں اس کے پس پشت بہت سے عوام واسباب کارفرما ہوتے ہیں جن کے نتائج میں یہ روایتیں ٹوٹتی ہیں۔ مسلم سماج کی خواتین پر روایت پسند ہونے کا الزام عائد ہوتا رہا ہے، یہ روایت صرف روایت ہی نہیں ہے بلکہ اس روایت میں ہند اسلامی کلچر کا وہ آمیزہ ہے جسے مشرقیت کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔ مسلم خواتین عموماً گھروں میں رہنا پسند کرتی ہیں، لیکن جس طرح زمانہ نے رفتار پکڑی، وہ بھی اپنی روایتوں کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں اور زمانے کا ساتھ دیتی رہیں، آج بھی وہ نہ صرف ساتھ دے رہی ہیں بلکہ وہ اس سماج کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہیں، اس وقت انہوں نے ملک کے آئین کی روح اور اس کے تنوع کے تحفظ کی ذمہ داری اپنے دوش ناتواں پر لے رکھی ہے۔ ہر شہر میں ان کے جوش اور جذبات کا جوار بھاٹا دیکھنے کو مل رہا ہے۔ یوں تو اس وقت پورے ملک میں تقریباً 150 مقامات پر خواتین احتجاج کے لیے ہاتھوں ترنگا اور لب پر حب الوطنی کے گیت کے ساتھ  دن رات دھرنے پر بیٹھی ہوئی ہیں لیکن دہلی کا شاہین باغ اس کا مرکز بن چکا ہے جس کے بعد اب لکھنؤ کا گھنٹہ گھر پارک دوسرے بڑے مرکز کے طور پر ان شاہین صفت خواتین کے عزم وحوصلے کا گواہ بن رہا ہے۔ جہاں نعروں اور نظموں کی شکل میں ان کے جذبات سامنے آ رہے ہیں۔

کاوش عزیز ایک فوٹوگرافر ہیں اور نظمیں بھی کہتی ہیں انہوں نے یہاں احتجاج میں اپنی ایک نظم سنائی جس کے صرف دو بند پیش کرتا ہوں، دیکھیں لفظ و لہجے میں کتنی آگ اور کتنے شعلے ہیں:

تم لگاؤ ہتھکڑی، تم چلاؤ لاٹھیاں
اب مناؤ تم خیر نکل پڑی ہیں بٹیاں
سیاستوں کی آڑ میں جو ظلم تم نے ڈھائے ہیں

روایتوں کو توڑ کر نکل پڑی ہیں بیٹاں

نہ ڈر پولیس کا ہے انہیں، نہ وردیوں کا خوف ہے

مکان چھین لو گے تم، دکان چھین لو گے تم

تمہارے ڈر کو روند نے نکل پڑی ہیں بیٹاں

خواتین انسانی آبادی کا نصف بہتر ہی نہیں بلکہ اس کے وجود کی تکمیل کا اعلامیہ ہیں، جس سے کسی بھی طرح سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا" وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ"۔ تو یہ خواتین اپنے وجود سے اس وقت رنگ ہی بھر رہی ہیں۔

آزادی کے بعد ہندستانی آئین نے خواتین کو یکساں حقوق دیے، قانون نے ان کو مردوں کی طرح ہی اعلی وارفع اور برتر و بالا تصور کیا۔ آئین کی نظر میں مرد و عورت دونوں نہ صرف برابر ہیں بلکہ ملک کے وسائل پر دونوں یکساں حق ملکیت کے حامل بھی ہیں، دونوں کو اظہار رائے کی آزادی ہے۔ چونکہ اسلامی آزادی حدود و قیود کے ساتھ ہے تاکہ سماج کے تانے بانے میں کسی بھی طرح کا ادھیڑ بن نہ آئے اور توازن قائم رہے، اس لیے مسلم معاشرے پر طرح طرح کے الزامات آج بھی عائد کیے جاتے رہے ہیں۔ مسلم خواتین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو گھروں کی چہار دیواریوں میں قید رکھا جاتا ہے جو حقیقت سے بعید بات ہے۔ مسلم سماج میں ضرورت کے مطابق آزادیاں اور حد بندیاں ہیں، جب جیسی ضرورت ہوتی ہے خواتین اس طرح کے فیصلے کرتی ہیں۔

اب جب کہ آئین ہند کی روح کے منافی شہریت ترمیمی بل لا کر اور این آر سی کا اعلان کر کے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس پورے مسلم سماج کو شہریت سے محروم کر دیا جائے تو پورے ملک کے ساتھ اور مردوں کے شانہ بشانہ مسلم خواتین بھی گھروں سے نکل کر میدان میں آ گئیں تاکہ ملک کے آئین کو بچایا جا سکے۔ آئین میں جب کسی طرح کے امتیاز کو روا نہیں رکھا گیا اور اس کی اجازت نہیں دی گئی تو پھر اس کے منافی قوانین کو ملک کیسے برداشت کر سکتا ہے۔

خواتین میں جہاں شاخ گلاب کی طرح لچک ہے وہیں ان میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صلابت بھی ہے، اب تک ملک نے صرف ان کی نازکی دیکھی تھی، چند تاریخی اہمیت کی حامل خواتین کو چھوڑ کر ابھی تک ہم نے وہی قصے سنے تھے جس سے ذہن و دماغ پر غنودگی طاری ہو لیکن آنے والی نسل وہ قصے سنے گی جس میں کسی خاص خاتون کو مرکزیت حاصل نہیں ہوگی بلکہ اس دور کی ہر خاتون ایک ہی حیثیت کی حامل ہوگی، سب میں جھانسی کی رانی، بیگم حضرت محل، اودا دیوی اور جھلکاری بائی کی جھلک نظر آئے گی. آج کی خواتین اپنے عمل سے ثابت کر رہی ہیں کہ ان کا وجود صرف گھر کے رنگ اور اس کی زینت کے لیے نہیں بلکہ چمن کی آرائش میں وہ خود کو لہولہان کر لینے کا جذبہ بھی رکھتی ہیں. ایک طرف ضحاک کے دونوں شانوں کے سانپ انسانی بھیجے کے لیے پھنکار رہے ہیں، دوسری طرف کم سواد تصور کی جانے والی خواتین ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کا پھن کچلنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہی ہیں۔

آزادی کے 72 برس بعد اگر اسٹیٹ ملک کی آئینی روح اور اس کے تنوع کو بچانے کی خاطر خواتین کے گھروں سے نکلنے، رائے کے اظہار کی آزادی کے استعمال اور ظلم کا مقابلہ کرنے کی ہمت پر ان کی مذمت کرے تو یہ لمحہ فکریہ ہے. اتر پردیش ملک کی سب سے بڑی ریاست ہے اگر یہاں کے وزیر اعلی ہی آئین مخالف بیان دینے لگیں تو پھر سوال اٹھنا لازمی ہے. جس طرح کی زبان اور باڈی لنگویج کا استعمال وزیر اعلی نے ان خواتین کے لیے کیا ہے وومن کمیشن کو اس پر جواب طلب کرنا چاہیے. ان کے بیان کی زبان اور کہنے کے طریقے سے محسوس ہوتا ہے کہ مسلم خواتین کے سڑک پر نکلنے سے ان کو خوشی مل رہی ہے اور وہ ان کے اس نکلنے کو نہ صرف حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں بلکہ اظہار رائے کی آزادی سلب کرنے کو اپنا حق تصور کرتے ہیں. اتر پردیش میں کوئی ایک جگہ نہیں ہے جہاں خواتین پرامن احتجاج درج کرا رہی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر اضلاع میں خواتین نے مظاہرے شروع کر دیئے ہیں. اہم بات یہ ہے کہ مظاہرے صرف علامتی نہیں ہیں جو برائے احتجاج کیے جا رہے ہوں بلکہ ان کا ایک خاص مقصد ہے. کسی بھی جائے احتجاج پر پہنچ جائیے

فوراً احساس ہوگا کہ بے مقصد کوئی اس طرح یہاں نہیں آسکتا ہے کیونکہ ان خواتین کو سیاسی پارٹیوں کے احتجاج کی طرح نہ ہائر کیا گیا ہے اور نہ ہی لایا گیا ہے بلکہ وہ اپنی نئی نسل کو خوبصورت ہندستان دینے کے لیے خود گھروں سے نکل کر آئی ہیں۔ ان کا مقصد ہے کہ ملک کسی کی تاناشاہی کے بجائے جمہوری طرز پر چلے اسی لیے ایک منتخب حکومت کے وزیر داخلہ جب بہ بانگ دہل جب اعلان کرتے ہیں کہ جس کو جتنی مخالفت کرنا ہو کرے یہ قانون واپس نہیں ہوگا تو دوسری طرف سے آواز آتی ہے" ہم لے کے رہیں گے آزادی"۔ یہ آزادی جمہوریت میں اظہار رائے کی آزادی ہے، اپنے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہے، آئین کو آزاد کرانے کی آزادی ہے، ایک طرف طاقت اور غرور وتکبر ہے اور دوسری عزم وہمت، پامردی واستقلال ہے۔ جس سے پہاڑوں میں نہ صرف راستے بن جاتے ہیں بلکہ جوئے شیر کے سوتے بھی پھوٹ جاتے ہیں۔ سخت سردی اور اوس گرتی راتوں میں مائیں اپنے نوزائیدوں اور انگلی پکڑ کر چلنے والے بچوں کو سینے سے چمٹائے احتجاج کر رہی ہیں، اور اعلان کر رہی ہیں کہ جیسے چند دنوں قبل پولیس نے اپنی گولیوں سے ان کے بچوں کی جان لی ہے اسی طرح وہ ان پر بھی گولی چلائیں تب بھی وہ ڈٹی رہیں گی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں "میرے کفن پر لکھ دو آزادی" ان کا یہ عزم اور ہمت اس بات کی نشانی ہے کہ سرفروشی کی تمنا سے یہ سرشار ہیں، اب ان کو کوئی پیچھے نہیں ہٹا سکتا ہے۔

جمہوریت میں کوئی بھی فیصلہ ایسا نہیں ہوتا جو پتھر کی لکیر ہو، ایسے فیصلے ڈکٹیٹرشپ میں ہوا کرتے ہیں، جبکہ ہندستان تو دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے، اس کا آئین سب سے لچکدار اور مختلف ممالک کے آئین کی روح ہے، اس کے باوجود اگر ملک کے سیاستدانوں میں اتنی جمہوری قدریں نہ ہوں کہ وہ مظاہرین سے گفتگو کر کے ان کی بات سنیں اور کوئی راستہ نکالیں تو یہ آئین کی غلطی نہیں سیاست دانوں کی تمکنت کا غماز ہے۔ دہلی کے شاہین باغ میں جاری خواتین کے احتجاج کو ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے اس کے باوجود حکومت کے کسی بھی نمائندے نے ان سے مکالمے کی ضرورت نہیں سمجھی، لکھنو میں ایک ہفتے سے خواتین سرد راتوں میں ٹھٹھر رہی ہیں، کانپور،

آناؤ، اٹاوہ، آلہ آباد، بستی اور بنارس وغیرہ میں بھی احتجاج ہورہے ہیں مگر حکومت نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے یہ محسوس ہو کہ وہ احتجاج کی آواز کو اہمیت دیتی ہے بلکہ اس نے تو ہر جگہ طاقت کا استعمال کیا ہے تا کہ مخالفت کی آواز کو دبایا جاسکے، یہ خواتین کی ہمت اور ان کے استقلال کا نتیجہ ہے کہ وہ تشدد برپا کرنے والی پولیس کے سامنے ڈٹی ہوئیں ہیں۔

مرکزی وریاستی حکومتوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جمہوریت میں مخالفت ہوتی ہے، احتجاج ہوتا ہے جس سے منتخب حکومتوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے غیر شعوری طور پر کوئی ایسا قدم اٹھالیا ہے جو جمہور کی رائے کے برخلاف ہے، ایسے میں جمہوری قدروں کا تقاضہ ہوتا ہے کہ مخالفین سے گفتگو کی جائے اور ان کو یا تو مطمئن کیا جائے یا پھر قدم پیچھے کھینچے جائیں تبھی ملک کا بھلا ہوسکتا ہے، چونکہ جمہوریت میں اختلاف ہی ترقی کا نکتہ ہے، جس دن احتجاج اور اختلاف ختم ہوجایے گا اس دن جمہوریت کی روح فنا ہوجائے گی۔ اس روح کو بچائے رکھنے کے لیے حکومت کو ان خواتین اور ان کے نمائندوں سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہیے ورنہ عالمی سطح پر جمہوریت کی ریٹنگ میں ہندستان ابھی دس پوائنٹ نیچے آکر 41 سے 51 ویں نمبر پر پہنچا ہے، اگر ایسا ہی رہا تو یہ بہت جلد سینچری پار کرجائے گا کیونکہ ریٹنگ کے معیار میں اظہار رائے کی آزادی اور اختلاف کے احترام کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے جس میں ہماری مرکزی وریاستی حکومتیں بہت تیزی سے مسلسل نیچے گر رہی ہیں۔

# تشدد کی سیاہی میں عدالتیں امید کی کرن

کسی بھی مہذب معاشرے میں تشدد کی اجازت نہیں ہے خواہ وہ فکری ہو یا جسمانی، دونوں کو نہ صرف معیوب تصور کیا گیا ہے بلکہ اس کو سماج کے قاتل کے طور پر دیکھا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب/ معاشرے نے امن و امان کی تعلیم دی ہے۔ ہندستان امن و امان/ اہنسا کا داعی و مبلغ رہا ہے، دنیا میں اس کی شناخت ہی اہنسا ہے، ہندوستانی معاشرے میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کسی بھی جاندار کو قتل کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کے باوجود آج پورا ملک فکری اور عملی/ جسمانی تشدد کا شکار ہے۔

فکری تشدد کی لہر گذشتہ چند برسوں میں مزید بڑھ گئی ہے جس نے عملی تشدد کو فروغ دیا ہے جس کی وجہ سے ہمارا معاشرتی نظام تہہ و بالا ہو رہا ہے۔ اس فکری تشدد کی مثالیں حالیہ ایام میں انتخابات کے اسٹیج سے بھی سنائی دی ہیں، جس کو ہوا کسی عام آدمی نے دی بلکہ ایسے افراد اس میں ملوث ہیں جنہوں نے آئین ہند کے تحفظ کی حلفیہ ذمہ داری لی ہے، جن پر اس بات کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ معاشرے کو نہ صرف امن و امان کا گہوارہ بنائیں بلکہ ہر متشدد فکر کے خاتمے کی عملی کوشش کریں۔

ارباب اقتدار جب سماج میں ایک طبقے کو اس بات سے خوف زدہ کریں گے کہ دوسرا طبقہ جلد ہی ان کی بہو بیٹیوں، ماؤں اور بہنوں کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے زنا بالجبر کرے گا تو ظاہر سی بات ہے اس سے آپسی بھائی چارے کو تو فروغ ملے گا نہیں بلکہ اس سے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے مابین مزید دوریاں پیدا ہوں گی، اسی طرح اگر کوئی سیاسی سطح کا ذی رتبہ شخص اسٹیج سے مخالفین کو گولی مارنے کی ترغیب دے تو یقینا اس سے سماج میں عملی تشدد کو فروغ حاصل ہوگا اور سر پھرے ہاتھوں میں پستول لے کر نکل پڑیں گے جن کو نہ عوام کا خوف ہوگا اور نہ پولیس کا ڈر، ایسے میں مختلف مذاہب اور رسوم و روایات کے ماننے والوں کے مابین خونریزی ہی ہوگی جو کسی بھی مہذب سماج کو نہ زیبا دیتا ہے اور نہ ہی وہ سماج ترقیاتی منازل طے کر سکتا ہے۔

ملکی نظام کو قائم رکھنے اور قوانین پر عمل آوری کے لیے محکمہ پولیس اپنے پورے ساز وسامن کے ساتھ موجودہ ہے، جس کا کام اور ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سماج سے تشدد اور خوف کو عملاً ختم کرے لیکن اگر اس کو جانبداری کی دیمک لگ جائیں اور وہ خود سوالات کی زد میں آجائے تو ایسی صورت میں سب سے زیادہ خطرہ امن وامان کو ہی لاحق ہوتا ہے کیونکہ اس سے ایک طبقے کا اس پر سے اعتماد ختم ہوجاتا ہے۔

جب سے ملک کے دونوں ایوان نے شہریت ترمیمی بل (سی اے اے) کو منظوری دی اور صدر جمہوریہ نے اس پر دستخط کیے، پورے ملک میں احتجاج کا ایک طوفان برپا ہوگیا، ملک کا کوئی ایسا شہر نہیں جہاں اس سیاہ قانون کے خلاف مظاہرے نہ ہوئے ہوں لیکن فکری تشدد نے ارباب اقتدار کو ملک میں امن وامان اور معاشرے کی سالمیت کے لیے اس سیاہ قانون کو واپس نہیں لینے دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک دو درجن سے زائد اموات ہوچکی ہیں جن میں سے اکثر وبیشتر اموات پولیس کی غیر قانونی گولی باری میں ہوئی، اور اربوں روپے کی املاک تباہ ہوئی، جس کا الزام مظاہرین پر عائد کیا گیا۔

اتر پردیش میں مظاہرین کے خلاف سب سے زیادہ تشدد روا رکھا گیا، نہ صرف یہ کہ ان کو پولیس نے لاٹھیوں سے پیٹا بلکہ کمر سے اوپر گولیاں بھی چلائی گئیں اور جواز یہ پیش کیا گیا کہ پولیس نے اپنی حفاظت میں اس طرح کی کارروائی کی۔ بادی النظر میں پولیس کا دعوی درست محسوس ہوتا ہے کیونکہ وہ عوام کی محافظ ہے اس لیے اس پر یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تشدد کی راہ اختیار کرے گی، اسی طرح سے عوامی املاک کو نقصان پہنچانے کا الزام بھی اس پر عائد نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس سے اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے چونکہ مظاہرین میں غصہ ہوتا ہے اور وقتی طور پر وہ متشدد فکر کے حامل ہوجاتے ہیں اس لیے اس طرح کے الزامات ان پر عائد کرنا نہ صرف آسان ہوجاتا ہے بلکہ بہت آسانی سے اس تھیوری پر یقین بھی کرلیا جاتا ہے لیکن حقائق اس کے برخلاف ہیں۔ حالانکہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مظاہرین میں کچھ افراد ایسی ذہنیت

کے حامل ہوں جو پرتشدد مظاہرے میں یقین رکھتے ہوں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جب 15 اور 16 دسمبر کی شب میں طلبا کے مظاہرے کے دوران پولیس نے کارروائی کی تو جس طرح اس نے کیمپس میں کھڑی گاڑیوں اور یونیورسٹی عمارتوں/ ہاسٹل میں توڑ پھوڑ اور آگ زنی کی وہ نا قابل یقین ہے لیکن اس کا میں خود چشم دید گواہ ہوں۔ اسی طرح سے ملزمین کی گرفتاری کے لیے راتوں میں گھروں میں چھاپہ ماری کے وقت جس طرح پولیس نے گھریلو سامان کی توڑ پھوڑ کی وہ قابل مذمت ہی نہیں نا قابل معافی بھی ہے۔ میرٹھ، بجنور، فیروز آباد اور بہرائچ سمیت متعدد اضلاع میں پولیس نے اسی طرح کا تشدد اختیار کیا، سوشل میڈیا پر اس طرح کے ایک دو نہیں متعدد ویڈیو وائرل ہوئے جس میں پولیس کو عوامی املاک کو تباہ کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے، جس کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ بھی داخل کی گئیں ہیں، بدھ کو بجنور کی سیشنل کورٹ نے سی اے اے کے خلاف مظاہرہ کے دوران گرفتار کیے گیے دو ملزمین کو ضمانت دیتے ہوئے جو تبصرہ کیا ہے وہ ملک سے محبت کرنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

کورٹ نے صاف طور پر پولیس کے دلائل کو خارج کرتے ہوئے کہا کہ پولیس نے ایسے ثبوت نہیں پیش کیے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ملزمان فساد کرانا چاہتے تھے یا وہ قتل کا ارادہ رکھتے تھے، اسی طرح سے پولیس کا کوئی بھی فرد زخمی بھی نہیں ہوا ہے۔ پولیس نے بندوق کی ناجائز گولیوں کی ضبطی تو دکھائی لیکن عدالت میں وہ نہیں ثابت کر سکی کہ بندوق کی یہ گولیاں کن مظاہرین کے پاس سے برآمد کی گئیں ہیں۔ عدالت کے تبصرے ایک طبقے کے اس الزام کو درست کر رہے ہیں کہ پولیس جانبداری سے کام لے رہی ہے۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا ہے جب عدالت نے پولیس کو اس کے جھوٹ اور سازش کے لیے اس کی سرزنش کی ہو، ملیانہ اور ہاشم پورہ کے فسادات سمیت متعدد ایسے مقدمات ہیں جن میں پولیس اہلکاروں کو ایسے غیر قانونی عمل/ جرائم کے لیے سزائیں بھی ہوئی ہیں۔

شہریت ترمیمی ایکٹ (سی اے اے) کے خلاف ہوئے مظاہروں اور پولیس کی کارروائی

کے بعد جس طرح سے پورے اتر پردیش میں خوف وہراس کا ماحول ہے اس سے قبل اس طرح کا ماحول کبھی نہیں دیکھا گیا، اس وقت بھی نہیں جب 1992 میں بابری مسجد شہید کی گئی اور پورے ملک میں فساد پھوٹ پڑے تھے، لیکن اس ایکٹ کے خلاف مظاہروں کے بعد جب وزیر اعلی اتر پردیش یوگی آدتیہ ناتھ نے بدلہ لینے کی بات کہی اور پولیس نے تشدد کی انتہا کی تو پوری ریاست خوف کے ماحول میں لپٹ کر رہ گیا۔ فکری تشدد اور پولیس کی کارروائی کی سختی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے بی جے پی کی بنگال یونٹ کے صدر نے بیان دیا تھا کہ اتر پردیش میں ہماری سرکار نے مظاہرین کو کتوں کی طرح مارا ہے۔

بجنور کی شیسن کورٹ کے تبصرے نے پولیس کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے، یہ صرف ایک ضلع کا معاملہ نہیں ہے، اسی طرح سے پولیس نے ہر جگہ نہ صرف کارروائیاں کی ہیں بلکہ مظاہرین پر جھوٹے الزامات بھی عائد کیے ہیں۔ کیا اس طرح کے پولیس اہل کاروں کے خلاف بھی کوئی کارروائی ہوگی جو اپنے سیاسی آقاؤں کے سامنے سرخ روئی کے لیے بے گناہوں کی زندگی کو جہنم بنانے سے بھی باز نہیں آتے ہیں؟

جانبداری کا عالم یہ ہے کہ اگر اسکول کے درجہ چہارم کے بچے کسی ڈرامے/ پلے کے توسط سے اظہار رائے کی آزادی کے تحت سی اے اے جیسے سیاہ قانون کے خلاف آواز اٹھائیں تو پولیس ان کو حراست میں لے کر تفتیش کے نام پر گھنٹوں ان کو خوف زدہ کرتی ہے جس سے اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ پولیس فوبیا کا شکار اپنی زندگی ہی نہ تباہ کر لیں۔ دوسری طرف ایک شخص ہزاروں افراد اور پولیس کی موجودگی میں نہ صرف غیر قانونی پستول لہراتا ہے بلکہ وہ مظاہرین پر گولی بھی چلاتا ہے اور پولیس خاموش تماشائی بنی رہتی ہے، جب مظاہرین اس کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کرتے ہیں تو وہ اس کو نابالغ بتا کر اس کے جرم کا ہلکا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

سیاست دانوں اور منتظمہ کی فکری اور عملی تشدد کی وجہ سے ہی آج اہنسا کے مبلغ ہندستان کے جسم کے عضو عضو سے خون رس رہا ہے، اس کے زخموں پر کوئی مرہم رکھنے والا نہیں ہے، جب تک

ملکی نظام کے یہ دونوں باز وفکری اور عملی تشدد کو ترک کر کے غیر جانبداری کو اختیار نہیں کرتے اس وقت تک نہ تو سماج میں امن و امان قائم ہوسکتا ہے اور نہ مساوات کو فروغ مل سکتا ہے۔ تشدد اور جانبداری کی وجہ سے عوام کا اعتماد بھی متزلزل ہوتا ہے جو نظام حکومت کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ سیاست دانوں کو جہاں مقنن کے طور پر دیکھا جاتا ہے وہیں پولیس کو عوام کا محافظ تصور کیا جاتا ہے لیکن جب یہی دونوں اپنی ذمہ داریوں کے بجائے اپنے مفاد دیکھنے لگیں تو اس کے بڑے منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں، جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

ملکی نظام میں جزا وسزا اور مظلوموں کے ساتھ انصاف کے لیے عدالتیں قائم ہیں، آج بھی جمہوریت کا یہ ستون عوام کا اعتماد جمہوریت پر بحال کیے ہوئے ہے، مظلوموں کا آخری سہارا یہی در ہوتا ہے جہاں سے اس کو انصاف کی امید ہوتی ہے، ایک شیسن عدالت نے حقائق کی جانچ پرکھ بالغ نظری سے کر کے گولی مارنے اور بدلہ لینے کی دھمکی کے ماحول میں امید کی روشنی دکھائی ہے اور اسی کی وجہ سے آج بھی مظاہرین کو اس بات کی امید ہے کہ اس کو اپنا حق ضرور ملے گا کیونکہ عدالتیں فکری وعملی/ جسمانی تشدد کے دور میں امید کی کرن ہیں جن سے روشنی پھوٹنے کا یقین ہوتا ہے۔

# خوف ودہشت میں لپٹے ہوئے لوگ

کبھی کبھی حقیقت پر خوف غالب آجاتا ہے اور جب خوف غالب آتا ہے تو حقیقت اپنا وجود کھودیتی ہے، اس وقت ہندستان حقیقت سے کوسوں دور خوف ودہشت میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خوف اور دہشت پیدا کس نے کیا؟ اس کا جواب بادی النظر میں تو بہت آسان ہے لیکن حقیقت میں آسان نہیں ہے، اس کے لیے ہمیں ماضی کے دریچوں میں جھانکنا پڑے گا، جہاں سے وہ سوراخ نظر آئیں گے جن سے خوف ودہشت سماج میں آیا اور آج پورا ملک اس کی زد میں آچکا ہے۔ جب ملک آزاد ہوا تو اسی وقت سے خوف ودہشت اور نفرت کی سیاست کا آغاز ہوگیا تھا لیکن تقسیم کا زخم مندمل ہونے کے بعد یہ چادر پتلی ہوگئی تھی مگر جب جن سنگھ بی جے پی میں بدلی تو اس چادر کو دیوار کی شکل میں تبدیل کردیا گیا، اسی خوف و دہشت اور نفرت کے سہارے پارلیمنٹ میں یک عددی پارٹی تین سوممبران کے ساتھ حکومت میں آچکی ہے، اس کے باوجود اس دیوار کو گرانے کے بجائے اس کو مزید مضبوط کیا جارہا ہے اور آج حالات یہ ہوگئے ہیں کہ ملک پر دوبارہ ''مغل راج'' کا خوف کسی سیاسی اسٹیج سے نہیں پارلیمنٹ سے پھیلایا جارہا ہے اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ یہ خوف کوئی اور نہیں حکمراں پارٹی کے ممبران پھیلا رہے ہیں، جس پر سوال اٹھانے کے بجائے ان کی تائید کی جارہی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ملک وسماج میں نفرت اور خوف دہشت کی سوداگری صرف ایک ٹولہ کررہا ہے اس سے قبل حزب اختلاف جو پہلے اقتدار میں تھا وہ یہ کام کرتا رہا ہے لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ایک طبقے کو خوف میں مبتلا کرتا تھا جس میں وہ تنہا تھا، مشنری بہت معمولی سطح پر شامل تھی۔ مگر آج جو خوف ودہشت اور نفرت کو ہوا دے رہے ہیں وہ تنہا نہیں ہیں۔ انہوں نے مشنری تک کو یرغمال بنا کر نہ صرف اپنا ہمنوا بننے پر مجبور کردیا بلکہ پوری شدت کے ساتھ دایاں بازو بن کر وہ ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ یہ لوگ تنہا کسی ایک طبقے/ مذہب کے ماننے والوں کو خوف کی دھند میں نہیں لپیٹ رہے ہیں بلکہ یہ پورے ملک کو اس میں لپیٹ کر اپنی سیاسی روٹیاں سینک رہے ہیں،

یہ دوطرفہ چال چل رہے ہیں۔

بی جے پی ایک طرف نئے نئے قوانین کے ذریعہ اگر مسلمانوں کوخوف زدہ کررہی ہے تو دوسری طرف اکثریتی طبقے پر یہ خوف طاری کرنا چاہتی ہے کہ اگر اس کوووٹ نہیں دیا گیا تو ملک پر مغلوں/مسلمانوں کا راج ہوجائے گا۔ایک ممبر پارلیمنٹ کھلے عام اکثریتی طبقے کوخوف دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ بہت جلد یہ مظاہرین آپ کے گھروں میں داخل ہوکر آپ کے سامنے آپ کی بہو، بیٹیوں، ماوؤں اور بہنوں کی عزت تارتار کردیں گےتو دوسرا ایم پی پارلیمنٹ کے اندر کھڑا ہوکر کہتا ہے کہ اگر ہندواب بھی نہیں سمجھے تو ہندستان پر دوبارہ مغلوں کا راج ہوجائے گا۔اتر پردیش کے وزیر اعلی بہانگ دہل گولی کی بات کرتے ہیں۔ایک مرکزی وزیر عوام کونعروں کے ذریعہ گولی مارنے کی ترغیب دیتا ہے اور الیکشن کمیشن علامتی پابندی کا کھیل کھیل کر ملزمین کو چھوڑ دیتا ہے، پولیس بھی ان کے خلاف نفرت اور خوف ودہشت پھیلانے کی دفعات کے تحت کارروائی نہیں کرتی ہے جبکہ دوسری طرف ایک ڈراما کے ذریعہ وزیر اعظم پر تنقید کے لیے بچوں اوران کے والدین (ایک بیوہ بھی شامل ہے) پر غداری کے کیس فائل کیے جاتے ہیں۔

انتظامیہ کا دوہرا رویہ اس وقت سامنے آجاتا ہے جب وہ این آرسی کی مخالفت میں مظاہرے اور مارچ کی تو اجازت دفعہ 144 کا حوالہ دے کر نہیں دیتی جبکہ اس کی حمایت میں ریلیوں پر کوئی پابندی نہیں۔پولیس کے اس دوہرے رویہ سے عوام میں عدم اعتماد کی فضا عام ہوتی ہے لیکن اس سے حکومت اور انتظامیہ کو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کیونکہ ان کا مقصد کچھ اور ہے۔

اتر پردیش میں پولیس نے جس طرح سے خوف ودہشت پھیلائی ہے وہ لمحہ فکریہ ہے، اس نے جھوٹے مقدموں میں گرفتاریاں کرکے عوام کو جیلوں میں ٹھونس کر نہ صرف عوام میں خوف کا ماحول پیدا کیا بلکہ جمہوریت کو بھی روند کر رکھ دیا ہے۔ابھی دودن قبل اعظم گڑھ کے بلریا گنج میں رات میں ساڑھے تین بجے پولیس نے خواتین مظاہرین پر جس طرح سے کارروائی کی وہ شرمناک ہے۔ پولیس کی ایف آئی آر سفید جھوٹ کا پلندہ ہے، اس نے جس طرح سے جھوٹی اسکرپٹ لکھ کر

پرامن خواتین کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوپی پولیس نے پورے اتر پردیش میں یہی کھیل کھیلا ہے۔ مظاہرین کے مقاصد سے کون واقف نہیں؟ اس کے باوجود بلریا گنج کی ایف آئی آر میں جان لیوا حملہ، ہندو دھرم کو بھدی بھدی گالیاں جیسے متعدد ایسے الزامات لگا کر 16 دفعات 147، 148، 159، 124A، 153، 504، 505، 506، 188، 332، 333، 336، 186، 353، 307، اور 120B کے تحت ان مظاہرین کے خلاف مقدمے درج کیے، وہ مظاہرین کے بجائے فسادی قرار دیتی ہے۔

دراصل پولیس مظاہرین کی کمر ان دفعات سے توڑنا چاہتی ہے اس کا مقصد نظم و نسق کو درست کرنا نہیں ہے بلکہ اٹھنے والی آوازوں کو دبانا ہے، ان کو معلوم ہے کہ جب تک سماج میں خوف و دہشت نہیں پھیلے گا اس وقت تک ناپسند آوازیں بند نہیں ہوں گی، اگر ایسا نہ ہوتا تو پولیس خوف و نفرت پھیلانے، گولی مارنے کی ترغیب دینے اور گولی چلانے والوں کے خلاف ان دفعات سے بھی سخت دفعات کے تحت کارروائی کرتی۔ جمہوریت میں کوئی راجہ اور رنک نہیں ہوتا بلکہ سب کی حیثیت مساوی ہوتی ہے اور قانون کی نظر میں تو سب برابر ہوتے ہیں لیکن یہاں قانون کے رکھوالوں کی نظریں چندھیا جاتی ہیں اور ان کے کان بہرے ہو جاتے ہیں، حق کے لیے صدائے احتجاج بلند کرنے والی خواتین میں ان کو فسادی اور سماج میں نفرت پھیلانا نظر آجاتا ہے لیکن حقیقت میں جو لوگ نفرت پھیلاتے ہیں جو کھلے عام ایک پورے سماج کا مذاق اڑاتے ہیں نہ وہ نظر آتے ہیں اور نہ ہی ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

آج پورا ملک خوف و دہشت اور نفرت کی لپیٹ میں ہے کسی کے دل میں شہریت چھین لیے جانے کا ڈر بیٹھا ہے تو کسی کے ذہن و دماغ پر یہ خوف طاری کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ مظاہرہ کرنے والی خواتین مغلوں کا راج واپس لانے کے لیے سڑکوں پر بیٹھی ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سماج میں دہشت پیدا کرنے والے خود خوف زدہ ہیں کہ کہیں ان کے ہاتھ سے کرسی نہ چھین لی جائے اس لیے وہ چھوٹے چھوٹے قلعے فتح کرنے کے لیے خوف و دہشت اور

نفرت کا یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔

عوام کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ وہ اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں جس میں سائے کی اب کوئی حقیقت نہیں بچی ہے، اس کا وجود صرف وجود کے دم سے ہے اس لیے اب اس پر خوف کے سائے مسلط نہیں کیے جاسکتے ہیں نہ ان کو بہکایا جاسکتا ہے اور نہ ہی ورغلایا جاسکتا ہے۔ جمہوریت میں عوام ہی سب کچھ ہوتے ہیں، ان کے بغیر کچھ نہیں، اس لیے ان میں خوف و دہشت اور نفرت پھیلانے کے بجائے ان کی آواز سنی جانی چاہیے اور اگر ان کی آواز نہیں سنی جاتی ہے، ان پر خوف و دہشت طاری کر کے حکمرانی کا خواب دیکھا جارتا ہے تو یہ بہت دن نہیں چل سکتا۔ سیاہ راتیں لمبی ہوسکتی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کی سحر نہ ہو، جمہوریت اور آئین میں یقین رکھنے والوں کو اس صبح کا شدت سے انتظار ہے جو یقینا آئے گی جب سوانگ رچنے والے اس صبح کے اجالے میں بے نقاب ہوں گے، اس وقت خوف و دہشت اور نفرت کی دھند چھٹ جائے گی۔

# جمہوریت میں مطالبہ اور مکالمہ

جمہوریت میں اگر آواز نہ سنی جائے تو بھلا اس کو جمہوریت کیوں کہا جائے؟ اگر جمہوری نظام حکومت میں ایسی آواز کو حکومتیں سنتی ہیں تو ان پر آمریت کا الزام لگایا جاتا ہے اور کسی کی آواز نہ سننا آمریت کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم ہی ہے۔ دو ماہ سے شاہین باغ سمیت ملک کے متعدد مقامات پر خواتین کا مظاہرہ جاری ہے۔ یہ خواتین ایک ایسے ایکٹ کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہیں جس کے تناظر میں ان کو اپنا اور اپنی آنے والی نسلوں کا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے۔ اس ایکٹ کے مضرات و عواقب پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کا سب سے مذموم پہلو یہی ہے کہ یہ ایک ایسا ایکٹ ہے جسے ملک کی پارلیمنٹ نے آئین کے خلاف منظور کیا ہے۔ چونکہ آئین ہند مذہبی تفریق کی اجازت نہیں دیتا ہے لیکن اس ایکٹ کی بنیاد ہی اسی تفریق پر ہے، اسی لئے اس ایکٹ کے خلاف ہر مذہب اور ہر طبقے کے افراد سڑکوں پر ہیں لیکن حکومت کسی کی آواز سننے کو تیار نہیں ہے۔

جمہوریت میں اس بات کی امید ہوتی ہے کہ جب حکومت کے کسی فیصلے کے خلاف عوام سڑکوں پر نکلیں گے تو حکومت نہ صرف ان کے دکھ درد کو جاننے کی کوشش کرے گی بلکہ وہ ان سے مکالمہ کرے گی اور ان کے مسائل حل کرے گی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوام کے مطالبے ایسے ہوں جس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو تو ایسی صورت میں حکومت اور مخالفین مکالمے کے ذریعہ درمیان کی راہ نکالتے ہیں تاکہ کم سے کم لوگوں کو نقصان ہو۔ لیکن مرکز کی بھاجپا حکومت نے عوام کے مطالبے اور ان سے مکالمے پر خط تنسیخ پھیر کر درمیان کی راہ ہی بند کر دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتنا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی خواتین آج بھی ملک کے مختلف مقامات پر پولیس کی لاٹھیوں اور ان کی گالیوں کے سائے میں بیٹھی ہوئی ہیں۔

آزاد ہندستان کا یہ واحد ایسا طویل مدتی مظاہرہ ہے جب حکومت نے کسی بھی سطح پر مظاہرین سے گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھی اس کے برعکس، ان کے خلاف پولیس کریک ڈاؤن سے لے کر ہر

وہ طریقہ استعمال کیا گیا جس سے یہ مظاہرے ختم ہوجائیں ،جس کے لئے ان بااثر افراد/شخصیات کی خدمات بھی حاصل کی گئیں جو محترم ومکرم تصور کی جاتی ہیں۔ان شخصیات نے حکومت سے ایک چھوٹا سا سوال بھی مناسب نہیں سمجھا کہ آخر حکومت مظاہرین سے مکالمے کے لئے کیوں تیار نہیں ہورہی ہے؟ وہ ان میں بیٹھے ہوئے ڈر اور خوف کے خاتمہ کے لیے کوئی اقدام کیوں نہیں کررہی ہے؟ مرکزی وزیر داخلہ پہلے ''کرونالوجی'' (مرحلہ وار تسلسل) سمجھاتے ہیں اور پھر ڈنکے کی چوٹ پر پارلیمنٹ میں اعلان کرتے ہیں کہ این آر سی آکر رہے گی۔ایک دوسری جگہ یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ جس کو جو کرنا ہو کرلے سی اے اے واپس نہیں ہوگا۔کیا اس طرح کی گفتگو سے خفیہ ایجنڈے اور آمریت نہیں جھانک رہی ہے؟

وزیر قانون روی شنکر پرساد نے چند دنوں قبل جب ''اسٹرکچرڈ ڈائیلاگ'' یعنی منضبط مکالمے'' کی بات کہی تو ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ آیا آخر یہ کون سی گفتگو ہے لیکن جلد ہی بات سمجھ میں آگئی کہ اگر چہ وزیر اعظم نریندر مودی سی اے اے کے خلاف ہونے والے مظاہرے کو مخالف پارٹیوں کا ''پریوگ'' کہتے اور مانتے ہیں لیکن وزیر قانون کو اس حقیقت کا علم ہے کہ اس تحریک کا کوئی ایسا لیڈر نہیں ہے جس کو مکالمے کی میز پر آنے کے لئے دعوت دی جائے ،اس لئے انہوں نے ''اسٹرکچرڈ ڈائیلاگ'' کی اصطلاح کا استعمال کیا،جس کا مقصد یہ تھا کہ پہلے آپ ایسی کمیٹی تیار کیجئے جس سے حکومت گفتگو کرسکے۔ملک کے کونے کونے میں ایسے مظاہرے خواتین کررہی ہیں ظاہر سی بات ہے کہ ہر جگہ سے نمائندوں کو شامل نہیں کیا جاسکتا ہے، ایسے میں ان مظاہروں کے اصل مرکز شاہین باغ کے ذمہ داران/متعلقہ کمیٹی سے گفتگو کرنا چاہئے تھا۔اسٹرکچرڈ ڈائیلاگ کے ذریعہ جس منضبط گفتگو کی طرف وزیر قانون نے اشارہ کیا تھا شاہین باغ میں وہ کمیٹی موجود ہے۔گزشتہ منگل کو شاہین باغ مظاہرے کے لیگل ایڈوائزر اور ماہر قانون محمود پراچہ نے ایک انٹرویو میں واضح کیا کہ ہم سرکار سے مکالمہ کرنا چاہتے ہیں لیکن ہماری شرط یہ ہے کہ گفتگو یہاں ہوگی ،اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر سرکار کو کسی طرح کی

کوئی بھی دشواری یہاں آنے میں ہورہی ہے تو ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ ہم سے وہ گفتگو کرے ہم تیار ہیں۔لیکن وزیر قانون اس کے بعد خاموش ہوگئے دوبارہ انہوں نے اس موضوع پر کوئی گفتگو ہی نہیں کی حالانکہ حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ کسی بھی طرح کے ''انا'' میں آنے کے بجائے ان سے گفتگو کرے تاکہ ملک میں امن وسکون کا ماحول قائم ہو لیکن حکومت اس رخ پر کوئی کام نہیں کررہی ہے اور نہ ہی اس کی امید ہے کیونکہ اس کے لیڈر جگہ جگہ سی اے اے کی حمایت میں ریلیاں کررہے ہیں۔اگر اس کو مخالفین کی آواز سننا ہی ہوتا تو وہ اپ نے وزرا کو میدان میں کیوں اتارتی؟ آرایس ایس کے ''سوئم سیوک'' حکومت کے ایک فیصلے کی حمایت میں گھروں سے نکل کر پورے ملک میں کیوں پھیل جاتے؟

اب سب سے بڑا سوال ہے کہ جمہوری نظام حکومت کے باوجود مرکزی حکومت قدم کیوں پیچھے نہیں کھینچ رہی ہے؟ اس سوال پر اگر غور کریں تو چونکانے والے فکری ابعاد سامنے آئیں گے۔سب سے پہلی بات تو یہ کہ ماضی میں کئے گئے حکومت کے فیصلوں پر اگر نظر ڈالیں تو تین طلاق، دفعہ 370 کا خاتمہ، دشمن پراپرٹی قانون، بابری مسجد مقدمہ، اور سی اے اے یہ وہ اقدام ہیں جن میں آخری الذکر کے علاوہ سبھی کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے جس کی ضرب بھی ان ہی پر پڑتی ہے جبکہ آخری الذکر کی ضرب سے ملک کا ہر طبقہ متاثر ہوگا لیکن اس میں سب سے زیادہ مسلم، دلت اور آدیواسی متاثر ہوں گے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت اپنے فکری ایجنڈے پر عمل پیرا ہے اور فکر سے رجوع اتنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ارباب حکومت اور پس پردہ رہنے والے منصوبہ سازوں کو لگتا ہے کہ ''اگر ابھی نہیں تو کبھی نہیں'' اس لئے وہ ہر قیمت پر جمے رہنا چاہتے ہیں۔دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس مخالفت کے ذریعہ وہ اپنا ووٹ بینک بھی مضبوط کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ملک میں ایسی ذہنیت بنادی گئی ہے جس سے ایک طبقہ صرف اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو تکلیف ہو۔تیسری بات چونکہ مسلمان بی جے پی کا ووٹ بینک نہیں ہے اس لئے وہ ان کی آواز کو لائق اعتنا نہیں سمجھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین

/مظاہرین کوملک مخالف گردانتی ہے اوران کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرتی ہے۔

جمہوریت میں آمرانہ رویوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی ہے، کیونکہ ایسے رویے کسی بھی حکمراں کوذہنی سطح پر آمر بناسکتے ہیں ،اس کا نظارہ ایک بار آزاد ہندستان 1977-1975 اٹھارہ ماہ تک دیکھ چکا ہے۔ اگر حکومت اپنی آمرانہ روش جاری رکھتی ہے تو اس کو بھی تیار رہنا چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے جمہوری اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے جمہوریت کو بچانے کے لئے نئے سرے سے منصوبے بنائے جائیں اور ضرورت کے مطابق ان میں تبدیلیاں بھی کی جاتی رہیں کیونکہ مکالمے کی میز پر ایسے لوگوں کو لانا ہے جو پہلے مظاہرین کو غدار مان چکے ہیں لیکن دنیا میں تو ایسے لوگوں سے بھی مکالمے ہوئے ہیں جو زبانی کے بجائے حقیقی دشمن تھے اور یہ مظاہرین تو بس بنائے گئے اور مانے گئے دشمن ہیں، اس لئے آج نہیں تو کل حکومت کو مکالمے کے لئے آگے آنا ہی ہوگا، جس کے بغیر نہ مسائل حل ہوسکتے ہیں اور نہ ہی کوئی درمیان کی راہ نکل سکتی ہے۔

# اردو زبان، اقلیت اور مشترکہ تہذیب وثقافت

یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ اردو کو مسلمانوں سے وابستہ کردیا گیا ہے، ابھی تک یہ عمل خفیہ انداز میں حیلے اور بہانوں سے کیا جاتا تھا لیکن اب اس کو علی الاعلان سرکاری سطح پر کرنے کا منصوبہ بنالیا گیا ہے۔ اردو کی سب سے زیادہ خدمت یقینا مسلمانوں نے کی اور اس کی ترویج وفروغ میں سب سے نمایاں کردار ادا کیا لیکن یہ مکمل سچ نہیں ہے، اس زبان کے فروغ میں برادران وطن نے بھی اپنا پورا حق ادا کیا جس کی بنا پر ہی اردو کو قبول عام حاصل ہوا۔ سب سے پہلے ہم ایک نظر اردو زبان کی حقیقت اور اس کے ارتقا پر ڈالتے ہیں تا کہ اندازہ ہو سکے اس کا وجود کس طرح عمل میں آیا اور کیسے اس کا نام اردو پڑا۔

اردو سنسکرت کے خاندان کی زبان ہے، جسے دیو بانی کہا جاتا ہے اور ہندستان کے پس منظر میں سنسکرت نہ صرف سب سے قدیم زبان ہے بلکہ اس کو ام الالسنہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ سنسکرت سے پراکرت اور اس سے اپ بھرنش جس سے مغربی ہندی وجود میں آئی ، اور پھر اس کی پانچ بولیوں میں سے ایک کھڑی بولی ہے جس سے دو زبانیں نکلیں ایک اردو اور دوسری ہندی ۔شاجہاں نے سب سے پہلے اس زبان کا نام اردوئے معلی رکھا کیونکہ اس کے لشکر کی زبان یہی تھی۔ شمس الرحمان فاروقی کے مطابق ''جس زبان کو آج ہم اردو کہتے ہیں پرانے زمانے میں اسی زبان کو ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی اور پھر ریختہ کہا گیا اور یہ نام اسی ترتیب سے استعمال میں آئے جس ترتیب سے اوپر درج کیا گیا ہے''۔ (اردو کا ابتدائی زمانہ)۔

لفظ ''اردو'' کا سب سے پہلے استعمال ''تزک بابری میں کیا گیا۔ جہانگیر کے دربار میں جیمز اول کے ایلچی سرٹامس رو کے ساتھی ایڈورڈ ٹیری نے اپنی کتاب A Voyge to East india (1655) میں اردو کو ''اندستان'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آواخر میں انگریزوں نے ہندی/ہندوی کو ''ہندستانی'' کا نام دیا۔ اٹھارہویں صدی تک شمال میں اس کو ''ریختہ اور ہندی'' کا نام دیا گیا انیسویں صدی کے وسط میں ہندی کو ریختہ پر ترجیح دی جانے

لگی۔بیسویں صدی کے اوائل تک ''ہندی'' کواردو کے معنی میں استعمال کیا گیا۔زبان کے نام کی حیثیت سے ''اردو'' پہلی بار 1780 کے آس پاس اس کا استعمال ہوا۔(یہ معلومات شمس الرحمان فاروقی کی مذکورہ بالا کتاب سے ماخوذ ہے) جبکہ 1832 میں اردو کو سرکاری درجہ دیا گیا۔

یہ سب جمع کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اردو کوئی ایسی زبان نہیں جو باہر آنے والے مسلمان اپنے ساتھ لائے ہوں بلکہ ضرورت کے مطابق ایک زبان وجود میں آئی جس میں چمن کے سبھی مالیوں کا خون شامل تھا۔اگر کوئی زبان سرکاری ہو تو یقیناوہ زبان عام رہی ہوگی جس میں ملک کے انتظامی امور انجام دیئے جاتے رہے ہوں گے اور انگریزوں نے اس زبان کو صرف اس لئے سیکھا تاکہ وہ اپنے محکوموں کے ساتھ مکالمہ کرسکیں جن کی یہ زبان تھی،ظاہر سی بات ہے کہ رعایا میں صرف مسلمان تو تھے نہیں،اس میں ہندو بھی تھے اور ان ہی کی اکثریت بھی تھی۔جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ زبان موجودہ ہندستان کے اقلیتوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی تہذیب اور ثقافت کی زبان ہے جس کو آج بھی گنگا جمنی تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس کے باوجود آج اردو کو ہندستانی تہذیب وثقافت سے کاٹ کر اقلیت سے جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ملک کا بلکہ دنیا کا واحد سب سے بڑا ادارہ ہے جو اردو زبان کے فروغ کے لئے کام کررہا ہے۔اس کے لئے وہ متعدد وسائل کا استعمال کرتا ہے جس کے مصارف حکومت ہند برداشت کرتی ہے۔یہ ادارہ وزارت فروغ انسانی وسائل کے تحت آتا ہے۔لیکن اب وزارت اقلیتی بہبود نے پی ایم او کو خط لکھ کر یہ درخواست کی ہے کہ اس ادارے کو فروغ انسانی وسائل سے لے کر محکمہ اقلیتی بہبود کو حوالے کردیا جائے۔وزارت برائے اقلیتی بہبود نے ایچ آر ڈی سے وہ اسکیمیں بھی اس کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا ہے جو اقلیتوں کی فلاح و بہبود سے متعلق ہیں۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وزارت اقلیتی بہبود اردو کو اقلیتوں/مسلمانوں کی زبان تصور کررہی ہے۔اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ اردو کا تعلق اقلیت کے بجائے ثقافت سے ہے

۔پی ایم او نے متعلقہ اداروں سے رائیں طلب کی ہیں اب وہ اس سلسلے میں فیصلہ کرے گا، وہ کس کے حق میں فیصلہ کرتا ہے یہ تو وقت بتائے گا لیکن وزارت اقلیتی بہبود نے اپنے اس مطالبے سے ثابت کردیا ہے کہ اس کے پاس فہم وذکا نام کی چیز نہیں ہے اور نہ ہی وہ زبان کے حوالے سے کچھ واقفیت رکھتی ہے۔اس کو سب سے پہلے اس بات کا مطالعہ کرنا چاہئے تھا کہ یہ زبان کیسے وجود میں آئی ہے، اس کا تعلق کسی خاص کمیونٹی سے ہے یا پھر یہ ملک گیر زبان ہے جس میں سب کا لہو شامل ہے۔اپنے اس مطالبے سے اس نے یہ بھی ثابت کردیا کہ غور وفکر کا دائرہ بھی اس کا بہت محدود ہے۔یہ حقیقت ہے کہ موجودہ ہندستان میں برائے نام ہی برادران وطن اردو پڑھتے لکھتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے اس ثقافتی ورثے سے ہی دستبردار ہوجائیں یا کر دیئے جائیں جو ہماری شناخت ہے۔مٹتی ہوئی قدروں اور بڑھتی ہوئی خلیج کے درمیان اردو ایک ایسی زبان تھی جو دونوں طبقات کو ایک دوسرے سے جوڑ رہی تھی اس کو بھی ختم کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔سرکاری سطح پر اٹھائے والے اس قدم کے مضرات وعواقب خواہ ابھی دکھائی نہ دیں اور یہ محسوس ہو کہ یہ تو صرف ایک ادارہ کی منتقلی ہی تو ہے لیکن ایسا نہیں ہے اس کے پیچھے بہت کچھ ہے۔سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ سرکاری سطح پر اردو مسلمانوں کی زبان قرار پائے گی اور اس عمل کو حکومت کی تصدیق کے طور پر دیکھا جائے گا۔جس سے سب سے پہلے آپسی رواداری کی زبان کو دھچکا پہنچے گا۔

جب سے مرکز میں بھاجپا اقتدار میں آئی ہے، آر ایس ایس اور بھاجپا کے وہ لیڈران جن کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ مسلسل ایسے اداروں میں دخیل ہیں۔اقلیتوں کے لئے بنائی جانے والی پالیسیوں یہاں تک کہ مدارس سے متعلق اسکیموں میں بھی ان کی رائے اور مشورے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔محکمہ اقلیتی بہبود اقلیتوں اور خصوصا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے وضع کیا گیا ہے، ظاہر سی بات ہے آج کے ماحول میں اس بات سے انکار ہی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس محکمہ میں وہ لوگ دخیل نہیں ہوں گے جو اقلیتوں کو ہر محاذ پر شکست دینے اور ان کو

پیچھے دھکیلنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔اس لئے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ محکمہ اقلیتی بہبود کے اس مطالبے کے خلاف بھی مہم چھیڑی جائے تا کہ سازشی عناصر اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوسکیں۔زبانیں دو قوموں میں اشتراک اور مکالمے کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں اور اگر کوئی زبان اسی اشتراک سے ہی وجود میں آئی ہو تو اس سے بہتر اور مؤثر کوئی دوسری زبان نہیں ہوسکتی ہے اس لئے اردو زبان مسلمانوں اور برادران وطن کے مابین نقطہ اتصال اور وسیلہ اتصال کی حیثیت رکھتی ہے۔اس اتصال کو ٹوٹنے سے بچانے کیلئے لازم ہے کہ پوری شد و مد کے ساتھ میدان میں آیا جائے اور حکومت کو بتایا جائے کہ اردو زبان اقلیت کی نہیں مشترکہ تہذیب وثقافت کی زبان ہے ،اس لئے اس کو محکمہ اقلیتی بہبود سے وابستہ کر کے اقلیتوں کی زبان ہونے پر مہر نہ لگائی جائے اور اگر ایسا ہوا تو اس کے بڑے دوررس نقصانات پورے ملک کو بھگتنے پڑیں گے۔

# جمہوریت وانسانیت کی نگہبان عدلیہ

ایک جمہوری ملک میں اگر پولیس اور فسادی ایک ساتھ مل جائیں اور کسی نہ کسی سطح پر حکومت بھی ان دونوں کی حامی ہو تو اس کے نتائج کتنے خطرناک برآمد ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ دہلی کے فسادات سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک سوال ہو سکتا ہے کہ حکومت کیسے؟ تو اس کا جواب ارباب حکومت کے وہ بیانات اور رویے ہیں جو ماضی میں روا رکھے گیے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ کہنے کو تو حکومت سب کی ذمہ دار ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اگر اس فساد میں حکومت کو ملوث نہ گردانا جائے تب بھی معصوموں کے خون سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ دہلی کا نظم ونسق اسی کے ہاتھ میں ہے اور اس کو پہلے سے معلوم تھا کہ دہلی کے حالات کیسے ہیں، اس کے باوجود اس نے کبھی سی اے اے کے خلاف ہو رہے مظاہروں سے متعلق مثبت قدم نہیں اٹھایا۔ وہ نظم ونسق کے معاملے میں نہ صرف بری طرح سے ناکام ہوئی ہے بلکہ اس کو خراب کرنے میں اس کا بھی رول رہا ہے۔ جب پہلی بار دہلی میں پولیس جامعہ کے طلبا کے ساتھ بربریت کی تو وزیر داخلہ نے کہا تھا کہ پولیس نے جو بھی کیا ہے وہ درست کیا ہے اور آج بھی حکومت پولیس کے ساتھ ہی کھڑی ہے جس کے ساتھ فسادی اینٹ پتھر لیے کھڑے متعدد ویڈیوز میں دیکھے جا سکتے ہیں، سوشل سائٹس پر اس کی متعدد کلپ گردش کر رہی ہیں۔

اہنساوادی ملک میں ایسی خونریزی، ایسا تشدد امن وانسانیت کی پیشانی پر بدنما داغ سے کم نہیں، دہلی میں انسانیت پر قیامت ٹوٹی اور یوپی کے وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ کہہ رہے ہیں کہ کوئی قیامت نہیں آنے والی، اس سے بڑی اور کیا قیامت ہوگی کہ جنون نے شائع اعداد وشمار کے مطابق 28 زندگیاں خاک وخون میں لپٹا دیں، انڈین ایکسپریس کے مطابق جب سے بھاجپا دوسری بار اقتدار میں آئی ہے، اب تک 50 سے زائد افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔

ایک طرف پولیس شرجیل امام اور کفیل خان پر فساد بھڑکانے کے الزام میں این ایس اے

لگا کر ان کو سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتی ہے اور دوسری طرف پولیس کی موجودگی میں پولیس کو ہی دھمکی دینے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوتی ہے، ہندو مہا سبھا کا صدر میڈیا کے سامنے ببانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ وہ اور اس کی تنظیم کے ممبران شاہین باغ کو جلیاں نوالہ باغ بنانے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے بس ذرا سا اشارہ تو ملے۔

دہلی میں جو کچھ ہوا وہ اسی ہیٹ اسپیچ کا نتیجہ ہے جو دہلی الیکشن کے دوران مرکز میں حکمراں پارٹی کے وزراء اور ممبران پارلیمنٹ نے دی تھیں۔ یوپی کے بجٹ سیشن کے دوران وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ نے جو بیان دیا وہ بھی نہ تو پارلیمنٹری ہے اور نہ کسی ریاست کے اس اہم اور آئینی عہدے پر بیٹھے شخص کو زیب دیتا ہے، انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا کہ جو مرنے آیا ہے اس کو کون بچا سکتا ہے جس پر حکمراں پارٹی کے ممبران اور وزراء یہاں تک کہ اسپیکر بھی ہنستے ہوئے نظر آئے تھے۔ یہ سب اسی طرح کی گفتگو کا نتیجہ ہے۔

فساد کی جانچ کے لیے کمیشن تشکیل دیا جا چکا ہے لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ اس سے قبل بھی متعدد کمیشن بٹھایے گیے اور جانچ ہوئی لیکن نتیجہ کیا نکلا وہی ڈھاک کے تین پات۔ مرکز میں بھاجپا کی حکومت ہے، اس کے وزراء کھلے عام ایک طبقے کو دھمکیاں دیتے ہیں ایسے میں کیا امید کی جاسکتی ہے۔ اگر کچھ امید کی جاسکتی ہے تو صرف عدالت سے کی جاسکتی ہے کیونکہ وہی ایک ایسا ادارہ بچا ہے جس نے جمہوریت کی لاج بچا رکھی ہے ورنہ سرکار نے تو سبھی اداروں کو معذور بنا رکھا ہے۔ جس کی بدترین مثال دہلی کا پولیس محکمہ ہے جو براہ راست وزارت داخلہ کے زیر کنٹرول ہے۔

دہلی کا پولیس محکمہ پہلے دن سے ہی جانبدار ہے، خواہ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہو یا جے این یو یا فساد کے دوران اس کا کردار ہو، فساد سے قبل جس دن بھاجپا لیڈر کپل مشرا پولیس افسران کو الٹی میٹم دے رہا تھا کہ تین دن کے اندر ان مظاہروں کو ختم کرایا جائے ورنہ وہ خود سڑک پر اتریں گے اس دن بھی دونوں گروپ آمنے سامنے ہو گیے تھے۔ اہم بات یہ کہ پولیس اور کپل مشرا کے حامی ایک

طرف تھے اور دوسری طرف احتجاج کرنے والی خواتین تھیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسیاتی سطح پر ان کو پولیس کا ساتھ حاصل تھا۔ ان کو یقین تھا کہ پولیس ان کے ساتھ ہے کیونکہ دونوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ مظاہرے ختم ہوں۔ اس محکمہ نے تحفظ کے نام پر شاہین باغ کو بدنام کرنے اور سماج میں اس کے سماج مخالف ہونے کا بیانیہ قائم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا، اس نے شاہین باغ کے علاوہ دہلی سے لے کر نوئیڈا تک متعدد سڑکیں بند کر کے عوام کے دلوں میں ان مظاہرین کے خلاف نفرت بھرنے کا کام کیا اور اس کو یقین دلانے میں وہ کامیاب رہی کہ مظاہرین کی وجہ سے ہی دہلی میں جام کا مسئلہ ہے، اس کے اسی عمل کا نتیجہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے تک ان مظاہرین سے نفرت کرنے لگے اور سوال پوچھنے لگے کہ آخر دہلی کو بند کر کے یہ لوگ کیسے محب وطن ہو سکتے ہیں۔ لیکن دہلی اور یوپی پولیس کی اس گھناؤنی حرکت کی قلعی مکالمہ کار وجاہت حبیب اللہ نے اپنے اس حلف نامے کے زریعہ کھول کر رکھ دی جو انہوں نے سپریم کورٹ میں داخل کیا، جس میں انہوں نے پولیس کے اس عمل کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے عدالت کو بتایا کہ شاہین باغ کا مظاہرہ پرامن ہے۔ انہوں نے مظاہرین کی اخلاقی قدروں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا حلف نامہ داخل کیا۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور مظاہرین کے خلاف بیانیہ قایم ہو چکا تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ دہلی کے پرامن سبھی عوام ان مظاہرین سے نفرت کرنے لگے تھے، حقیقت یہ ہے کہ نفرت کے سوداگروں کے پرورش کردہ اور تربیت یافتہ ٹولے نے دہلی میں یہ قیامت مچائی ہے، جس پر عدالت نے بڑے سخت ریمارک دیے اور نفرت کی زبان بولنے والوں کے خلاف ایف آئی آر کا حکم دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دہلی کو 1984 کی طرح نہیں بننے دیں گے، اس کا اشارہ سکھ مخالف ان فسادات کے خلاف تھا جو اندرا گاندھی کے قتل کے بعد پھوٹ پڑے تھے۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے جب عدالت نے سخت ریمارکس دیے ہوں اس سے قبل بھی عدالت

نے حکومتوں کی سرزنش کی، حال ہی میں آلہ آباد ہائی کورٹ نے دوران مظاہرہ سرکاری املاک کی تباہی پر یوپی حکومت کی تاوان وصولی پر نہ صرف روک لگادی تھی بلکہ اس کے اس عمل کو غیر قانونی بھی قرار دیا تھا۔عدالت نے جوڈیشیل جانچ کی چندر شیکھر کی رٹ اگرچہ خارج کردی ہولیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ جانچ اس کی نگرانی میں ہوتی تو اس کے بہتر نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔

امن پسند عوام کو مرکز کی اس بھاجپا حکومت سے زیادہ امیدیں نہیں ہیں، جس نے ڈھائی ماہ سے چل رہے مظاہروں پر کان نہیں دھرا، مظاہرین کو سرد راتوں میں بے یارو مددگار چھوڑ کر اپنی بے فکری کی مثال قائم کی، آزاد ہند کا یہ پہلا مظاہرہ ہے جس میں ہر مذہب وملت کا ایک ازدہام ہے اور اتنے طویل عرصے سے چل رہا ہے اس کے باوجود حکومت ان سے براہ راست گفتگو کے لیے تیار نہیں، جس کی سب سے بڑی وجہ مسلم خواتین کا مرکز میں ہونا ہے۔اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ جمہوریت میں وہ نہیں ہوتا جو منتخب حکومتیں چاہتی ہیں بلکہ وہ ہوتا ہے جو عوام چاہتے ہیں، یہی جمہوریت کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے جسے مرکز کی بھاجپا حکومت نے کچل اور مسل کر رکھ دیا ہے۔

امن پسند عوام کو ملک کی عدلیہ پر یقین بنائے رکھنا چاہیے، اور اس سے امید کرنا چاہیے کہ وہ جمہوری اسٹرکچر کو تباہ ہونے سے بچانے کے ساتھ ملک کی اقلیتوں کو بھی تحفظ دے گی جس کا عندیہ اس نے پہلے دن ہی دے دیا تھا۔

آج کے ان پر آشوب حالات میں جب حکومت ملک کی راجدھانی میں نظم ونسق میں ناکام ہوئی اور انسانیت کا خون ہوا تو عدلیہ امن وانسانیت کی نگہبان کے طور پر سامنے آئی ہے جس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ جمہوریت کا ایسا ستون ہے جس پر یقینی طور سے اعتماد کیا جاسکتا ہے

# عدلیہ کی شبیہ کیوں خراب کررہی ہیں حکومتیں؟

عدلیہ ایک ایسا ادارہ ہے جس پر آج بھی عوام کا اٹوٹ بھروسہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے فیصلے کے سامنے سب سرتسلیم خم کردیتے ہیں، ہرایک سے امید بھی یہی کی جاتی ہے کہ نہ صرف وہ اس کے فیصلوں کو قبول کریں بلکہ اس کی عزت واحترام میں بھی کسی طرح کا کسر نہ چھوڑیں، کیونکہ اگر عدلیہ سے بھروسہ اٹھ گیا تو پھر کوئی ایسا در نہیں بچے گا جہاں سے انصاف کی امید کی جا سکے۔ اس معاملے میں ہندستانی مسلمان سب سے بہترین مثال ہیں۔ انہوں نے عدالت کے ایک ایسے فیصلے کو قبول کرلیا جو ان کے دین و مذہب سے تو متصادم تھا ہی انصاف کے تقاضوں کے بھی خلاف تھا لیکن اس کے احترام اور اس پر بھروسے کی لازوال مثال قائم کرتے ہوئے انہوں نے اس کے اس فیصلے کو قبول کیا۔

دوسری طرف حکومت اور اس کے اعیان ہیں جنہوں نے دہلی میں فسادات کے بعد پارلیمنٹ میں عدلیہ کو کٹہرے میں نہ صرف کھڑا کردیا بلکہ اس پر کئے جانے والے اعتماد کو بھی مجروح کیا اور اس کی شبیہ کو عوام کے سامنے مسخ کرنے کی کوشش کی۔ دہلی میں جو فسادات ہوئے وہ یکطرفہ تھے اگرچہ میں چند دوسرے طبقے کے فراد کی بھی جانیں گئیں لیکن ہمیشہ کی طرح مسلمانوں کی جان و مال کا ہی سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ جس سے متعلق متعدد رپورٹیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں، جس کے مطابق 53 افراد نے جانیں گنوائیں۔ دہلی ہائی کورٹ کے جج ایس مرلی دھر نے اس سلسلے میں سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے ''ہیٹ اسپیچ'' دینے والوں کے خلاف ایف آئی آر کی پولیس کو حکم دیا، جس کے بعد راتوں رات ان کا تبادلہ کردیا گیا اور پھر نئے آنے والے جج نے اس پر ایک طویل مدت کے لئے روک لگادی۔ پارلیمنٹ میں جب فسادات سے متعلق بحث شروع ہوئی تو حکمراں پارٹی کے ممبران نے عدلیہ کو ہی نشانے پر لے لیا اور اس کی شبیہ کو اس طرح داغدار کرنے کی کوشش کرنے لگے جو شاید اس سے قبل نہیں ہوا تھا۔

حکومت ایک ممبر پارلیمنٹ نے جہاں دہلی ہائی کورٹ کے جج سے متعلق مبہم باتیں کرتے

ہوئے ججوں سے متعلق آئی بی کی رپورٹ کو عام کرنے کا حکومت کو مشورہ دیا وہیں دوسرے ممبر پارلیمنٹ نے سپریم کورٹ کے طریقہ کار پر سوال اٹھاتے ہوئے کہا مکالمہ کے لئے ایک ایسے شخص کو مقرر کیا گیا جس نے کشمیر کے حضرت بل میں دہشت گردوں کو بریانی کھلائی تھی۔ان دونوں ممبران نے عدالت کے سلسلے میں جو تبصرے کئے اس کے بڑے دوررس منفی نتائج برآمد ہوں گے۔اس طرح کی گفتگو کے دو طرح کے اثرات دیکھنے کو مل سکتے ہیں جو ہمارے عدالتی نظام ہی نہیں ملکی نظام کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

اول اس سے ملک میں یہ پیغام گیا کہ عدالت میں بیٹھ کر انصاف کرنے والے جج انصاف کے بجائے ملک مخالف ذہنیت کے تحت فیصلے سناتے ہیں،اور وہ بھی اینٹی نیشنل ہیں کیونکہ دونوں ممبران پارلیمنٹ کی باتوں سے ایسا ہی محسوس ہوا جیسے یہ جج ملک مخالف طاقتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہوں یا پھر وہ کسی خاص ذہنیت کے تحت ایسے فیصلے کر رہے ہوں جو حکومت کو پسند نہیں۔دوم ان کے تہدید آمیز لہجے سے عدالت میں فیصلے متاثر ہوسکتے ہیں کیونکہ جس لہجے میں عدالیہ کو نشانہ بنایا گیا اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ عدلیہ کو یہ پیغام بھی دینا چاہتے ہیں کہ اگر حکومت مخالف یا حکومت فائدہ نہ پہنچانے والے فیصلے کئے گئے تو ہم عدالت کو بھی نہیں بخشیں گے۔کیونکہ بابری مسجد کے بارے میں جب اسی عدالت نے فیصلہ سنایا تھا جس میں ماہرین کے مطابق بہت سی خامیاں تھیں تو اس پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی بلکہ اس کو نریندر مودی کی حکومت کی کامیابی کے خانے ڈالا گیا اور کہا گیا کہ "مودی ہے تو ممکن ہے"۔اس فیصلے کے بعد متعدد اسٹیج سے حکمراں پارٹی کے ممبران نے اس کو عدالت کا منصفانہ یہ غیر منصفانہ فیصلہ نہ بتا کر وزیر اعظم نریندر مودی کی حکمت عملی کی جیت سے تعبیر کیا جس سے محسوس ہوا کہ یہ عدالتی فیصلے کے بجائے حکومت کا فیصلہ تھا۔لیکن اس کے برخلاف دہلی فسادات اور اینٹی سی اے اے مظاہروں سے متعلق عدالت کے طریقہ کار پر نہ صرف سوال اٹھایا گیا بلکہ ساکھ بھی خراب کی گئی۔اس سے بھی اہم بات یہ رہی کہ ممبران پارلیمنٹ کے اس طرح طرح کے تبصروں پر وزیر

قانون روی شنکر پرساد، وزیر داخلہ امیت شاہ بھی خاموش رہے اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ رہی کہ اپوزیشن نے بھی اس پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جو اس کے مردہ ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ حکومت کے فیصلوں کے خلاف اپوزیشن کے پاس عدالت کے علاوہ کوئی چارہ کار اور ہتھیار نہیں جس کے توسط سے وہ حکومت پر نکیل کسنے میں کامیاب ہو سکے اس کے باوجود سب کے سب خاموش بیٹھے رہے اور عدلیہ پر حملے ہوتے رہے۔

عدلیہ ملک کا وہ ادارہ ہے، جس پر آج بھی سب سے زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے، اس لئے اس پر ایسے تبصرے برداشت نہیں کئے جا سکتے ہیں جس سے محسوس ہو کہ اس کو متاثر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اگر کسی جج کے خلاف واقعی کوئی ایسی رپورٹ ہے جو حکومت کے پاس ہے تو پھر دھمکی کے بجائے اس کے خلاف کارروائی کی جانی چاہئے تا کہ دوسرے ججوں کو اس سے عبرت حاصل ہو اور اس کو معلوم ہو کہ شفاف عدالتی نظام میں اس طرح کے لوگوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا ہے جو انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے کسی خاص طبقے کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کر رہے ہوں یا کسی خاص ذہنیت کے تحت فیصلے دے رہے ہوں۔

دوسری طرف اتر پردیش کی یوگی سرکار ہے، اس نے بھی قانون کے برخلاف اینٹی سی اے اے مظاہرین کے پوسٹر لگا کر عوام کی ذاتی معلومات کو عام کیا جب الہ آباد ہائی کورٹ نے اس پر ایکشن لیا اور ان پوسٹروں کو ہٹانے کا حکم دیا تو اس کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ جانے کا فیصلہ کیا، سرکار کے مطابق الہ آباد ہائی کورٹ اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہئے۔ ایک طرف تو یوپی سرکار بغیر کسی قانون کے مظاہرین پر کارروائی کرتی ہے اور وہ کام وہ خود کرتی ہے جس اس کو حق ہی نہیں ہے اور جب اس کو قانون کی یاد دلائی جاتی ہے تو اس پر عمل کرنے کے بجائے عدالت کو ہی مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بیچ میں نہ آئے۔ یعنی حکومت کے مطابق عدالت کو صرف اس کے فیصلوں کی تعریف کرنا چاہئے اس پر تنقید کرنے یا قانون کے مطابق کام کرنے کا حکم دینے کا حق نہیں ہے۔

ان دونوں معاملات میں حکومتوں کے رویے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے خلاف اب عدالت کے فیصلوں کو بھی برداشت نہیں کرنا چاہتی ہیں، ان کے کانوں کو وہی فیصلے بھلے معلوم ہوتے ہیں جس سے ان کو اپنے ایجنڈے کو بڑھانے مدد ملے اور جہاں ایسا نہیں ہوتا ہے حکومتیں عدالتوں کے خلاف میدان میں آجاتی ہیں۔ مرکز اور یوپی کی ریاستی حکومتوں کے رویے اسی کے غماز ہیں۔ اگر حکومت کا رویہ عدلیہ کے ساتھ اس طرح رہا تو یہ دارہ بھی اپنا اعتماد کھوسکتا ہے، جس کے بعد فیصلے صرف حکومت کے مطابق ہوں گے اور پھر حکومت پارلیمنٹ میں جو چاہے گی قانون وضع کرے گی جس کو کہیں چیلنج نہیں دیا جا سکے گا، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اپوزیشن اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے عدلیہ کی ساکھ کو بچائے۔ حکومت اور حکمراں پارٹی کے ممبران کا فرض ہے کہ وہ عدلیہ کو کسی بھی راہ سے متاثر کرنے کے بجائے اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتے ہوئے اس کی ساکھ اور اس پر عوام کے اعتماد کو برقرار رکھیں۔ اگر حکومت کے اعیان ہی عدلیہ کی شبیہ کو خراب کریں گے تو بھلا عوام اس پر اعتماد کیسے کر سکتے ہیں؟

# سینٹ لوئس اور فلاڈلفیا ماڈل

دنیا اس وقت ایک ایسے خوف کی زد میں ہے جس کے خاتمے کا سرا ابھی تک نظر نہیں آیا ہے ، یہ اور بات ہے کہ چین کا شہر ووہان جہاں سے کرونا وائرس پھیلا وہ کھلنے کے لئے تیار ہے کیونکہ اس نے وہی راستہ اختیار کیا جو کیا جانا چاہئے تھا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا ہے جب دنیا میں کسی وبا نے ایسی تباہی مچائی ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ اس سے قبل اس طرح کا خوف کبھی نہیں پھیلا۔ دنیا کا کوئی ایسا کونا نہیں جہاں اس خوف نے اپنے پنجے نہ گاڑ دیئے ہوں اور انسانوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور نہ کر دیا ہو۔ پہلے دن سے ہی میڈکل کی دنیا اس وبا پر قابو پانے کے لئے اس کی ویکسین کی تلاش میں میں لگ گئی لیکن ابھی تک صرف جزوی کامیابی ہی مل سکی ہے۔ ابھی تک جو اہم کامیابی ملی ہے وہ ٹسٹنگ سے آگے تک نہیں بڑھ سکی ہے۔ ان سب کے درمیان اس وبا پر قابو پانے کا اب تک کا جو سب سے کامیاب طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ ہے ''لاک ڈاؤن'' یعنی شہر کو پوری طرح سے بند کر دیا جائے ، نقل و حرکت روک دی جائے۔ عالمی تاریخ میں اس لاک ڈاؤن کو ''سینٹ لوئس ماڈل'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

''سینٹ لوئس ماڈل'' ماڈل کیا ہے؟ یہ جاننا اس لئے ضروری نہیں ہے کہ اس کا ہمیں علم ہو بلکہ اس لئے اس کا جاننا ضروری ہے تا کہ اس پر کلی طور سے عمل کر کے اس کے فوائد حاصل کئے جائیں۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے 22 مارچ کو جنتا کرفیو کے بعد 23 مارچ سے 21 دن کے بند کا اعلان کیا تھا۔ ان کا یہ اعلان یوں ہی نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے بہت کچھ تھا۔ انہوں نے ''سینٹ لوئس ماڈل'' کو اختیار کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا لیکن اس ماڈل کے فوائد اس طرح حاصل نہیں ہوئے جیسے اس سے امید کی جاتی ہے۔ اس ماڈل کا مطلب ہوتا ہے پوری طرح سے قفل بندی ، دکان و مکان ہر جگہ اس کا نفاذ ، نقل و حرکت پر پوری طرح سے پابندی لیکن ہندستان میں ، اس ماڈل کے اختیار کئے جانے کے باوجود اس پر پوری طرح سے عمل نہیں ہو سکا جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔

سیاستداں جن کو سب سے پہلے اس ماڈل پر عمل کرنا چاہئے تھا سب سے پہلے غلطی انہوں نے ہی شروع کی، سب کو یاد ہوگا اتر پردیش کے وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ نے ہزاروں عقیدت مندوں کے ساتھ اجودھیا میں اس لاک ڈاؤن کے دوران پوجا کی، لکھنؤ میں ایک پارٹی میں ریاستی وزیر اور ممبران پارلیمنٹ شریک ہوئے جس میں ایک ایسی سلیبر یٹی سے ان سب کی ملاقات ہوئی جو اس وائرس کا شکار تھی، کرناٹک کے وزیر اعلی بی ایس یدوروپا ایک شادی کی تقریب میں بنفس نفیس شرکت کرتے ہیں اور مدھیہ پردیش میں اسی لاک ڈاؤن کے درمیان شیوراج سنگھ چوہان حکومت سازی کرتے ہوئے وزیر اعلی کے عہدہ کا حلف لیتے ہیں اور پارٹی ممبران خوشی میں تقریب کا اہتمام کرکے مٹھیائیاں تقسیم کرتے ہیں اور سب سے آخر میں مرکز نظام الدین دہلی میں تبلیغی جماعت کا معاملہ سامنے آتا ہے، جس کے بعد میڈیا اور سیاست داں سب ننگی تلوار کے ساتھ باہر آجاتے ہیں۔ وبا دنوں میں سیاست کا جو منظر نامہ سامنے آتا ہے وہ نہایت تکلیف دہ ہے، لیکن اس کے برعکس یہ موقع اس کا نہیں تھا کہ غلطی تلاش کی جاتی بلکہ جو نقصان ہوا ہے اور جتنے افراد اس وبائی مرض کی زد میں آئے ہیں ان کے علاج کی کوشش کی جانی چاہئے تھی۔

اوپر جتنے بھی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب "سینٹ لوئس ماڈل" کے برعکس ہیں، اگر کلی طور پر اس ماڈل کو اختیار کرلیا جاتا تو آج کرونا وائرس کی زد میں آئے مریضوں کی تعداد دو ہزار سے زائد نہ ہوتی لیکن چونکہ عوام و خواص دونوں کو اس ماڈل کے بارے میں معلوم نہیں، وہ اس لاک ڈاؤن کو "عام بند" کی طرح لے رہے تھے اس لئے روز بروز مریضوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ملک میں خوف پھیلتا گیا۔ اس وبا اور خوف پر اگر قابو پانا ہے تو "سینٹ لوئس ماڈل" کو پوری طرح اختیار کرنا ہوگا۔

1918 میں اسپینش انفلوئنزا پھیلا تھا جس نے یوروپ میں 10 کروڑ اور امریکا میں 20 لاکھ افراد کو متاثر کیا۔ یہ انفلوئنزا شروع تو اسپین میں ہوا تھا لیکن اس کا خاتمہ امریکہ میں ہوا، اس پر قابو

کیسے پایا گیا تھااس کا جاننا بے حد ضروری ہے، جس کے جانے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ہے۔ دسمبر 2019 میں جب ''نوول کرونا'' وبائی شکل میں سامنے آیا تو اس پر قابو پانے کے لئے کوئی ویکسین موجود نہیں تھی اور آج بھی دنیا اس کا علاج دریافت نہیں کرسکی ہے، ایسے میں کچھ تو کرنا ہی تھا تاکہ اس کی شدت کو روکا جاسکے، دنیا کے سامنے اس وقت دو ماڈل تھے، ایک ''سینٹ لوئس ماڈل'' اور دوسرا ''فلاڈلفیا ماڈل''۔ اسپینش انفلوئنزا جب امریکہ کے شہر فلاڈلفیا اور سینٹ لوئس پہنچا تو ان دونوں شہروں کے میئروں نے جو کیا وہ تاریخ عالم میں محفوظ ہو گیا اور دونوں ماڈل دنیا کے لئے رول ماڈل بن گئے بس فرق اتنا تھا کہ دونوں شہروں کے میئر میں سے ایک ہیرو بن گیا اور دوسرا ولن کی شکل میں آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ فلاڈلفیا کا میئر اس وقت مس بی اسمتھ اور سینٹ لوئس کا میئر کا ہنری کائل تھا۔ جب ان دونوں شہروں میں یہ وبا پھیلی تو اس کے ابتدائی ایام میں میں فلاڈلفیا کے میئر مس بی اسمتھ نے لاابالی پن اور غیر ذمہ دارانہ رویے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ عام نزلہ بخار ہے چند دنوں میں ختم ہوجائے گا اور اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن سینٹ لوئس کے میئر ہنری کائل نے کمال ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورے شہر کو بند کردیا یہاں تک کہ اس نے سینٹ پیٹرک ڈے کی پریڈ بھی منسوخ کردی اور اسی دن سے اس کا نفاذ کردیا۔ اس لاک ڈاؤن سے پورے شہر میں افراتفری پھیل گئی، لوگ میئر کے خلاف نعرے بازی بھی کرنے لگے لیکن اس نے کسی کی نہیں سنی، اس نے سب کو اپنے اپنے گھروں تک محدود کردیا لیکن کمال انتظام کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیائے خورد ونش کی دستیابی کو اس نے شہر انتظامیہ کے ذمہ کردی، کسی بھی طرح کے اجتماع کو ممنوع قرار دے دیا گیا، یہاں تک چرچ بھی بند کردیئے گئے، جنازہ پر پابندی لگادی گئی ۔یہ لاک ڈاؤن مسلسل دو ماہ تک جاری رکھا۔

ماہ نومبر 1918 میں میں جب لاک ڈاؤن ختم ہوا تو دونوں شہروں کے میئر کے اختیار کردہ عمل کے نتائج سامنے آئے ،فلاڈلفیا میں انفلوئنزا سے 60 ہزار افراد لقمہ اجل بن گئے، شہر کا کوئی گھر ایسا نہ ہو جہاں لاش نہ نکلی ہو، اہم بات یہ رہی کہ وہاں کا میئر مس بی اسمتھ خود اسی انفلوئنزا کا شکار

ہوگیا، یہ شہر اسپینش انفلوئنزا کا بد ترین شکار بنا جبکہ دوسری طرف شہر سینٹ لوئس تھا جو محفوظ ترین شہر بن کر ابھرا کیونکہ وہاں کے میئر نے جو احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور لوگوں کو ملنے جلنے سے روک کر اس متعدی مرض کو نہیں پھیلنے دیا۔ تب سے دنیا میں یہ دونوں شہر ماڈل بن کر ابھرے ہیں اور دونوں شہر کے میئر بھی اپنے اپنے عمل کی بنیاد پر تاریخ میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ آج بھی اگر ان دونوں ماڈلوں کو سامنے رکھ کر ممالک کا جائزہ لیا جائے تو اس کے نتائج بعینہ سینٹ لوئس اور فلاڈلفیا کی طرح سامنے آئیں گے۔ اٹلی، امریکہ اور برطانیہ فلاڈلفیا کی مثال بنتے جا رہے ہیں جبکہ جنوبی کوریا اور تائیوان جیسے ممالک سینٹ لوئس کی مثال ہیں اور ہندستان ان دونوں کے درمیان معلق ہے کیونکہ اس نے دونوں ماڈلوں کو ایک ساتھ اختیار کیا ہے۔ معلنہ طور پر سینٹ لوئس ماڈل کو اختیار کیا جبکہ عملی سطح پر اگر دیکھا جائے تو ہم فلاڈلفیا ماڈل پر چل رہے ہیں۔ اب تک جتنے بھی کیس سامنے آئے ہیں وہ پبلک گیدرنگ کے نتیجہ میں ہی سامنے آئے ہیں چاہے وہ لکھنؤ میں گلاکارہ کی پارٹی میں سیاسی لوگوں کی شرکت ہو یا پھر مرکز نظام الدین میں تبلیغی جماعت سے وابطہ افراد میں کرونا وائرس کے شکار لوگوں کی تعداد ہو دونوں جگہ عوام کا اجتماع ہی سبب بنا۔

اعلان کی سطح پر تو 22 مارچ کو سینٹ لوئس ماڈل کے مطابق لاک ڈاؤن کر دیا گیا لیکن محض دو دنوں کے بعد غریبوں اور مزدوروں کی نقل مکانی جب شروع ہوئی تو وہ قافلہ بنا بنا کر گجرات سے راجستھان، دہلی سے بہار اور یوپی کے لئے پیدل سفر کر رہے تھے۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب حکومت کو ان پر رحم آ گیا اور دہلی کے آنند وہار بس اڈے پر بسیں لگا دی گئیں تو اس وقت 25 سے تیز ہزار غریب مزدور جمع ہو گئے جن کا کوئی ٹیسٹ نہیں ہوا۔ ایسے میں بھلا سینٹ لوئس ماڈل کے نتائج کیسے حاصل کئے جا سکتے ہیں؟ ابھی بھی وقت ہے وزیر اعظم نریندر مودی اور ریاستوں کے وزرائے اعلی کو مذہبی تفریق سے اوپر اٹھ کر سینٹ لوئس کے میئر ہنری کائل کا کردار ادا کرنا ہوگا ورنہ اس لاک ڈاؤن کے فوائد حاصل نہیں ہوں گے اور آخر میں ہندستان ان دونوں ماڈلوں کے مابین معلق ہو کر فلاڈلفیا بن جائے گا۔

# خوف وہراس کا ماحول، میڈیا اور پولیس

جمہوریت کے چار اہم ستون ہیں، جن پر جمہوریت کا وجود منحصر ہے، اس کا وجود انسانی دنیا کے لئے اس لئے اہم ہے تا کہ ہر انسان اپنی بنیادی آزدی کے ساتھ زندگی گذار سکے، کسی سے بھی زبان، مذہب اور علاقہ سمیت دوسری کسی اور بھی بنیاد پر تعصب نہ برتا جاسکے کیونکہ تعصب انسانی دنیا کے لئے سب سے زیادہ تباہ کن ہے۔ یہ بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ آج جمہوریت کے اہم ستون "میڈیا" میں ہی تعصب ونفرت کا گھن لگ چکا ہے، جس نے اس کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ کھوکھلی میڈیا اب سماج کو کھوکھلا کر رہی ہے اس کے اندر سے محبت و الفت، رواداری اور بھائی چارے کو نکال رہی ہے۔ آج جب پوری دنیا کورونا وائرس کی زد میں ہے، ہر طرف خوف و ہراس کا ماحول ہے، ایسے میں میڈیا تعصب ونفرت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کو معلوم نہیں ہے کہ لوگ اس کی اس نفرت کو سمجھ رہے بلکہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر قائم ہے۔ تبلیغی جماعت کے ذمہ داران سے ایک غلطی ہوئی اس میں کوئی شک نہیں ہے، غلطی کی سزا کے لئے قانون ہے، عدلیہ ہے لیکن چند لوگوں کی غلطی کی سزا پورے ایک طبقے کو دینا کہاں تک درست ہے؟

میڈیا نے تبلیغی جماعت کے معاملے میں جس غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی امید نہیں کی جاسکتی تھی، ایسا نہیں ہے کہ پہلی بار اس نے کوئی خاص چشمہ لگایا ہو لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وبا کے دنوں میں جس طرح سے اس نے نفرت وتعصب کا چشمہ لگایا اور سماج کو زہر آلود کیا وہ اس کی اخلاقی گراوٹ کا غماز ہے۔ اس معاملے میں میڈیا کا کوئی ایک شعبہ ملوث نہیں ہے بلکہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے لے کر سوشل میڈیا تک ایک ہی رفتار سے بہتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

ہندستان کی سب سے بڑی نیوز ایجنسی ایشین نیوز انٹرنیشنل (اے این آئی) ہے، 9 دسمبر 1971 کو دہلی میں اس کا قیام عمل میں آیا اس ایجنسی کی مالک اے این آئی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ

ہے۔ایک معتبر ادارہ جب تعصب ونفرت کا زہر گھولتا ہے تو اس کے بڑے منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔آج جب ضرورت اس بات کی تھی کہ سبھی ہندستانی ایک قطار میں کھڑے ہوکر اس مہلک وائرس سے مقابلہ کریں ہر شخص اپنے مذہب، زبان اور علاقائیت کو طاق پر رکھ کر مریض کو صرف مریض سمجھ کر اس سے ہر انسان کو بچائے اور سماجی دوری کو یقینی بنا کر کرونا وائرس سے نجات حاصل کرے تب میڈیا نے نفرت پھیلانے کا کام شروع کردیا، ہندستان میں پہلے سے ہی کیا کم نفرت تھی جو اس موقع پر بھی نفرت کی آبیاری کو ہی مناسب ترین سمجھا گیا، اول مریض کو اس کے مذہب اور ذات و برادری سے واضح کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، دوم اگر کر بھی دیا تو جھوٹی اور گمراہ کن خبریں کیوں پھیلائی گئیں جن کی تردید ہما شمانے نہیں بلکہ خود یوپی پولیس نے آکر کی اور یہ صرف ایک معاملے میں نہیں اس طرح کے کئی معاملے سامنے آئے۔اہم بات یہ رہی کہ میڈیا نے جس انداز میں نفرت کا کھیل کھیلا اور پھیلایا اتر پردیش کی پولیس وانتظامیہ نے اسی سرعت سے اس کی تردید کی۔پہلے یہ ہوتا تھا کہ پولیس کوئی الزام عائد کرتی تھی تو میڈیا سچائی اجاگر کرتی تھی لیکن اب اس کے برعکس ہورہا ہے، پولیس نے سماج کو افواہ سے بچانے میں جو مثبت کردار ادا کیا ہے وہ لائق تعریف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوشل میڈیا کے زمانے میں چند منٹ میں جب خبر پھیلتی ہے اور اس سے جس طرح کا مائنڈ سیٹ ہوتا ہے اس کا ازالہ تردیدی خبریں نہیں کر سکتی ہیں۔میڈیا کے غلط الزامات اور پولیس کی تردید کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

اے این آئی نے 8اپریل کو اپنے ٹوئٹر پر نوئیڈا سے متعلق گوتم بدھ نگر کے ڈی سی پی سنکلپ شرما کے حوالے سے ایک خبر بریک کی کہ سیکٹر 5 ہرولا نوئیڈا میں ان افراد کو کورنٹائن کیا گیا ہے جو تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے پازیٹو افراد کے رابطے میں آئے تھے،اس خبر کے بریک ہونے کے بعد ڈی سی پی نوئیڈا کے آفیشل ٹوئٹر نے فوراً اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ آپ جعلی خبر پھیلا رہے ہیں تبلیغی جماعت کا کہیں کوئی ذکر ہی نہیں صرف پازیٹیو پائے گئے لوگوں کے رابطے میں آنے والوں کو کورنٹائن کیا گیا ہے۔زی نیوز یوپی یوکے نے 6اپریل کو فیروز

آباد سے متعلق ایک خبر ٹوئٹ کی ”فیروز آباد میں چار تبلیغی جماعتی کرونا پازیٹیو،انہیں لینے پہنچی میڈیکل ٹیم پر ہوا پتھراؤ“اس کا جواب بھی فیروز آباد پولیس نے ٹوئٹر پر آکر ری ٹوئٹ کے ذریعہ دیتے ہوئے لکھا ” آپ کے ذریعہ جھوٹ اور گمراہ کن خبر پھیلائی جارہی ہے جب کہ ضلع فیروز آباد میں نہ تو کسی میڈیکل ٹیم اور نہ ہی ایمبولنس گاڑی پر کسی طرح کا پتھراؤ نہیں کیا گیا ہے،اپنے ٹوئٹ کو فوراً ڈلیٹ کریں۔اہم بات یہ کہ اس واقعے کی فوٹو بھی پوسٹ کی گئی تھی۔ 5 اپریل کو ایک نیوز پریاگ راج (الہ آباد) سے متعلق میڈیا میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سوشل میڈیا پر چھا گئی،دیپک چورسیا نے اپنے ٹوئٹر ہنڈل سے تبلیغی جماعت ہیش ٹیگ کے ساتھ ٹوئٹ کیا ”پریاگ راج میں جماعت پر تبصرہ کرنے پر ایک نوجوان کا قتل کر دیا گیا محمد سونا پر گولی مار کر قتل کرنے کا الزام لگا ہے،تبصرہ کرنے پر گولی مارنا اتنی حیوانیت آتی کہاں سے ہے؟ پریاگ راج پولیس کے ٹوئٹر ہینڈل فوراً اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا مقتول اور ملزم دونوں پاس پڑوس کے رہنے والے ہیں،ان میں سے کسی کا بھی تعلق تبلیغی جماعت سے ہونے کی بات روشنی میں نہیں آئی ہے۔ 5 اپریل کو بارہ بنکی میں جماعت سے تعلق رکھنے والے 14 افراد کو کوارنٹائن کیا ،ان افراد کے علاوہ ایک شخص پازیٹیو پایا گیا جس کا تعلق جماعت سے نہیں تھا اس کے باوجود میڈیا میں یہ خبر بریک ہوگئی کہ جماعت کا ایک شخص پازیٹیو پایا گیا ہے جس کی تردید کے لئے ضلع مجسٹریٹ خود سامنے آئے اور بارہ بنکی پولیس نے بھی تردید کرتے ہوئے انتباہی نوٹ لکھا۔سہانپور اور بجنور سے متعلق ایک خبر سامنے آئی کہ کوارنٹائن وارڈ میں بھرتی جماعتیوں کو کھانے میں گوشت نہیں ملا تو کھانا پھینک دیا اور کھلے میں ہی رفع حاجت کردی۔یہ دونوں خبریں ایک ہندی اخبار کی ویب سائٹ نے شائع کی لیکن اس حقیقت بھی وہی نکلی جو دیگر خبروں کی تھی۔سہانپور پولیس نے اس خبر کی بھی نہ صرف تردید کی بلکہ پورا ایک نوٹ لکھا اور واضح کیا کہ یہ خبر جھوٹ ہے۔زی نیوز نے 10 اپریل کو اروناچل پردیش سے متعلق اپنے دکھائی گئی سابقہ خبر کی خود ہی تردید کرتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر لکھا ’اروناچل پردیش میں کرونا پازیٹیو کا صرف

ایک کیس سامنے آیا ہے، انسانی غلطی سے زی نیوز پر اروناچل پردیش میں تبلیغی جماعت کے 11 لوگوں کے پازیٹیو ہونے کی خبر دکھائی گئی تھی اس غلطی کے لئے ہمیں افسوس ہے"۔اس خبر کی تردید زی نیوز نے یوں ہی نہیں کی ہے بلکہ اس وجہ سے کی ہے کیونکہ اس کا تعلق سرکار تھا اور صرف جماعت سے ہوتا تو دوسری خبروں کی طرح اس کی بھی تردید نہ کی جاتی۔

ایسی جھوٹی اور نفرت آمیز خبروں کے منفی اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ راجستھان میں ڈاکٹروں نے ایک حاملہ خاتون کے علاج سے صرف اس لئے منع کر دیا کیونکہ وہ مسلم تھی جس کی وجہ سے اس کا بچہ ضائع ہوگیا، اس کا کون ذمہ دار ہوگا؟ سماج کو اگر مثبت نہج دینا ہے تو میڈیا کو اپنے فکری ایجنڈے سے الگ ہونا ہوگا، کیونکہ جب میڈیا اپنا ایجنڈا سیٹ کر لیتا ہے تو اس کے منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں اس لئے اس کو کوئی ایجنڈا نہیں سیٹ کرنا چاہئے بلکہ حالات کے مطابق اس کو سماج کے حق میں رپورٹنگ کرنی چاہئے، اگر ایسا نہ ہوا تو مستقبل کا سماج پوری طرح سے "میڈیا میڈ" ہوگا جو حقیقت میں اس کا بھی بنایا ہوا نہیں ہوگا بلکہ ان سیاسی اور فکری لوگوں کا بنایا ہوا ہوگا جو ہر حالت میں اپنے ایجنڈے کو نافذ کرنا چاہتے ہیں اور میڈیا کچھ مراعات اور وقتی فائدے کے لئے ان کا آلہ کار بن جاتی ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان ہندستان کے اس آتما اور روح کی موت ہوگی جو اس کی شناخت ہے جس کو ہم گنگا جمنی تہذیب کے نام سے جانتے ہیں۔

# ملک میں نفرت کا سر نامہ ''اشارہ وچشم پوشی''

مسیحی مشن نے علاج ومعالجہ اور طبی خدمات کے ذریعہ دلوں کو جیت کر وہ کارنامہ انجام دیا جس کی مثال دنیا کے کسی بھی مذہب میں نہیں ملتی ہے، اہم بات یہ ہے کہ ہر مسیحی فرقہ طبی خدمات کو اہمیت دیتا ہے، نوآبادیاتی ممالک میں ان ہی مشنوں کے ذریعہ مسیحیت کو فروغ دیا گیا اور ان کا تجربہ اس قدر کامیاب رہا کہ مسیحی مشنریاں پوری دنیا میں اپنا یہ برانڈ لے کر پھیل گئیں جن کے پیچھے ان کا مذہب چھپا ہوا تھا، ان مشینریوں نے دوا کے ساتھ مذہب بھی دیا جسے نوآدیاتی ممالک کے مجبور ومقہور عوام نے قبول بھی کیا، ان مشینریوں کو معلوم تھا کہ بیماری کی حالت میں مدد سے زیادہ کچھ اہم نہیں ہوتا ہے، جس کے بعد سامنے والا اس قدر احسان مند ہوجاتا ہے کہ وہ ہر بات ماننے کو تیار ہوجاتا ہے، مسیحیوں نے علاج ومعالجہ کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور آج بھی کر رہی ہیں لیکن اس کے برعکس ہندستان میں اسی علاج ومعالجہ اور طبی خدمات کو نفرت پھیلانے میں بطور آلہ استعمال کیا جارہا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ آپ ہندو اور آپ مسلمان ہیں دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں اور اگر بالفرض رہے تو محبت کے بجائے نفرت پھیلے گی اور مار پیٹ ہوگی اس لئے دونوں کو الگ ہی رہنا چاہئے۔ ہندو مسلم ایک محلے میں تو رہ سکتے ہیں، شادی بیاہ میں شرکت کر سکتے ہیں لیکن ایک وارڈ میں دونوں کا علاج نہیں ہوسکتا کیونکہ اسپتال انتظامیہ اور حکومت کے مطابق اس سے آپس میں لڑائی کا خطرہ ہے۔ یہ دلیل دے کر ہمیں سمجھایا جارہا ہے کہ اسپتال انتظامیہ نے جو کیا وہ درست کیا ہے اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ہندستان سے دھیرے دھیرے انسانیت کا جنازہ نکلتا جارہا ہے، یہاں انسان نہیں بلکہ صرف مذہب رہے گا جس میں انسانیت کے بجائے مذہبی تشدد اور مذہبی منافرت ہی ہوگی اس کے علاوہ کچھ نہیں، حالانکہ انسان پہلے انسان کی جون میں پیدا ہوتا ہے اس کے بعد وہ مذہب کی گھٹی پیتا ہے لیکن آج حالات یہ ہوگئے ہیں کہ پہلے مذہب کی گھٹی پلائی جارہی ہے اور انسانیت کو کسی اندھے غار میں پھینک کر اس کو بند کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ احمد

آباد( گجرات ) کے سول اسپتال میں جو ہوا وہ شرمسار کرنے والا ہے۔علاج ومعالجہ انسان کی ایک ایسی ضرورت ہے جس میں ایک طرف جہاں مریض یہ نہیں دیکھتا کہ علاج کرنے والا کون ہے،کہاں کا رہنے والا ہے اور کس مذہب کا ماننے والا ہے،اسی طرح ڈاکٹر بھی مریض کے بارے میں اس طرح کی باتیں سوچتا بلکہ وہ طبی خدمات کو اپنا صرف پیشہ نہیں بلکہ مذہب سمجھتا ہے،خاص طور پر ان وبائی ایام میں تو کسی بھی تعصب وتفریق کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا لیکن ایسا نہیں ہے،ہماری انسانیت اس قدر زوال پذیر ہو چکی ہے کہ اب سوچا نہیں براہ راست عمل کیا جا رہا ہے،مذہبی تفریق کی بنیاد پر مریضوں میں تفریق کی جا رہی ہے۔

چند دنوں قبل راجستھان میں ایک حاملہ عورت کو مسلم ہونے کی پاداش میں داخل نہیں کیا گیا تھا اور اب گجرات میں ہندو اور مسلم دونوں کے لئے الگ الگ وارڈ بنایئے گئے ہیں۔اہم بات یہ ہے کہ اسپتال کی انتظامیہ میڈیا سے کہتی ہے کہ جو بھی کیا گیا ہے وہ ریاستی حکومت کے احکامات کے مطابق کیا گیا ہے اس لئے جو بھی سوال کرنا ہے حکومت سے کریں دوسری طرف ارباب حکومت اس طرح کے کسی بھی حکم نامے سے انکار کر رہے ہیں لیکن اسپتال انتظامیہ پر کوئی کارروائی بھی نہیں ہو رہی ہے اس کے برعکس وزیر صحت اور نائب وزیر اعلی گجرات نتن پٹیل صاف طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ اسپتال نے آپسی رواداری کے لئے ایسا کیا ہوگا،ان کو اپنا کام کرنے دیں جس کا مطلب ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔انتظامیہ کے اس عمل پر جو آئین مخالف ہو،جس سے انسانیت پر بدنما داغ لگتا ہو،جس سے ریاستی حکومت کی بدنامی ہوتی ہو اور سب سے اہم مذہبی منافرت کو فروغ ملتا ہو اس کے خلاف کارروائی نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اندرون خانہ کچھ ضرور پک رہا ہے۔

نفرت بھرا یہ عمل بھی کوئی ایسا عمل نہیں ہے جو ایک دم سے سامنے آیا ہو یا صرف گجرات میں دیکھنے کو ملا ہو،اس کی زد میں اس وقت پورا ملک ہے جو میڈیا (پرنٹ،الیکٹرانک اور سوشل میڈیا) کی دین ہے۔اسی جگہ ایک بات اور واضح کر دوں،میڈیا کے کسی فارم میں یہ ہمت نہیں

ہے کہ وہ بغیر ارباب حل وعقد کے اشارے یا چشم پوشی کے منافرت کا یہ کھیل کھیل سکے، ایک طرف سابق آئی اے ایس افسر اور آئی پی ایس افسران (گوپی ناتھ کنن، آر ایس داراپوری) کے خلاف ایف آئی آر ہو جاتی ہے، تو دوسری طرف میڈیا بے لگام ہو کر نفرت پھیلاتی ہے اور ایک خاص مذہب کے ماننے والوں کو نشانہ بناتی ہے۔ کہنے کو سیاست داں کہتے ہیں کہ کوئی کسی کے ساتھ تفریق نہیں کر سکتا لیکن خود اندرون خانہ یہی عمل کرتے ہیں اور جلوت میں دوسروں کے اس طرح کے عمل سے چشم پوشی کر کے ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج نفرت کا یہ بیج شہروں سے دیہی علاقوں میں پھیل چکا ہے۔ لوگ سبزی فروخت کرنے والوں سے نہ صرف شناختی کارڈ اور آدھار کارڈ مانگتے ہیں بلکہ اقلیتی طبقے کا ہونے پر ان کی پٹائی بھی کرتے ہیں، اسی طرح کے ایک معاملے میں دہلی پولیس نے آئی پی سی کی دفعہ 153 (فساد و ہنگامہ کرنا) 355 (کسی شخص کی بے عزتی کرنا، مجرمانہ حملہ کرنا) 298 (جان بوجھ کر مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا) 323 (کسی کو چوٹ پہنچانا) کے تحت 13 اپریل کو ایک ایف آئی آر بھی درج کی، یہ معاملہ بدر پور (دہلی) کا تھا، جہاں سبزی فروش محمد سلیم کی پٹائی پروین ببر نے یہ کہتے ہوئے کی کہ تم لوگ جہاد کر رہے ہو، ہندوؤں کو کورونا سے مارنا چاہتے ہو۔ اس معاملے میں پولیس کا کردار بہت اچھا رہا اور اس نے صرف ایک ٹوئٹ پر ماسک پہنے رہنے کے باوجود ظالم و مظلوم دونوں کو تلاش کر لیا۔ یوپی کے مہوبہ میں بھی مسلم سبزی فروشوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے ملاقات کر کے شکایت کی کہ مسلم ہونے کی بنا پر نہ صرف یہ کہ ان سے لوگ سبزی نہیں خرید رہے ہیں بلکہ ان کی بے عزتی کر کے گاؤں سے بھگا بھی دے رہے ہیں، اسی طرح سے بلند شہر میں سبزی کے ٹھیلے پر بھگوا جھنڈا لگانے کا معاملہ سامنے آیا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ سبزی فروش اقلیتی کے بجائے اکثریتی طبقے کا ہے۔ یہ وہ چند واقعات ہیں جو سامنے آ گئے ورنہ آج حالات کس قدر خراب ہو چکے ہیں اس کا اندازہ دوران سفر بہت اچھے سے لگایا جا سکتا ہے جب ہر نگاہ ایک ٹوپی اور برقع کو صرف شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔

آزاد ہندستان میں مذہبی بنیاد پر نفرت کا زہر اس طرح سرایت کرنے کے پیچھے ایک طویل کہانی ہے جس کا سر نامہ صرف یہ ہے "اشارہ اور چشم پوشی" نے سونے کی چڑیا کو بے بال و پر کی بنا دیا ہے، ہر دل میں نفرت اور کدورت بھر دی گئی ہے، ایک طرف کہا جاتا ہے کہ "فیک نیوز" پھیلانے والوں پر کارروائی ہوگی، ان کو بخشا نہیں جائے گا اور دوسری طرف ان کا ہی آئی ٹی سیل فیک نیوز کو پھیلانے میں سب سے آگے نظر آتا ہے، سب کو معلوم ہے کہ یہ آئی ٹی سیل پہلے دن سے ایسی خبریں اور افواہیں پھیلا رہا ہے جس سے ایک طبقے کے خلاف نفرت پھیلے اور دوسرا طبقہ مجتمع ہو چونکہ اس کا فائدہ حکمراں پارٹی کو ہی ہے اس لئے ہمیشہ اس سے چشم پوشی کی گئی اور اب تک ایک بھی ایف آئی آر اس آئی ٹی سیل کے کارکنان و ذمہ داران کے خلاف درج نہیں کی گئی۔ چونکہ آئی ٹی سیل کا معاملہ براہ راست عوام سے جڑا ہوا ہے اس لئے اس کے اثرات سب سے زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے سب سے زیادہ توجہ اسی جانب دینے کی ضرورت تھی لیکن نہیں دی جا رہی ہے۔ مسلم سبزی فروشوں میں تفریق اس بات کی غماز ہے کہ ملک میں ایسے لوگ کثیر تعداد میں ہو گئے ہیں جن کے ذہن و دماغ میں نفرت بھر گئی ہے، وہ انسانیت کے بجائے نفرت کو اولیت دیتے ہیں۔

ارباب حکومت اگر واقعی ملک سے پیار کرتے ہیں تو ان کو دوہرا کھیل کھیلنے کے بجائے دل اور زبان کے تضاد کو دور کر کے خلوت و جلوت دونوں میں عوام کو یہی بتانا ہوگا کہ ملک کی ترقی نفرت نہیں محبت سے ہوگی، دوری نہیں قربت سے ہوگی، تعصب سے نہیں کشادگی سے ہوگی، مذہب کا استعمال ہم خود کو بہتر انسان اور انسانیت کو قوی تر بنانے کے لئے کریں گے جب ملک میں اچھے انسان ہوں گے تو ملک بھی ترقی کرے گا لیکن اگر مذہب کا استعمال افیم کی طرح اندھا بنانے میں کیا گیا تو کنویں میں گرنا لازمی ہے اس لئے اشارہ و چشم پوشی سے باز آ کر عہدہ و کرسی کے بجائے ملک کی فکر کرنی چاہئے، اسی طرح عوام کو بھی سوچنا چاہئے کہ کسی بھی مصیبت کی گھڑی میں کوئی سیاست داں ان کی مدد کو نہیں آتا اس وقت پڑوسی ہی کام آتا ہے خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو تو ایسے میں کسی کی گھٹی پی کر اندھا ہونے کے بجائے اپنی آنکھ کھول ہمیں رکھنا چاہئے اسی میں ملک و قوم سب کی بھلائی ہے۔

# بچوں کے تحفظ کا مسئلہ

بچے کسی بھی ملک کا مستقبل ہوتے ہیں، اسی لئے سب سے زیادہ ان پر ہی خرچ بھی کیا جاتا ہے، ان کی تعلیم و تربیت اور بہتر مستقبل کے لئےہر سطح پر کوششیں کی جاتی ہیں۔ فرد سے لے کر حکومت تک اپنا فریضہ انجام دیتی ہے، خواتین اور بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق پورا ایک محکمہ ہے جو متعدد پروگرام وضع کرتا ہے اور ان کو نافذ کر کے بچوں کی بہبود کو یقینی بناتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی کیا حالت ہے بتانے کی ضرورت نہیں ہے، کم غذائیت سے لے کر تعلیمی دشواریوں تک کا وہ شکار ہیں، کتنے بچے ایسے ہیں جن کا بچپن چھین لیا گیا ہے، وہ جہاں ایک طرف کتابوں کے بوجھ سے دبا دیئے گئے تو وہیں دوسری طرف کچھ بچے ایسے ہیں جن کا بچپن ہوٹلوں پر جوٹھے برتن دھو کر گذر رہا ہے لیکن ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں جنسی استحصال کا شکار بھی بنائے جا رہے ہیں۔ بچے چونکہ بہت معصوم اور کورے کاغذ کی طرح ہوتے ہیں اس لئے ان کو شکار بنایا جانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک انگریزی اخبار میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں ان وبائی ایام میں بچوں کے تحفظ پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا۔ یہ شبہات ہندستان کے لئے زیادہ پریشان کن ہیں کیونکہ بچوں سے متعلق پورنوگرافی میں ہندستان ایشیا میں سرفہرست ہے۔ کرونا وائرس کی وجہ سے پوری دنیا میں لاک ڈاؤن کا ماحول ہے، یہ لاک ڈاؤن بھی بچوں کے لئے خطرناک ہے۔ پولیس اور بچوں کے تحفظ کے لئے کام کرنے والی تنظیموں اور ان سے وابستہ افراد کو اس لاک ڈاؤن میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور خاص طور پر انٹرنیٹ پر اپ لوڈنگ، ڈاؤن لوڈنگ اور براؤزن کے اعداد و شمار کے لئے بے چینی ہے، ان کا ماننا ہے کہ ان حالات میں اس میں مزید اضافہ ہی ہوگا کمی کے امکانات تو بالکل نہیں ہیں۔ ان کے مطابق ایسی ذہنیت کے افراد گھروں میں قید ہونے کا مزید فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور وہ نت نئے ویڈیو دیکھ کر بعد میں مزید پریشانی کا سبب بن سکتے ہیں ایسے میں بچوں کا تحفظ لاک ڈاؤن کے بعد بڑا اہم مسئلہ بن جائے گا۔ گلوبل پارٹنرشپ ٹو انڈ وائلنس کے اگزیکیٹیو ڈائریکٹر ہاورڈ ٹیلر کا کہنا ہے کہ کرونا

وائرس جیسی وبا کے ایام میں بچوں سے متعلق جنسی مواد کے استعمال میں بے تحاشہ اضافہ ہو ہے۔جس کے لاک ڈوٴن کھلنے کے بعد منفی نتائج دیکھنے ملیں گے۔ یہ معاملہ ہندستان کے لئے مزید پریشان کن ہے کیونکہ نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو کے مطابق انٹرنیٹ پر اپلوڈ کے لئے بچوں کو استعمال کر کے ہندستان میں جو فحش مواد (پورنوگرافی) تیار کیا جاتا ہے، اس میں 2017 کے مطابق 2018 میں دگنا کا اضافہ ہوا تھا۔ 2018 میں 781 معاملات درج کئے گئے تھے جبکہ 2017 میں صرف 331 معاملات درج کئے گئے تھے۔اس لئے اس بات کا ڈر زیادہ ہے کہ ایسی ذہنیت کے حامل افراد لاک ڈاوٴن کا فائدہ اٹھائیں اور جب لاک ڈاوٴن ختم ہو تو وہ زیادہ خونخوار ہو کر سامنے آئیں۔۔

حالیہ رپورٹ کے مطابق بچوں کے جنسی استحصال ( Compilation of reports of child sexual abuse ) سے متعلق مواد میں انٹرنیٹ پر ہندستان سے شیئر کیا جانے والا مواد 11.7 فیصد ہے ۔ہندستان اس مود کو دنیا میں پھیلانے میں سرفہرست ہے۔اس طرح کے 19.87 لاکھ معاملات درج کئے گئے ہیں۔جبکہ پاکستان میں 11.5 لاکھ معاملات ہیں جو 6.8 فیصد ہے اور چوتھے نمبر پر بنگلہ دیش ہے جہاں 5.5 لاکھ معاملات درج ہوئے جو 3.3 فیصد ہے۔نیشنل سینٹر فار مسنگ اینڈ ایکسپلائیٹیڈ چلڈرین (این سی ایم ای سی) کو اس سال اس سینٹر کو 2.68 کروڑ ایسی اطلاعات آن لائن اور مینولی لوگوں کے ذریعہ موصول ہوئی ہیں، جن میں ایسی تصاویر اور ویڈیوز بھی شامل ہیں جن سے واضح اشارہ ملتا ہے کہ ان بچوں کا استعمال جنسی استحصال کے لئے ہو رہا ہے۔

برطانیہ میں انٹرنیٹ پر بچوں کے جنسی استحصال کو روکنے والی تنظیم کے ایگزکیٹیو ممبر جان کیر کا کہنا ہے کہ اس بات کا شبہ تو پہلے سے ہی تھا کہ ہندستان اس معاملے میں بہت آگے ہے، لیکن اس وقت اعداد و شمار شائع نہیں کئے جا رہے تھے اب جب اس سلسلے میں رپورٹ آئی ہے تو حیرت نہیں ہونی چاہئے بلکہ یہ اس شبے کی تصدیق ہے۔انہوں نے اس بات پر سب سے زیادہ

تشویش کا اظہار کیا کہ بچوں کے جنسی استحصال سے متعلق انٹرنیٹ پر مواد پیش کرنے والے سرفہرست چار ممالک میں سے تین کا تعلق ایشیا اور ایک ہی خطے سے ہے۔

بچوں کو جنسی استحصال بچانے کے لئے کام کرنے والی سماجی تنظیم "ٹیولر سینٹر فار پریونشن آف چائلڈ سیکسول ابیوز" سے وابستہ ودیا ریڈی کا کہنا ہے کہ ہم لوگ صرف اس بات پر توجہ نہیں دے رہے ہیں کہ اس طرح کا مواد زیادہ ڈاؤن لوڈ کیا جارہا ہے یا اس کو انٹرنیٹ پر کھولا جارہا ہے بلکہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کیا اس طرح کا نیا مواد اپلوڈ کیا جارہا ہے۔انہوں نے کہا کہ بچوں کے جنسی استحصال سے متعلق تصاویر اور ویڈیو کا ایشائی خطے میں اس کثیر تعداد میں دیکھا جانا خطرناک ہے جو نہایت تشویش کی بات ہے۔

ہندستان میں بچوں کے تحفظ کے لئے ایک جامع قانون پاسکو ایکٹ 2012 موجود ہے، اس کے باوجود 11 جنوری 2020 کو نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو (این سی آر بی) کے جاری اعداد وشمار کو دیکھ کر دل درمندر کھنے والا شخص کانپ اٹھتا ہے کہ اگر بچوں کے خلاف جرائم میں اس طرح بے تحاشہ اضافہ ہوا تو پھر بچوں اور ملک کا کیا مستقبل ہوگا۔جو بچے اس طرح استحصال کا شکار ہوں گے، ان کی زندگی، ان کا بچپن کیسا ہوگا؟ وہ بڑوں کو کن نظروں سے دیکھیں گے؟ کیا وہ کبھی اپنے بڑوں پر اعتبار کرسکیں گے؟ وہ بڑے ہوکر کیا کریں گے؟ان کی نفسیات کس طرح تشکیل پائے گی،سماج میں مثبت یا منفی کس طرح کی ان کی حصے داری ہوگی؟ یہ وہ سوالات ہیں جو اعداد وشمار دیکھنے کے بعد ذہن میں آتے ہیں نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو کے مطابق 2017 میں پروٹیکشن آف چلڈرن فرام سیکول آفنس ایکٹ (پاسکو) کے تحت 32608 معاملات درج ہوئے جبکہ 2018 میں 39827 معاملات درج ہوئے ،جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندستان میں یومیہ 109 بچے جنسی استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔جو 2017 کے مقابلے 22 فیصد کا اضافہ ہے۔اعداوشمار کے مطابق 2018 میں 21605 بچوں کا جنسی اتحصال کیا گیا جن میں 21401 بچیاں اور 204 بچے ہیں۔سب سے زیادہ معاملات 2832 مہاراشٹرا میں جبکہ دوسرے نمبر پر اتر پردیش ہے جہاں

2023اور پھر تمل ناڈو ہے جہاں 1457 معاملات درج کئے گئے۔ محض دس برس میں بچوں کے جنسی استحصال میں 6 گنا اضافہ ہوا ہے۔ 2008 میں جہاں یہ معاملات محض 22500 تھے وہیں 2018 میں 141764 ہو گئے۔ یہ تفصیلات این سی آر بی نے اپنے جاری اعداد وشمار میں مہیا کرائی ہیں۔ اتر پردیش، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش دہلی اور بہار میں ملک کے کل معاملات کا 51 فیصد ہے۔ اتر پدیش میں اس معاملے میں سرفہرست ہے جہاں 19936 معاملات درج کئے گئے جبکہ مدھیہ پردیش میں 18992 اور مہاراشٹرا میں 18892 معاملات درج کئے گئے۔

پاسکو ایکٹ 2012 ایک ایسا قانون ہے جو بچوں کو جنسی استحصال اور پورنو گرافی سے تحفظ دیتا ہے۔ لیکن کیا صرف قوانین وضع کرنے سے معاشرہ درست ہوسکتا ہے؟ جب تک اس قانون کا نفاذ اور اس کے لئے ضروری افراد اور اسٹرکچر نہ ہو، جس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسپیشل کورٹ بنائے جائیں پراسکیوٹر مقرر کئے جائیں، اور ایسے افراد تیار کئے جائیں جو ایسے بچوں کی پوری طرح سے مدد کرسکیں۔ حکومت کو پورنو گرافی اور خاصطور پر بچوں سے متعلق فحش مواد کی براوزنگ، ڈاؤن لوڈنگ اور اپ لوڈنگ پر کلی طور پر پابندی لگانی چاہئے، سرچ انجن گوگل، یوٹیوب اور دیگر سماجی روابط کی ویب سائٹ کو اس بات کے لئے پابند کرنا چاہئے کہ ہندستان میں بچوں سے متعلق فحش مواد کی نشر و شاعت نہیں کی جاسکتی ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو اس کے بہت منفی نتائج ملک کو بھگتنے پڑیں گے۔

# فکری پسماندگی اور تحریک سرسید کی معنویت

کثرت استعمال سے لفظوں/ترکیب اور جملوں کے معانی بدل جاتے ہیں جن کو ادبی زبان میں 'کلیشے' کہا جاتا ہے۔ سرسید کی تحریک کے ضمن میں 'عصری معنویت' کی ترکیب اس کثرت سے استعمال کی گئی کہ وہ بھی اسی کلیشے کے درجے میں پہنچ گئی لیکن کیا یہ درست ہے؟ بادی النظر میں دعویٰ اور دلیل دونوں درست ہیں کیونکہ اکثر و بیشتر تحریر و تقریر میں یہ ترکیب دہرائی جاتی رہی ہے لیکن اگر اس کی روح کو سمجھ لیا جائے تو کسی بھی صورت میں یہ ترکیب کلیشے کے زمرے میں نہیں آئے گی لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ سرسید تحریک کو عصر حاضر کے تناظر میں نہ صرف دیکھا جائے بلکہ آج کے مسائل کا حل ان کے افکار و نظریات اور تدبیر کی روشنی میں تلاش کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج صرف پاک و ہند ہی نہیں پورے برصغیر کا مسلمان فکری پسماندگی کا شکار ہے، ذہنی زوال اور انتشار نے مسلمانوں کی وہ حالت کردی ہے جس میں وہ احساس کمتری کا شکار ہوگئے ہیں۔ اس حالت کو اگر خاص طور پر ہندستان کے تناظر میں دیکھا جائے فکری ابتری سب سے زیادہ زوال پذیر نظر آتی ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی حالت کا جائزہ اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور تعلیمی سطح پر اگر کیا جائے تو وہ نہ صرف مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے مقابلے پسماندہ نظر آئیں گے بلکہ وہ سب سے زیادہ احساس کمتری کا شکار نظر آئیں گے جس کی سب سے بڑی وجہ ان کا ہر شعبے میں پچھڑ جانا ہے اور اس سے بھی کہیں زیادہ اور بڑا سبب فکری سطح پر کسی نہج کا نہ ہونا ہے۔ اسی طرح کے کچھ حالات وہ بھی تھے جب سرسید احمد خاں نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ 1857 کے بعد جس فکری پسماندگی کا شکار یہاں کا مسلمان ہوا تھا، آج بھی وہی حالت ہے۔ اس وقت بھی کوئی ایسی قیادت سامنے نہیں تھی جو مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لے کر ان کو اس بحرانی کیفیت سے باہر نکالتی اور آج بھی کوئی ایسی قیادت نہیں ہے جو مسلمانوں کے لئے کوئی لائحہ عمل رکھتی ہو، یہ اور بات ہے کہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے اپنے راگ کے ساتھ بہت سے لوگ میدان میں ہیں اور لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے

کی کوشش کررہے ہیں لیکن اس میں ان کے اپنے ذاتی مقاصد پوشیدہ ہیں جبکہ سرسید احمد خاں کا اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا بلکہ ان کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کو کسی طرح سے مین اسٹریم میں لایا جائے، جس کے لئے انہوں نے اپنی تحریک شروع کی جو یک رخی ہونے کے بجائے ہمہ جہت تھی۔ سرسید احمد خاں نے جہاں ایک طرف سیاسی سطح پر مسلمانوں کو ایک فکر دینے کی کوشش کی اور اپنی سیاسی بصیرت کے ذریعہ خراب حالات کو ان کے موافق بنانے میں اپنا کردار ادا کیا وہیں دوسری طرف انہوں نے تعلیم کو اپنا میدان عمل بنا کر ایک ایسی نسل کی آبیاری کی کوشش کی جس کے دم پر ہندستان میں مسلمانوں کے وجود کا استحکام تھا۔ جب حالات ابتری کا شکار ہوتے ہیں تو اخلاق حمیدہ بھی رذیلہ میں بدل جاتے ہیں اور لوگ طرح طرح کی اخلاقی آلائشوں کی زد میں آجاتے ہیں اسی کے مدنظر سرسید احمد خاں نے ذہنی تربیت اور اخلاقی اصلاح کے لئے رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا تاکہ مسلمانوں کو اخلاق حمیدہ سے متصف کرکے دوسری قوموں کے بالمقابل کھڑا کیا جاسکے۔ اس طرح سے جب سرسید احمد خاں کی زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کی کئی حیثیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک طرف جہاں وہ قومی وسیاسی رہنما کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف وہ ایک عظیم مصلح بن کر ہمارے اخلاق کو درست کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی طرح وہ تعلیمی میدان میں اپنے علم وہنر کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔

کہنے کو کہا جاسکتا ہے آج ہندستان کا مسلمان دوسرے ملکوں کے مقابلے خوش ہے لیکن جس قدر آج وہ اپنے ہی ملک میں اپنوں سے ہی خوفزدہ ہے اس سے قبل ایسا کبھی نہ تھا، کل اس کا مقابلہ ایک ایسے دشمن سے تھا جو سات سمندر پار سے آیا تھا لیکن آج اس سے وہ لوگ دشمنی نبھا رہے ہیں جو اس کے اپنے پڑوسی ہیں، جو اس کی ہر طرح کی کمزوریوں سے واقف ہیں، حالات ایسے بنا دیئے گئے ہیں اپنے ملک اور اپنے شہر یہاں تک کی اپنے گھر میں رہتے ہوئے مسلمان بے مکانی کے خوف کی زد میں ہے۔ ان حالات سے باہر نکالنے کے لئے کوئی سرسید احمد خاں بھی نہیں ہے جو دشمنی نبھانے والوں کو باور کرا سکے کہ جو وہ کررہے ہیں وہ غلط ہے، اس سے ملک کا ہی

نقصان ہے، کوئی ایسا نہیں ہے جو مسلمانوں کو اس خوف اور سراسیمگی سے نکال کر عزت کی زندگی جینے کا لائحہ عمل لے کر میدان میں آجائے اور کہے کہ ایسا کرو تو حالات بدل جائیں گے۔ ایسے میں میری نظر سر سید کی زندگی اور ان کی تحریک پر جاتی ہے اور ان حالات میں جس طرح سے انہوں نے کام کیا تھا اس کا جب جائزہ لیتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لائحہ عمل گذرے ہوئے کل کے لئے نہیں بلکہ آج کے لئے بنایا گیا تھا۔ آج بھی ہندستان میں مسلمان سب سے زیادہ تعلیمی سطح پر پسماندہ قوم ہے، جس طرح مسلمانوں کو ذلت و نکبت سے نکلنے کے لئے سر سید احمد خاں نے اس وقت عصری تعلیم کا نسخہ تجویز کیا تھا آج بھی وہ نسخہ کارگر ہے، اسی طرح اس وقت اخلاق میں اصلاح کی ضرورت تھی بعینہ آج بھی ہے۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ سر سید تحریک پر صرف بات نہ کی جائے بلکہ اس پر عمل کیا جائے اور عمل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ سر سید کی زندگی کے گوشوں کو منظر عام پر لا کر ان کی فکر کو عام نہ کیا جائے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ قوم کے اتنے بڑے مصلح کو اس قوم نے علی گڑھ کے دائرے میں محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ دینی مدارس کے نصاب میں سر سید کی تحریک کو شامل کیا جاتا اور ان کی مصلحانہ فکر سے نئی نسل کو واقف کرایا جاتا، اسی طرح سے مسلمانوں کے جتنے بھی اسکول اور کالجز ہیں ان کے نصاب میں سر سید کو ترجیحی بنیاد پر شامل کیا جاتا۔ قومی سطح پر صرف اردو کے نصاب میں سر سید کو شامل کیا گیا ہے لیکن وہ بھی ایک خاص گوشہ ہے جس کا تعلق اردو ادب میں اسلوب اور علمی نثر سے ہے، اس میں فکر کا عنصر شامل نہیں ہے۔ یہ بھی افسوس کی بات ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یونیورسٹی کا درجہ ملے سو برس گذر چکے ہیں، ابھی تک یہاں سر سید چیئر کا قیام عمل میں نہیں آسکا ہے جس کے تحت سر سید مطالعات کو فروغ ملتا۔ یہ بھی ہماری فکری زوال آمادگی کی دلیل ہے۔ اگر مسلمانوں کو ان حالات سے نکلنا ہے تو سر سید کی فکر اور ان کی تحریک ہی ان کو اس سے باہر نکال سکتی ہے۔

# کسان اور سرکاری کارندوں کی کارستانی

ہندستان ایک زرعی ملک ہے، جس کی آبادی کی اکثریت آج بھی دیہی علاقوں میں رہ کر نہ صرف زندگی گذارتی ہے بلکہ وہ دوسروں کی زندگی کو بچانے کے لئے دن رات خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں۔اعدادوشمار کے مطابق آج بھی 65.97فیصد آبادی دیہی علاقوں میں ہی رہتی ہے جبکہ 1960 میں یہ تناسب 82.08فیصد تھا۔2008میں دیہی آبادی 70فیصد تھی جو دھیرے دھیرے کم ہوتی جارہی ہے۔اس کمی کی سب سے بڑی وجہ دیہی علاقوں کا خوشحال نہ ہونا اور بنیادی سہولیات کا فقدان ہے۔اگر دیہی علاقوں میں ان کو کاروبار، تعلیم، علاج ومعالجہ اور دیگر بنیادی سہولیات میسر ہوجاتیں تو بھلا وہ نقل مکانی کیوں کرتے؟لیکن چونکہ سرکاروں نے اس جانب وہ توجہ نہیں دی جو دینا چاہئے تھا جس کی وجہ سے مستقل دیہی علاقوں سے نقل مکانی جاری ہے۔

لاک ڈاؤن میں جہاں ملک کا ہر طبقہ پریشان ہے وہیں کسان بھی اس سے بری طرح سے متاثر ہوئے ہیں۔کسانوں کا ذریعہ آمدنی زراعت کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟لیکن اگر کھیتی دھوکہ دے جائے یا عین وقت پر کوئی آسمانی آفت کھڑی فصل کو تباہ کردے تو کسان کے پاس کف افسوس کے سوا کیا ہوگا؟اس بار ربیع کی فصل امید کے مطابق بہتر ہوئی،لیکن عین وقت پر عالمی سطح کے کرونا وائرس نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔گندم کی کٹائی کے آغاز سے قبل ہی وائرس پھیلا اور پورا ملک لاک ڈاؤن ہوگیا۔اس دوران کسانوں کو کئی طرح کی دشواریاں پیش آئیں۔جس میں چھوٹے کسان سب سے زیادہ پریشان ہوئے۔کچھ کسان ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس زمین یا تو بہت کم ہوتی ہے جس سے ان کی گذر بسر نہیں ہوسکتی یا پھر وہ بٹائی پر دوسرے کی زمین میں کھیتی کسانی کرتے ہیں اس سے اس کی بھی زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی اس لئے ایسے لوگ بوائی کر کے دیہی علاقوں سے شہر کی طرف سفر کر جاتے ہیں جہاں فصل کی تیاری تک محنت مزدوری کر کے کماتے ہیں اور جیسے ہی فصل پک کر تیار ہوتی ہے وہ گھر واپس آکر اس کی کٹائی اور دوائیں میں مصروف ہوجاتے ہیں،لیکن اس بار لاک ڈاؤن کی وجہ سے جو جہاں تھا

وہیں پھنس کر رہ گیا، جس کی وجہ سے ان کو کٹائی اور دوائیں پر اچھا خاصہ خرچ کرنا پڑا ہے، جو پہلے بچ جاتا تھا۔ بڑے اور منجھیلو کسانوں نے لاک ڈاؤن میں کٹائی اور دوائیں کا کام تو کرا لیا لیکن ان کے سامنے اب اس کو فروخت کرنے کا مسئلہ ہے۔ بہت سے کسان لاک ڈاؤن کی وجہ سے اپنی کھتونی آن لائن نہیں کرا سکے، جس کی وجہ سے وہ اب پریشان ہیں۔ اس کی مدت میں سرکار کو اضافہ کرنا چاہئے۔

کسان ملک کا واحد طبقہ ہے جس کو آج تک اس کی محنت کا پھل نہیں ملا، اس سے زیادہ کوئی پسینہ نہیں بہاتا، وہ دن رات ایک کر کے سینچائی کرتا ہے، اس کی جنگلی اور آوارہ مویشیوں سے حفاظت کرتا ہے، لیکن جب غلہ تیار ہوتا تو اس کا فائدہ کسان کے بجائے بچولئے اٹھاتے ہیں۔ کسان سے جو مال خام کے طور پر خریدا جاتا ہے وہ جب فوڈ پروسیسنگ کے بعد دوبارہ اس کے ہاتھوں تک پہنچتا ہے تو اس کی قیمت میں کم سے کم پچاس گنا اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔ کسان کے آلو کی قیمت دس روپئے سے نہیں ہوتی لیکن وہی جب فرائڈ چپس بن کر بازار میں آتا ہے تو بیس روپئے کا بیس گرام ہوتا ہے اور نان فرائڈ بھی دو سو روپئے کے آس پاس فروخت ہوتا ہے جسے دوسرے لوگوں کے ساتھ کسان بھی خریدتا ہے، یہی حال مکئی، گندم، چنا اور دیگر غلہ جات کا ہے۔

اس وقت گیہوں کی کٹائی اور دوائیں تقریباً ختم ہو چکی ہے، یو پی میں آخری مرحلے میں ہوئی بارش نے 20 فیصد کسانوں کو پریشان کیا جس کی وجہ سے وہ ابھی کٹائی اور دوائیں کا کام مکمل نہیں کر سکے ہیں۔ ان کسانوں کے سامنے اس وقت سب بے بڑا مسئلہ گیہوں کی فروخت ہے، اس سے جہاں ان کو لاگت ملنا ہے وہیں آگے کے لئے پس انداز بھی کرنا ہے، کتنے ایسے کسان ہیں جو بیج، کھاد اور دوائیں دکانوں سے قرض لاتے ہیں جس کی ادائیگی ان کو گیہوں کی فروخت کے بعد کرنا ہوتا ہے۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے وہ اپنا غلہ منڈی تک نہیں پہنچا پا رہے ہیں حالانکہ ان کو اجازت ہے لیکن وہ انتظامیہ کی سختی سے ڈرے سہمے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو اپنے گھر پر ہی اس کو فروخت کرنے میں عافیت محسوس ہو رہی ہے جس کا خمیازہ بھی ان کو بھگتنا پڑ رہا

ہے۔اس کے علاوہ جو کسان منڈی تک غلہ پہنچا بھی دے رہے ہیں ان کو وہ قیمت نہیں ملتی جو ملنا چاہئے ،سرکار نے کم از کم حمایت یافتہ قیمت کا اعلان بہت پہلے کر دیا تھا جس کے مطابق اس بار گیہوں کیخر یداری 1925 روپئے میں کی جارہی ہے۔لیکن سرکار نے ایک کوئنٹل گیہوں کی قیمت 1925 روپئے پانے کے لئے اتنی شرطیں لگادی ہیں کہ وہ حاصل کر پانا اور سرکار کی اس اسکیم سے ہر کسان کا فائدہ اٹھا پانا ناممکن ہے۔

حکومت اتر پردیش 10 سرکاری ایجنسیوں کے 5811 خریداری مراکز کے توسط سے کسانوں سے گیہوں کی خریداری کر رہی ہے جس میں پی سی ایف کے 3104 اور محکمہ غذا اور رسد کے تقسیم کار شاخ کے 925 مراکز ہیں۔ان سبھی مراکز سے سرکار کو 55.000000 ٹن گیہوں کی خریداری کرنا ہے۔06.05.2020 تک 176059 کسانوں سے 951329.714060 کوئنٹل گیہوں کی خریداری کی جا چکی ہے۔گذشتہ برس 50 لاکھ میٹرک ٹن گیہوں خرید کا ہدف رکھا تھا لیکن خرید 53 لاکھ میٹرک تھا جس کے بعد اس بار 55 لاکھ میٹرک ٹن کا ہدف رکھا گیا۔جہاں تک بات قیمت میں اضافے کی ہے تو 2018 میں 1735 روپئے، 2019 میں 1840 روپئے اور 2020 میں 1925 روپئے میں گیہوں خریدا گیا۔آخری دو سال میں 5.50 فیصد کا اضافہ کیا گیا ۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سال در سال سرکاری خرید اور قیمت میں اضافہ کے باجود کسانوں کی حالت بہتر کیوں نہیں ہوتی ،اس کے ایک دو نہیں بہت سے اسباب ہیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ غلہ میں گھن اور لکڑی میں دیمک اگر لگ جائیں تو جب تک ان کو اس سے الگ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ان دونوں کا وجود نہیں بچایا جاسکتا ہے، یہی حال کسانوں کا ہے، جب تک ان کسانوں کو بچولیوں اور ان افسران و ملازمین سے نہیں بچایا جائے گا جن کے توسط سے گیہوں کی خریداری کی جارہی ہے اس وقت تک ان کی زندگی میں سکھ نہیں آسکتا ہے۔

کہنے کو تو سرکار نے آن لائن سسٹم بنا دیا ہے لیکن اس سسٹم میں سیندھ ماری کے راستے بھی نکالئے گئے ہیں۔یہ کوئی اور نہیں بلکہ وہ کارندے ہیں جو کسانوں کو مستفید کرنے پر مامور کئے گئے

ہیں، کسانوں کو لوٹنے کا عمل ان ہی لوگوں سے شروع ہوتا ہے۔ ایک طرف جہاں منڈی میں گندم 1600 سے 1700 فی کوئنٹل خریدا جارہا ہے، جس سے کسانوں کے بجائے کاروباری فائدہ اٹھا رہے ہیں وہیں دوسری طرف سرکاری خریداری مراکز پر اصل قیمت 1925 میں 100 سے 125 روپئے کم پر خریداری ہو رہی ہے حالانکہ آن لائن نظام کی وجہ سے کاغذات تو درست ہوتے ہیں لیکن اس کا دوسرا راستہ اس طرح سے نکال لیا گیا ہے کہ رقم کی مقدار میں گندم زیادہ لیا جاتا ہے اور بتا کر لیا جاتا ہے، مجبوری میں کسان کو زیادہ غلہ دینا پڑتا ہے، یہ صرف گندم ہی نہیں دھان خریداری میں بھی اسی طرح کا کھیل ہوتا ہے، چونکہ لیوی کے سکریٹری ہی سارا کام کرتے ہیں اس لئے ان کے آگے کسی کی نہیں چلتی ہے، بعض سکریٹری تو کسانوں کو اخراجات بھی بتاتے ہیں کہ باردانہ، ڈھلائی اور تلائی پر خرچ ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہ سارے اخراجات کسان کو برداشت نہیں کرنا ہوتا بلکہ حکومت اس کا پورا انتظام کرتی ہے۔ سکریٹری اضافی غلے کو اپنے اعتبار سے سرکار سے ہی فروخت کر کے دہرا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک راستہ اور ہے خود خریداری مراکز کے سکریٹری بڑے کسانوں سے مل کر دوسرے کسانوں کے کھاتوں پر غلہ لگواتا ہے جس میں وہ موٹا کمیشن لیتا ہے، چونکہ سرکار پیداوار کے مقابلے بہت کم مقدار میں گیہوں کسان سے خریدتی ہے اس لئے وہ اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں، حالانکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کیسانوں کو فائدہ پہنچایا جا سکے مگر چھوٹے کسان خریداری کے مشکل عمل اور بچولیوں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے اس سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے ہیں، اس لئے وہ منڈی یا گھروں پر ہی کم داموں پر فروخت کرنے میں عافیت تصور کرتے ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکار جہاں ایک طرف اپنے کارندوں کی لوٹ کھسوٹ سے کسانوں کو بچانے کے لئے ایک مضبوط لائحہ عمل تیار کرے وہیں منڈی میں فروخت کے لئے بھی قیمتوں کا تعین کردے، اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو دن رات خون پسینہ ایک کرنے والے کسانوں کے ہاتھ میں ڈھاک کے تین پات کے سوا کچھ نہیں آنے والا ہے۔

# ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

دست مزدور سے پتھر بھی سنور جاتے ہیں، لیکن یہ دستور زمانہ قدیم سے رہا ہے کہ جن ہاتھوں نے پتھروں کی قسمت سنواری، ریگزار کو گلزار میں تبدیل کیا، حسین تاج محل دے کر محبت کو امر کر دیا ان ہی کو کاٹ دیا گیا، آج بھی وہی سلسلہ جاری ہے بس فرق اتنا ہے کہ اس وقت یہ اس لئے کیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے ہنر کا دوسری جگہ مظاہرہ نہ کرسکیں اور اب اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ بچے، جو ہے سب چوس کر ان کے خون کا گارا اور جسم کو مسطح کر کے اس پر ترقی کے عمارت کی بنیاد رکھی جا سکے۔ ہماری حکومتیں بھی یہی کرنے لگی ہیں، وہ مزدوروں کو سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں دے کر خزانہ ضرور بھرنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن یہ حقیقت فراموش کر رہی ہیں کہ وہ درحقیقت ملک کے وجود (مین پاور) کے ساتھ کھلواڑ کر رہی ہیں۔ان ملازمین/مزدوروں کا خون چوسنے میں ملکی و غیر ملکی دونوں سرمایہ کار شامل ہوں گے۔مرکزی حکومت نے 20 لاکھ کروڑ روپئے کے پیکج کا اعلان کیا ہے، وزیر اعظم نریندر مودی کے مطابق اخراجات کا ارتکاز چھوٹی صنعتیں، متوسط طبقہ اور کسان و مزدور ہوں گے تاکہ ملک خود کفیل بن سکے اور لوگوں کا خود پر اعتماد و یقین بڑھ سکے لیکن اس اعلان سے قبل ہی تین ریاستی حکومتوں نے جو تحفہ مزدور و ملازمین کو دیا ہے وہ کبھی بھول نہیں سکیں گے کیونکہ اس سے ان کی زندگی اب مزید جہنم بننے والی ہے اور ان کی حیثیت بندھوا مزدوروں کی ہونے والی ہے۔

بی جے پی پر صنعت کار حامی پارٹی کا لیبل پہلے سے ہی لگتا رہا ہے، اس نے اپنی اس شبیہ کو کبھی بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وقتاً فوقتاً اس نے ایسے کام کئے جس نے اس پر مہر ہی ثبت کی اور اس بات کو پایہ یقین تک پہنچایا کہ وہ واقعی صنعت کاروں اور پونجی پتیوں کی حامی پارٹی ہے۔جس کی بدترین مثال حال ہی میں حکومت اتر پردیش، حکومت مدھیہ پردیش اور گجرات نے پیش کی ہے۔جبکہ کرناٹک کی حکومت نے تو مزدوروں کو آنے ہی نہیں دیا کیونکہ وہاں کے تعمیراتی و دیگر کاموں پر ضرب آتی۔کرونا سے لڑنے اور غریب مزدوروں کو کام دیئے جانے کے

نام پر ان کی فلاح و بہبود کے لئے وضع کئے گئے قوانین اور اصول وضوابط کو اول الذکر دو ریاستوں نے 1000 ایام یعنی تقریباً تین برس جبکہ گجرات نے 1200 ایام یعنی تین برس چار ماہ کے لئے کالعدم قرار دے دیا ہے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے، وہ ملازمین/مزدور جو ڈھائی ماہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، جن کے پاس اب کھانے کو کچھ نہیں بچا ہے، کسی طرح سے ہزار دشواریاں جھیل کر اپنی آبائی ریاست پہنچے ہیں یا پہنچیں گے، اب ان کو اپنی ان دونوں ریاستوں میں دہری مار جھیلنی پڑے گی۔

ہندستان ایک ایسا ملک ہے جو معاشیات (جی ڈی پی) کے معاملے میں دنیا میں پانچویں نمبر ہے جبکہ قوت خرید (پی پی پی) کے معاملے میں وہ تیسرے مقام پر ہے، یہ نمبر سازی انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (آئی ایم ایف) نے 2019 کے اواخر میں کی تھی جسے فروری 2020 میں شائع کیا گیا۔ 2010 میں ہندستان نویں مقام پر تھا۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر دس برسوں میں کس طرح سے چار مقام کی ملک نے چھلانگ لگائی؟ تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ملے گا کہ حکومت کی بہتر پالیسیوں کی وجہ سے ایسا ممکن ہوسکا، لیکن یہ مکمل جواب نہیں ہے، مکمل جواب یہ ہے کہ ملک کے محنت کشوں نے جانفشانی سے محنت کر کے اس کو ہر شعبے میں آگے بڑھایا، تب جا کر اس کو یہ مقام حاصل ہوا۔ یہ ملک کبھی سونے کی چڑیا ہوا کرتا تھا لیکن غریبوں سے بیگاری اور بندھوا مزدوری کرا کر انگریز حاکموں کی کی لوٹ کھسوٹ نے ملک کو تباہ کر دیا۔ ملک کی آزادی کے ساتھ ہی ان محنت کشوں کی فلاح و بہبود کے لئے قانون وضع کئے گئے جن میں وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافہ کیا جاتا رہا۔ صرف اتر پردیش میں مزدوروں سے متعلق اس وقت 38 قانون نافذ ہیں۔ اتنے قوانین کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی تا کہ کسی بھی ناحیہ سے سرمایہ کار وصنعت کاران کا استحصال نہ کر سکیں۔ چونکہ ریاست کو ہر فرد کا سرپرست مانا گیا ہے اسلئے ریاست نے قوانین وضع کر کے ان کے حقوق کا تحفظ کیا، لیکن یہ بات گئے زمانوں کی ہوگئی، اب ایک نئی شروعات ہو چکی ہے، جس میں بھاجپا اقتدار والی ریاستوں نے ایک نئی پیش رفت کرتے ہوئے مزدوروں کو سرمایہ

کاروں وصنعتکاروں کے حوالے کر دیا ہے۔ حالانکہ حکومت کا کہنا ہے کہ وہ ایسا اس لئے کر رہی ہے تا کہ کرونا کے باعث چین سے باہر نکلنے والی جاپان، کوریا، امریکہ، برطانیہ اور یوروپی ممالک کی کمپنیوں کو یہاں سرمایہ کاری کے لئے راغب کیا جاسکے حالانکہ یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر بڑی بھیانک ہے۔

ہندستان میں مزدوروں کی تعداد 500 ملیں یعنی 50 کروڑ ہے، اکنامک ٹائمس کے مطابق 90 فیصد مزدوروں/ ملازمین کا تعلق غیر رسمی شعبے سے ہے، اس شعبے میں ہر برس پانچ سے دس ملین یعنی پچاس لاکھ سے ایک کروڑ مزدور جڑ جاتے ہیں۔ غیر رسمی وہ شعبے ہیں جو قوانین کے ضابطوں کے مطابق نہیں چلتے مثلاً کھیتی باڑی وغیرہ، جہاں کم از کم اجرت طے نہیں ہے، کوئی سوشل سکیورٹی نہیں ہے، ملک کی ترقی میں ان کا بھی ہاتھ ہے لیکن سرکار کے پاس ان کے اعداد و شمار نہیں ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ملک میں 140 ملین یعنی دس کروڑ چالیس لاکھ مہاجر مزدور ہیں جو دوسری ریاستوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔

اتر پردیش میں کل رجسٹرڈ مزدوروں کی تعداد 1992395 ہے۔ حکومت اتر پردیش نے ہر ضلع کی فہرست آن لائن کر رکھی ہے، لیکن یہ وہ مزدور ہیں جن میں سے اکثریت کا تعلق سرکاری محکمے میں کاموں سے ہے، ان کے علاوہ غیر رسمی شعبے میں جو افراد کام کرتے ہیں ان کی تفصیلات حکومت کے پاس بھی موجود نہیں ہے۔ وضع قوانین کا تعلق یوں تو ان مزدوروں سے ہوتا ہے جو ایسی جگہ کام کرتے ہیں جن کا تعلق سرکاری ضابطوں سے ہے مثلاً صنعتی یونٹیں وغیرہ، چونکہ ان کو سرکار سے لائسنس بھی لینا ہوتا ہے اس لئے ان کو اصول وضوابط بھی ماننے ہوتے ہیں مگر اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

حکومت اتر پردیش و مدھیہ پردیش کے فیصلوں کے مطابق اب ریاست میں مزدوروں سے متعلق صرف تین قانون (تعمیرات سے متعلق قانون مثلاً رجسٹریشن وغیرہ، انسداد بندھوا مزدوری قانون، مزددوروں کی اجرت ادائیگی قانون جس میں برے حالات میں مزدوروں کو

معاوضہ بھی شامل ہے )ہی نافذ ہوں گے باقی سبھی اصول وضوابط تین برس کے لئے کالعدم ہوجائیں گے۔اہم بات یہ کہ مزدوروں کے لئے کام کا جو دورانیہ 8 گھنٹے تھا اب وہ بارہ گھنٹے ہوجائے گا۔اب ٹریڈ یونین ایکٹ،انڈسٹیریل ڈسپیوٹ ایکٹ،ایکول ریونیریشن ایکٹ،جرنلسٹ ایکٹ،بونس ایکٹ،پرووڈنٹ فنڈ سمیت متعدد ایکٹ کالعدم ہوجائیں گے۔مدھیہ پردیش میں 'مزدور معاہدہ قانون' کے ساتھ ہی صنعتی تنازعہ قانون اور انڈسٹیریل لیشنس ایکٹ کوبھی منسوخ کردیا گیا ہے۔مزدوروں کے کام کی جگہ بہتر حالت میں رکھنا مالکان کی ذمہ داری ہے اسی طرح سے ان کو بنیادی سہولیات فراہم کرنا بھی لیکن متعدد قوانین کی منسوخی سے ایسانہیں رہ جائے گا۔نئے ضابطہ کے مطابق کسی صنعت/صنعتی یونٹ کے خلاف لیبر ڈیپارٹمنٹ انفورسمنٹ ضوابط کے تحت اب کارروائی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی صنعتی یونٹوں کا معائنہ کیا جائے گا۔کمپنیاں اب مزدوروں/ ملازمین کواپنی مرضی کے مطابق اپنی شرطوں پر رکھ سکتی ہیں اورنکال بھی سکتی ہیں۔جسے عدالت میں چلینج نہیں کیا جاسکے گا۔ یہ حکومت کا ایک ایسا فیصلہ ہے جو کرونا سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کرونا اور ریاست میں سرمایہ کاری کے فروغ کے نام پر مزدوروں کی زندگیوں کوخطرے میں ڈال کرمنافع خوری کوفروغ دینے کا یہ منصوبہ ہے۔اب گیند مرکزی حکومت کے پالے میں ہے کیونکہ اس کی سفارش کے بعد ہی یہ قانون نافذ ہوں گے،اب اس کو سوچنا اور فیصلہ کرنا ہے کہ کیا مزدور بھی انسان ہیں؟ان کے بھی کچھ حقوق ہیں؟ یا پھر اس کی نظر میں صرف سرمایہ کار اور صنعتکار ہی انسان ہیں اور ان ہی کی اہمیت ہے۔

حکومت کے اس فیصلے سے منظم سیکٹر میں کام کرنے والوں کی زندگی جہاں تباہ ہوگی وہیں غیر منظم شعبے میں کام کرنے والے مزید دشواریوں کا شکار ہوں گے۔ایسے میں اول تو ریاستی حکومتوں کو ہی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا چاہئے اور سوچنا چاہیۓ وہ جن مزدوروں کو سرمایہ کاروں کے ہاتھوں میں دے رہی ہیں وہی ریاست کی مین پاور ہیں،اگر ان کا ہی خون چوس لیا گیا جو یقینی ہے تو پھر ریاست ترقی کیسے کرے گی؟ دوم مرکزی حکومت کو ریاستی حکومت کے اس فیصلے کو

حقوق انسانی کے خلاف مانتے ہوئے ان کی سفارش نہیں کرنا چاہئے، اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا میں جو بھی ہو رہا ہے اس کا صرف ایک مقصد ہے کہ انسانوں کو سہولت میسر ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو سرمایہ کار ہیں صرف ان کو دولت ملے اور مزدوروں/ ملازمین سمجھ کر ان کا خون چوس لیا جائے۔ اس لئے حکومت انسانی تناظر کو سامنے رکھ کر اب فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہئے کہ ملازمین/مزدوروں یعنی انسانوں کو سرمایہ کاروں کا غلام بنانے کی آزادی سے ملک میں نہ سرمایہ کاری ہو سکتی ہے اور نہ ہی ملک ترقی کر سکتا ہے بلکہ اس کے لئے ملازمین/مزدوروں کی تربیت اور بہتر انفراسٹرکچر کی ضرورت ہوتی ہیجو حکومت کی ذمہ داری ہے۔

# ”چیک اینڈ بیلنس“ کا فارمولہ

جارج فلائیڈ کے آخری الفاظ ”میرا دم گھٹ رہا ہے“ آج امریکہ ہی نہیں پوری دنیا میں سیاہ فاموں اور مظلوموں کا نعرہ بن چکا ہے۔اس کی موت پر اس وقت امریکہ جل رہا رہے۔”جہاں لوٹ ہوگی وہاں شوٹ ہوگی“ کا امریکی صدر نے ٹوئٹ تو کیا لیکن ہیوسٹن کے پولیس سربراہ نے ان کو آئینہ دکھاتے ہوئے ”شٹ اپ“ کی ہدایت دے دی۔ابھی پانچ ماہ قبل پورے ہندستان خصوصاً دہلی اور اترپردیش میں ہوئے مظاہروں کے دوران حکومت اور پولیس کا رویہ ہم دیکھ چکے ہیں۔50 سے زائد افراد کی موت صرف اترپردیش میں ہوئی تھی ،اس کے علاوہ دہلی میں ہوئے فسادات اور دیگر ریاستوں میں جو لوگ مارے گئے ان کی تعداد الگ ہے۔مغربی یوپی میں جو پولیس نے گھروں میں گھس کر کیا تھا، وہ بھی سب کی نظر میں ہوگا اور اترپردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کا وہ رویہ بھی لوگ نہیں بھولے ہوں گے جس کا آغاز انتقام کے اعلان کے ساتھ کیا تھا۔

ایک سیاہ فام کی موت کا واقعہ امریکہ کا ہے اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ہمارے یہاں نہیں ہو رہا ہے بلکہ امریکہ میں ہو رہا ہے اس لئے ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہے،،ہم افتادگان خاک کہیں بھی رہیں، دنیا کے کسی بھی خطے میں رہیں ہمارا ان سے واسطہ ہونا چاہیے وہ امریکہ کے سیاہ فام ہوں یا فلسطین کے عربی یا پھر ہندستان کے دلت اور مسلمان،ان سب کے مابین ظلم کے شکار ہونے کا ایک رشتہ ہے جو ان سبھی کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔دونوں مقامات کی ریاست ،سیاست اور عوام کے نظریئے کا فرق بھی اس واضح ہوتا ہے۔دنیا کا سپر پاور شخص صرف زبان تک محدود رہ جاتا ہے جبکہ یہاں جائز مطالبات پر زندگیاں چھین لی جاتی ہیں اور بچے یتیم کردیئے جاتے ہیں،جس میں ریاست اور سیاست کے ساتھ ہی عوام بھی ملوث ہوتے ہیں۔

امریکہ میں ہونے والے اس واقعہ نے اس کے دو چہرے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے،ایک وہ چہرہ جس میں سیاہ فام اور سفید فام ایک ہی قطار میں کھڑے ہو کر ”میرا دم گھٹ رہا ہے“ کے

نعرے لگا رہے ہیں اور امریکہ کے لئے اس کو باعث شرم مان رہے ہیں، وہ بغیر کسی نسلی امتیاز کے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر ملک کو مضبوط کرنے اور نسلی تنافر کو دور کرنے کے عزم کا اظہار کر رہے ہیں، اسی زمرے میں فوج کے وہ وہ گارڈز بھی شامل ہیں جو سیاہ فام امریکیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس واقعہ پر معافی مانگ رہے ہیں، کیونکہ ان کو محسوس ہو رہا ہے کہ جو بھی ہوا ہے وہ ملک کے لئے بہتر نہیں ہے، اس لیے وہ قیام امن اور سیاہ فاموں میں اعتماد و اعتبار پیدا کرنے کے لئے جھکنے سے بھی نہیں ہچکچا رہے ہیں۔ دوسرا چہرہ پولیس افسر ڈیرک کا ہے، جس میں نسلی امتیاز اس طرح بھرا ہوا تھا کہ اس کے نزدیک ایک انسان کے "میرا دم گھٹ رہا ہے" فریادی جملے کی کوئی اہمیت تھی۔ اس طرح دو نظریئے سامنے آئے ایک نسلی امتیاز پر مبنی اور ایک اس کے خاتمہ کے لئے کوشاں۔

اس تناظر میں جب ہم ہندستان پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ایک دوسری صورت نظر آتی ہے۔ 6 برس قبل 2014 میں پونے میں انجینئر محسن شیخ کا "ہندو راشٹر سینا" کے دہشت گردوں کے ہاتھوں اس وقت قتل ہوا تھا جب وہ عشا کی نماز پڑھ کر گھر واپس آرہا تھا، یہ ایک منصوبہ بند قتل تھا لیکن اس کو ہجومی تشدد کہا گیا، اس قتل کی بنیاد نفرت اور تعصب تھی مگر ہر طرف اس وقت بھی سناٹا چھایا رہا اور آج بھی، اس کے بعد ہجومی تشدد کا پورا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ریاست ،سیاست اور عوام سب ایک پلیٹ فارم پر آ کر نہ صرف ایسے واقعات کی مذمت کرتے بلکہ حکومت کو مجبور کرتے کہ وہ اس کے خلاف قانون سازی کر کے مجرموں کیفر کردار تک پہنچائے کیونکہ "چیک اینڈ بیلنس" نہایت ضروری ہوتا ہے، ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پسند ذہن رکھنے والے حکمراں "چیک اینڈ بیلنس" میں یقین رکھتے ہیں مگر افسوس ک بات ہے کہ ہمارے یہاں نظام میں چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے کیونکہ اقلیتوں کے خلاف نفرت وتعصب کے وائرس خود "چیک اینڈ بیلنس" کرنے والوں میں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہجومی تشدد میں شامل افراد کو اسٹیج سے حکمراں اور ممبران پارلیمنٹ اعزاز سے نہ نوازتے ،اور اگر کسی نے ایسا کیا تھا تو اس کے خلاف

کارروائی کی جاتی مگر ایسا اس لئے نہیں ہوا کہ اس وائرس کا سب کے سب شکار تھے۔ چند ماہ قبل دہلی میں فسادات ہوئے جن کی بنیاد مذہبی جنون سے پھوٹی قومیت اور اقلیت کے خلاف نفرت تھی، اس کے ذمہ داران کو کیا سزا ملی؟ اسی جنون میں پوری جمعیت پر گولی چلانے والوں کے خلاف کیا کارروائی ہوئی، اس کی بنیاد بھی مذہبی جنون ہی تھا۔ کیا آپ امید کرتے ہیں کہ ان کو سزائیں ملیں گی؟ جبکہ دوسری طرف احتجاج کرنے والے طلبا و طالبات اور خواتین پر کس طرح سے پولیس نے مظالم کئے، دنیا نے یہ دیکھا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وزیر داخلہ کے ساتھ ہی عوام کا ایک ایسا طبقہ تھا جو پولیس کی اس کارروائی کو جائز ٹھہرا رہا تھا بلکہ نعرے لگائے جا رہے تھے کہ ''مودی جی تم لٹھ بجاؤ، ہم تمہارے ساتھ ہیں''۔ یہ ذہنیت کیونکر پیدا ہوئی، جو افراد اس ذہنیت کے نہیں ہیں کیا وہ سڑکوں پر نکل کر آئے کہ نہیں ملک میں اس طرح کے تعصب کو پنپنے نہیں دیا جائے گا؟ دراصل اکثریتی اور اقلیتی طبقات کے مابین منافرت کا برقرار رہنا ریاست اور اس کے حکمراں طبقے پر منحصر ہوتا ہے کیونکہ ان کی خود اپنی بقا اسی پر منحصر ہوتی ہے ایسے میں بھلا وہ اس کے خلاف کیوں کوئی ایسا قدم اٹھائیں گے جس سے خود انہیں نقصان پہنچے۔ یہ ایک طرح سے ریاست اور سیاست کا گھناؤنا کھیل ہے۔ دوسری طرف جو اس ذہنیت کے حامل نہیں ہیں مثلاً عوام کی اکثریت، اور عدلیہ ان دونوں نے یہاں ہونے والے ہجومی تشدد کے واقعات و سانحات کو ناخوشگوار معمولات سمجھ کر ان سے پہلوتہی کر لیا ہے۔

ریاست، سیاست، عوام اور عدلیہ کی اس مسئلے سے پہلوتہی کا نقصان یہ ہوا کہ ایک ڈاکٹر اور میڈیکل کالج کی پرنسپل برملا اس بات کا اظہار کرتی ہے، مسلمانوں پر اپنی دوائیں اور کٹس وغیرہ نہیں برباد کرنا چاہیئے ان کے اوپر سرمایہ کا خرچ اسراف ہے، ان کو آئیسولیشن کے بجائے جیل یا کسی جنگل میں ان کو چھوڑ دینا چاہیئے، ان کے علاج سے ہمارے ڈاکٹر مر رہے ہیں، تیس کروڑ مسلمانوں کے لئے سو کروڑ آبادی کی جان کو ہم خطرے میں ڈال رہے ہیں، یہ پورا ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہوا، اسی طرح سے مدھیہ پردیش میں ایک پولیس اہلکار لاک ڈاؤن میں ڈاڑھی والے ایک شخص کی پٹائی بغیر کسی

غلطی کرتا ہے، جب اس کے خلاف وہ ایف آر کے لئے جاتا ہے تو یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ چلیں چھوڑیں اس نے مسلمان سمجھ کر ایسا کر دیا، سمجھنے میں اس سے غلطی ہوگئی تھی۔ ستمبر 2019 میں راجدھانی دہلی میں ساحل نامی ایک نوجوان ٹھا کر کو پنڈتوں نے مسلمان سمجھ کر مار دیا تھا۔ اس سے قبل 2017 میں گریٹر نوئیڈا میں گئو رکشکوں نے دو ہندوؤں کی پٹائی مسلمان سمجھ کر کر دی تھی، اس طرح کے ایک دو واقعات نہیں ہیں، ملک کے کونے کونے میں اخلاق اور پہلو خان ہیں جو مذہبی جنونیوں اور پولیس کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیا ان واقعات سے مسلموں کے خلاف سماج کے ہر طبقے میں سرایت کر چکی نفرت اور پر پولیس کے مظالم کی وضاحت نہیں ہوتی؟ مگر ریاست، سیاست اور عدلیہ سب خاموش رہتے ہیں، عوام کے کان پر بھی جوں تک نہیں رینگتی، اندازہ سب کو ہے کہ یسے ڈاکٹر بھی سماج میں خوف کا سبب بنتے ہیں، جو کرونا وائرس سے بھی زیادہ خطرناک ہے لیکن معمول کے مطابق وہ اس سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ ملک کے جس طرح کے حالات ہیں، اس سے ہزار محبتوں کے باوجود ہمارا بھی دم گھٹ رہا ہے، مگر یہاں اگر کوئی یہ ایہ الفاظ بول دے تو اس کو ریاست، سیاست اور عدلیہ کوئی بھی سکون سے رہنے دے گا؟

ہندو ہونا، مسلمان، رہنا، سکھ مت کی پیروی کرنا یا پھر حضرت عیسیٰؑ کے قدموں میں جنت تلاش کرنا حقوق انسانی کی سطح پر کوئی بری بات نہیں ہے، ہر انسان کو اختیار ہے کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے لیکن یہی مذہبیت جب قومیت بن کر ابھرتی ہے اور انسان دشمنی میں بدل جاتی ہے تو انسان خود بھی شیطان کے روپ میں تبدیل ہو جاتا ہے، ایسی مذہبی انسان کے بجائے شیطان ہوتے ہیں خواہ ان کا تعلق سیاست سے ہو، ریاست سے ہو یا پھر ریاستی انتظامات سے، اس لئے ''چیک اینڈ بیلنس'' کا فارمولہ اختیار کیا جانا ضروری ہے۔ عوام کو بھی سرکار کو مجبور کرنا چاہئے کہ وہ اس فارمولے پر عمل کرے اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو اس سے صرف ایک طبقے کے خلاف نفرت نہیں پھیلے گی بلکہ اس کی زد میں وہ خود آجائیں گے، جس سے ان کا اور اس پورے ملک کے تنوع کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

# انسانوں کی اکثریت تماشا ہے یا تماشائی

دنیا میں انسانوں کی اکثریت تماشا ہے یا تماشائی، اس کا تیسرا کوئی مقام نہیں ہے، چند لوگ ہیں جو اس کو اپنے مفاد کے اعتبار سے چلا رہے ہیں۔ یہ کوئی صرف کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ اقوام متحدہ کا قیام ایک عالمی حکومت کے تناظر میں عمل میں آیا تھا جس کا مقصد تھا کہ طاقت، ظالم وجابر ممالک کو نکیل ڈالی جا سکے، کوئی ایسا نہ ہو جو کسی کو دبائے لیکن حقیقت کیا ہے؟ دنیا کے سامنے ہے، اس کے باوجود آج بھی اس کی حیثیت ایک عالمی ادارے کی ہے یہ اور بات ہے کہ دیکھنے میں وہ جتنا طاقتور ہے اسی اعتبار سے ناکارہ بھی ہے۔ دراصل اس کی حیثیت اب پہلی دنیا کیبھو نپو اور اس کے محافظ کی ہو چکی ہے۔ تھوڑا بہت دوسری دنیا کے لئے ہے جبکہ تیسری دنیا کے لئے اس کی حیثیت معدوم کی ہے لیکن اگر ایکشن لینا ہو تو اس کی نظر سب سے پہلے تیسری دنیا کے ممالک پر ہی پڑتی ہے۔ اس ادارے کے مختلف ذیلی ادارے ہیں جو عالمی سطح پر کام کرتے ہیں ان ہی میں سے ایک ادارہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (ڈبلیو ایچ او) ہے۔ جو پوری دنیا میں صحت سے متعلق امور دیکھتا ہے۔ اس کا قیام 7 اپریل 1948 کو عمل میں آیا تھا۔ کرونا وائرس کے اب تک دنیا میں 4910117 کورونا وائرس کے مصدقہ معاملات سامنے آ چکے ہیں۔ جبکہ اموات 35905 ہو چکی ہیں۔ جب سے کرونا وائرس وجود میں آیا اور دنیا میں تباہی مچانا شروع کیا۔ اس ادارے پر مختلف طرح کے الزامات عائد ہونے لگے، جس میں سب سے اہم یہ کہ اس نے چین کے دباؤ میں تاخیر سے الرٹ جاری کیا۔ اس کے کیا اسباب وعوامل تھے اس پر بحث جاری رہے گی لیکن اس دوران ایک ایسی خبر آ کر غائب ہو گئی جس نے واقعی اس ادارے کی اہمیت اور اعتماد پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہ خبر کسی عام ایجنسی/ نیوز چینل یا اخبار نہیں دی بلکہ معروف خبر رساں ادارے ایجنسی فرانس پریس (اے ایف پی) نے دی۔ یہ وہ ادارہ ہے جو 1835 میں فرانس میں قائم ہوا تھا تب سے آج تک وہ خبر رساں اداروں میں اپنا اعتبار بنائے ہوئے ہے۔ اس ایجنسی نے مشرقی افریقی ملک مڈاگاسکر کے صدر کا ایک انٹرویو جاری کیا جس

میں انہوں نے ایک تو اس ادارے پر الزام عائد کیا اور دوسرے اپنی لاچاری کا اظہار کیا اور یہ دونوں باتیں نہ صرف ڈبلیو ایچ او پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں بلکہ پوری دنیا کو اس جانب متوجہ کرتے ہیں کہ آج دنیا میں غریب عوام اور غریب ممالک کی کیا حیثیت ہو چکی ہے۔ مڈاگاسکر کے صدر انڈریو ریجولینا کے مطابق ان کے ملک کے ڈاکٹروں نے ایک ایسی دوا بنا لینے کا دعوی کیا ہے جو سو فیصد نتائج دیتی ہے اور محض تین سے چار دن میں اس وائرس کا شکار شخص صحت یاب ہو جاتا ہے، یہ دوا ایک پودے سے بنائی گئی ہے۔ جب اس کی اطلاع انہوں نے ڈبلیو ایچ او کو دی تو اس نے نہ صرف اس کو مسترد کر دیا بلکہ مزید کہا کہ اس دوا میں زہر ملانے کے عوض 20 ملین ڈالر لے لیں تاکہ لوگ اس کا استعمال ترک کر دیں۔ یہ ایک اہم بات ہے اس کے پس پشت ایک بہت بڑی سازش بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے قبل بھی کئی ممالک نے کرونا وائرس کے خلاف دوا سازی کا دعوی کیا تھا جس میں اسرائیل اور برطانیہ سرفہرست ہیں لیکن جس طرح سے مڈاگاسکر کی دوا کو مسترد کیا گیا ہے اس سے کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

اس وقت کرونا وائرس کے شکار افراد کی جو تعداد ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کو کس قدر ایک ایسی دوا کی ضرورت ہے جو اس وبا سے نجات دلا دے، ایسے میں جس ملک کی دوا کو بھی ڈبلیو ایچ او نے منظوری دے دی راتوں رات اس کی معیشت زمین سے آسمان پر پہنچ جائے گی تو کیا مڈاگاسکر کی دوا "کووڈ آرگینکس" کو صرف اس لئے مسترد کیا گیا تاکہ اس افریقی ملک کو فائدہ نہ ہونے دیا جائے اور اس وقت کا انتظار کیا جائے جب پہلی دنیا کا کوئی ملک اس کی دوا تیار کر لے تب اس کو منظوری دی جائے؟ یا پھر ڈبلیو ایچ او نے پہلے سے مان لیا ہے ایڈس زدہ افریقی ممالک اس طرح کی کوئی دوا سازی نہیں کر سکتے ہیں؟ یا وہ امریکہ، برطانیہ اور اسرائیلی لابی کے دباؤ میں آ گیا ہے کیونکہ اس پر مسلسل یہ چین کا ترجمان ہونے کا الزام عائد کر رہے ہیں؟ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اگر کوئی ملک اس طرح دعوی کرتا ہے "پوری دنیا کے کسی بھی حصے کا کوئی مریض آپ ہمیں دیں ہم اپنی دوا سے سو فیصد نتائج دیں گے" تو اس دوا کی لیب ٹسٹنگ ہونی چاہئے تھی تاکہ

جتنی جلد ہو سکے دنیا کو اس وبا سے نجات ملے لیکن ڈبلیو ایچ او نے ایسا نہیں کیا۔اہم بات یہ کہ مڈگاسکر کے صدر نے صاف طور پر کہا کہ چونکہ ہم غریب ملک ہیں اس لئے اس پر توجہ نہیں دی گئی ،بڑے ملک اور بزنس مین اس دوا سے پیسہ بنانا چاہتے ہیں اس لئے ایسا کیا جارہا ہے۔اس سے بھی اہم بات یہ ہوئی کہ عالمی میڈیا میں اے ایف پی کی وجہ سے یہ خبر تو آگئی لیکن اس پر کوئی بحث نہیں ہوئی،کسی نے بھی انڈریو ریجولینا کی بات/ الزام اور دعوے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا،اس کے پیچھے بھی ایک بہت بڑا راز ہے۔دراصل جتنی بھی عالمی سطح کی نیوز ایجنسیاں ہیں ان میں اکثریت کی ملکیت یہودیوں کے پاس ہے اور اسرائیل دنیا میں واحد یہودی ریاست ہے،دنیا کا ہر یہودی حتی المقدور اس کی معیشت کو فائدہ پہنچانے کی کوشش بھی کرتا ہے،اسرائیل کی معیشت اسلحہ سازی اور سائنسی ایجادات پر منحصر ہے،اسرائیل جب پہلے ہی اعلان کرچکا ہے کہ وہ کورونا کے علاج کے لئے دواسازی کررہا ہے تو پھر اس سے ہمدردی رکھنے والی ایجنسیاں بھلا کسی ایسی خبر کو موضوع گفتگو کیوں بننے دیں گی جس سے ان کے کاز پر ضرب آئے۔اس طرح سے دونوں سطحوں پر مڈاگاسکر کو مسترد کردیا گیا۔

ہم جس دنیا میں اس وقت سانسیں لے رہے ہیں یہ پوری طرح سے مادی ہو چکی ہے،چندلاکھ یا کروڑ لوگوں کی موت سے کسی کو کچھ فرق نہیں پڑتا بلکہ ہر ملک اور ہر شخص ذاتی مفاد کے لئے کام کرتا ہے۔امریکہ پر الزام ہے کہ اس نے یہ وائرس اس لئے پھیلایا تاکہ چین کی معیشت کو توڑا جاسکے،چین پر یہ الزام ہے کہ اس نے امریکہ کی سپر پاور کو چیلنج کے لئے یہ وائرس پھیلایا اسی لئے اس نے سب سے پہلو قابو بھی پالیا اور اب اس کی معیشت پٹری پر لوٹ چکی ہے جبکہ پوری دنیا کی معیشت تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے۔ڈبلیو ایچ او نے مڈگاسکر جیسے غریب ملک کے ڈاکٹروں کی مہارت کو کوڑے دان میں اس لئے ڈال دیا کیونکہ وہ ایک غریب اور پسماندہ ملک ہے۔اگر ایک کڑی کو دوسری کڑی سے ملایا جائے تو ہر جگہ صرف مفاد ہی مفاد دکھائی دے گا ۔انسان اور انسانیت نام کی کوئی چیز کہیں نہیں دکھائی دے گی۔

حال ہی میں بنگلہ دیش نے بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس نے بھی کورونا کے خلاف دوا تیار کر لی ہے اور جلد ہی اس سے متعلق رپورٹ کسی عالمی جریدے میں شائع کی جائے گی اور دنیا کے لئے دوا سازی شروع کی جائے گی، ڈبلیو ایچ او کے سامنے اس کی پیشکش کا کیا انجام ہو گا یہ ہم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ڈبلیو ایچ او اگر ایک عالمی ادارہ ہے جو انسانی بھلائی کے لئے قائم کیا گیا ہے تو پھر اس کو امیر و غریب ممالک میں تفریق کے بجائے انسانی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے جتنی بھی دوائیں سامنے آرہی ہیں ان کی لیب ٹسٹنگ اور ان کا تجربہ کرائے تا کہ جلد سے جلد انسانیت کو اس وبا سے نجات ملے، جس نے زندگیوں پر خوف کا ایسا سایہ پھیلایا ہے جو اب تک کسی دوسرے مرض نے نہیں پھیلایا تھا لیکن اگر وہ جانبدار ہو کر کسی کا ترجمان یا کسی کے دباؤ میں آ کر کام کرتا ہے تو اس سے صرف چند افراد اور ممالک کا فائدہ ہوگا جبکہ پوری انسانیت کا اس سے نقصان ہوگا۔ ڈبلیو ایچ او کو انسان کو تماشا یا تماشائی بننے سے بچانا ہوگا، اس کو چند مداریوں کے ہاتھ میں ڈگڈگی نہیں دینا چاہئے جو پوری دنیا کو اپنے موافق نچائیں۔ کورونا وائرس فطری ہو یا لیب میں تیار اس نے دنیا کو اپنی زد میں تو اب لے ہی لیا ہے جس سے نجات کا راستہ تلاش کرنا چاہئے یہ راستہ امیر ملک سے ہو کر بھی آسکتا ہے اور غریب ملک سے بھی، راستے کی تلاش میں امیر و غریب کی تفریق سے صرف انسانی جانوں کا زیاں ہوگا جو کسی بھی طرح سے مناسب نہیں ہے۔

# کولسٹن کے مجسمے کا انہدام اور تسلط وغلبہ کی ذہنیت

دنیا کے وجود کا سبب امن اور محبت ہے، جب بھی امن اور محبت میں کمی آئی ہے یا یا نفرت و تعصب اور تسلط کی ذہنیت پروان چڑھی ہے دنیا غیر محفوظ ہوگئی ہے۔ہندستان کی بنیادیں بھی اسی امن ومحبت اور آپسی بھائی چارے پر ہی استوار ہیں۔کسی بھی خطہ ارض کا مشاہدہ کر لیجئے جہاں بھی تسلط کی ذہنیت کارفرما ہے وہاں امن وسکون نہیں ہے،اس کی ایک لمبی تاریخ رہی ہے۔اس کے باوجود یہ جذبے ہر دور میں موجود رہے ہیں،کبھی نہ تو محبت ختم ہوئی اور نہ ہی تعصب ونفرت اور تسلط کی ذہنیت کا خاتمہ ہوا ہوا،ان دونوں میں کشمکش ہمیشہ چلتی رہی ہے۔ایک بات اور دنیا محبت اور روا داری عام کرنے والوں کو ان کی موت کے بعد بھی خراج پیش کرتی ہے،ظلم ،نفرت وتعصب اور تسلط کی ذہنیت کے حامل افراد سے بدلہ ضرور لیتی ہے خواہ صدیوں کے بعد ہی کیوں نہ لے۔لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس کا نام ونشان تک مٹا دیتے ہیں۔ابھی چند دنوں قبل دنیا نے دیکھا کہ سترہویں صدی کے سیاہ فام غلاموں کے سوداگر سفید فام ایڈورڈ کولسٹن کے برطانیہ کے شہر برسٹل میں نصب مجسمے کو نہ صرف منہدم کیا گیا بلکہ انہدام سے قبل لوگ اس پر چڑھے،ناچے کودے پھر اس کو گرایا اور برسٹل کی بندرگاہ پر لے جا کر اس کو سمندر میں لڑھکا دیا۔یہ وہ شخص تھا جس نے افریقہ سے 80 ہزار غلاموں کو بحری راستے سے لا کر امریکہ میں فروخت کیا،دوران سفر تقریبا 16 ہزار سیاہ فام انسانوں کی موت ہوگئی۔اس کی نظر میں وہ انسان کے بجائے صرف سامان تجارت تھے۔کولسٹن کے مجسمے کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے،جس کے جواب میں پوری دنیا میں امن وامان مضمر ہے،خواہ وہ ہندستان ہو یا اسرائیل یا پھر امریکہ اور چین۔ہر جگہ کولسٹن کا جذبہ تسلط ہی کارفرما ہے،جس نے انسانوں کی زندگی دوبھر کر دی ہے،کوئی چین وسکون سے نہیں ہے۔مجسمے کا انہدام امریکہ میں جارج فلائڈ کے قتل کے بعد ردعمل کے طور پر ہوا ہے۔دنیا اب غلامی،تسلط یا اس کے مترادف ومتوازی ذہنیت اور اس کی علامات ونشانیوں کو بھی مٹا دینا چاہتی ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتی ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کا غلام بن کر رہے یا رنگ ونسل اور

مذہب کی بنیاد پر کسی سے تفریق روا رکھی جائے۔اہم بات یہ کہ مجسمے کے انہدام میں سیاہ فاموں کے بجائے خود سفید فام شامل تھے،کولسٹن کے اخلاف نے اپنے ہی ہاتھوں سے اس کا مجسمہ سمندر برد کیا۔یہ ایک خوشگوار تبدیلی ہے،امریکہ میں بھی ہونے والے مظاہروں میں سفید فام پیش پیش رہے یہاں تک کہ دنیا کے سب سے طاقتور شخص صدر ٹرمپ کی بیٹی بھی مظاہرین کی حامی ہیں،جس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ تفریق کا خاتمہ ہونا چاہئے۔

کولسٹن کے مجسمے کے انہدام کے تناظر میں اگر ہندستان کو دیکھا جائے تو صورت حال بڑی بھیانک نظر آتی ہے۔ہندستان کے دو منظر نامے ہیں جن کا تعلق کولسٹن اور اس کے مجسمے کے انہدام سے ہے ایک تو حالیہ ہے اور دوسرے کا تعلق ماضی بعید سے ہے۔حالیہ منظر نامہ کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے،جس طرح سے کولسٹن کی ذہنیت تسلط کی تھی اور اس کو یہ باور کراتا تھا کہ سیاہ فام انسان نہیں ہیں،اسی لئے اس کے دلوں میں ان کے لئے ذرہ برابر ہمدردی اور محبت نہیں تھی۔ہندستان کا حکمران طبقہ یہاں کے عوام خصوصا مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کرتا نظر آ رہا ہے۔2002میں گجرات فسادات کے بعد ایک انٹرویو میں وہاں کے وزیر اعلی اور موجودہ وزیر اعظم نریندر مودی نے ایک سوال کے جواب میں مسلمانوں کو استعاراتی انداز میں 'پلّے' سے تشبیہ دی تھی۔جو صرف بطور مثال ہے۔جس طرح سے موب لنچنگ اور فسادات میں یک طرفہ طور پر مسلمانوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے وہ بھی تسلط کی ذہنیت کا ہی غماز ہے۔دہلی پولیس جو مرکزی حکومت کے ماتحت سے اس نے دہلی میں ہوئے فسادات سے متعلق اپنی جانچ رپورٹ پیش کی ہے جس سے اسی شخص کا نام غائب ہے جس نے سڑک پر آ کر سب سے پہلے دھمکی دی تھی کہ خود اپنے حامیوں کے ساتھ مل کر مظاہرین سے نمٹ لے گا۔چونکہ حکومت اور اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے اس لئے "کرے گناہ بھی اور لے ثواب الٹا" کے مصداق رپورٹ میں دکھا دیا گیا کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں اور کریں گے۔انصاف دینا نہ دینا ہمارے ہاتھ میں ہے،مجرم ہونے نہ ہونے کا فیصلہ بھی ہم ہی کریں گے سو وہ کر رہے ہیں۔یہ رویہ تو محض ایک کمیونٹی کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے،جس کے بارے میں سچر کمیٹی نے

گہری تحقیق ومشاہدے کے بعد اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ ان کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے کے مواقع دیئے جاتے ،ان کو خصوصی مراعات دے کر ترقی کے امکانات روشن کئے جاتے ،جس سے ملک بھی ترقی کے معاملے میں آگے بڑھتا ،ان کو فسادات ،موب لنچنگ میں اموات اور ان پر تسلط کا تحفہ دیا جا رہا ہے۔ یہ صرف بی جے پی کا معاملہ نہیں خود کانگریس بھی اسی طرح کے رویے کا اظہار کرتی رہی ہے۔

حکمرانوں کی نظر میں انسانوں اور خصوصا غریبوں کی کتنی اہمیت ہے دنیا نے کھلی آنکھوں سے اس لاک ڈاؤن میں دیکھ لیا ،جب لوگوں نے اپنے گھر واپسی کے لئے پیدل سفر شروع کیا تو ان میں سے بعض کا تو سفر ہی نہیں ختم ہوا اور وہ آج تک گھر نہیں پہنچے اور نہ ہی اب وہ کبھی پہنچیں گے کیونکہ انہوں نے اسی سفر سے دوسری دنیا کا رخت سفر باندھ لیا۔ حکومتوں نے جس طرح کا رویہ ان کے ساتھ اختیار کیا وہ کولسٹن کے رویے سے کم بالکل نہیں ۔لاک ڈاؤن میں ''پی ایم کیئر فنڈ'' میں عوام سے چندے کی اپیل کی جا رہی تھی تب حکمراں پارٹی کے پاس پیسہ نہیں تھا جس سے وہ ان غریبوں کی مدد کرتی جنھوں نے اس کو زمام حکومت سونپی تھی ،اس نے خود کتنا اس فنڈ میں چندہ دیا ،کسی کو نہیں معلوم لیکن لاک ڈاؤن کھلنے کے ساتھ ہی اس کی کروڑوں کی ورچوئل ریلیاں ضرور شروع ہو گئی ہیں ،جن میں حکمراں ہونے کی حیثیت سے جواب دینے کے بجائے اپوزیشن سے سوال کیا جا رہا ہے کہ اس نے اس دوران کیا کیا؟ جب ذمہ داری حکومت کی ہے تو اس کو سوال کرنے کا تو کوئی حق ہی نہیں بنتا۔ اس پورے معاملے کے مرکز میں تسلط کی ذہنیت ہی کارفرما ہے۔

کولسٹن کے مجسمے کا دوسرا تعلق ماضی بعید سے ہے لیکن اس سرا حال سے ہی وابستہ ہے۔ غلاموں کے سوداگر کا مجسمہ تو منہدم کر دیا گیا لیکن راجستھان کی ہائی کورٹ میں بھی ایک مجسمہ نصب ہے، یہ اس شخص کا مجسمہ ہے جس نے ہندستان میں تفریق کی بنیاد رکھی ،جس کی نظر میں تین ورن برہمن ،چھتری اور ویش کے علاوہ چوتھے ورن شودر کی اہمیت کتا بلی سے بھی زیادہ نہیں تھی ۔منوشاستر ایک ایسی کتاب ہے جو تقریباً 300 قبل مسیح منو نے لکھی تھی ،جس میں تعصب ،نفرت اور تسلط کی اس

ذہنیت کی بنیاد رکھی گئی جس سے آج تک ہندستان باہر نہیں نکل سکا ہے۔جیوتی راؤ باپھلے اور بھیم راؤ امبیڈکر نے بیسویں صدی کے اوائل میں اس کے خلاف مہم چھیڑ دی تھی۔25 دسمبر 1927 کو امبیڈکر کی قیادت میں اس شاستر کو عوامی طور پر جلا کر اس کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا گیا تھا۔آج بھی ہر 25 دسمبر کو"یوم منو اسمرتی دہن" منایا جاتا ہے۔منوشاستر میں جہاں شودروں کو اچھوت درا چھوت بنا دیا گیا وہیں عورتوں کو بھی انسان سے کمتر کر دیا گیا۔اہم بات یہ کہ منو کو ماننے والے خود اب اس کے سحر سے دھیرے دھیرے نکل رہے ہیں۔عورتوں کو پہلے ہی اس شاستر سے آزادی مل گئی لیکن پوری نہیں البتہ دلتوں کے ساتھ آج بھی وہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے اگر چہ اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔لیکن یہ سچ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے بعد اگر کوئی طبقہ سب سے زیادہ نفرت وتعصب اور تسلطو غلبہ کی ذہنیت وجہ سیظلم واستحصال کا شکار ہے تو وہ دلتوں کا ہی ہے۔میرے بچپن میں ہمارے یہاں اگر کوئی دلت کسی ٹھاکر کے سامنے سے صبح صبح خالی بالٹی لے کر نکل جاتا تھا تو اس کی پٹائی لازمی تھی۔یہ ذہنیت اسی شاستر سے آئی تھی۔

منو کے ماننے والے اور اس کے مخالفین دونوں ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ جو حکومت میں ہیں وہ کھلے یا بند اس کو نا ور اس کے شاستر کو مانتے ہیں اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کے لئے کوشاں بھی ہیں۔لیکن اس دن کیا ہوگا جب انسان سے حیوان بنائے گئے انسان صدیوں کی غلامی کا بدلہ لینے اور اس کے نام ونشان کو مٹا کے لئے راجستھان ہائی کورٹ میں نصب اس مجسمے کے خلاف نکل پڑیں گے۔یوں بھی ایک جمہوری ملک میں منو کے مجسمے کا کوئی مطلب نہیں چہ جائیکہ عدالت کے احاطے میں وہ نصب ہو کیونکہ منوشاستر کے قوانین اور جمہوری ہندستان کے قوانین کے مابین کسی طرح کا کوئی توافق اور تطابق نہیں ہے۔ان لوگوں کو بھی کولسٹن کے مجسمے کا حشر اپنے ذہن مین رکھنا چاہئے جو آزاد ہندستان کے کولسٹن بننے کی راہ پر ہیں، جو انسانوں کو غلام تصور کر کے ان کے ہی وسائل کا استعمال ان ہی کے خلاف کرتے ہیں۔ہندستان کی سرزمین اخوت ومحبت کی سرزمین ہے۔تسلط اور غلبے کی ذہنیت اس کے لئے سم قاتل ہے، جس سے حکمراں طبقے کو باہر آنا چاہئے۔

# انصاف کے بجائے سیاسی ایجنڈے پر عمل

انصاف کا قیام نہ صرف امن کا ضامن ہوتا ہے بلکہ اس سے اخوت ومحبت ارورواداری کو بھی فروغ ملتا ہے لیکن جب معاشرے میں انصاف ہی نہیں ہوگا تو بے اطمینانی، دشمنی اور نفرت کو ہوا ملے گی اور پھر پورا سماج غیر محفوظ محسوس کرنے لگے گا۔ امن وانصاف کو بالائے طاق رکھ کر پولیس اور انتظامیہ کا جھکاؤ جب ایک کمیونٹی اور حکومت کی توجہ، الطاف وعنایات ایک خاص طبقے پر ہوتی ہے تو نہ صرف دوسرا طبقہ غیر محفوظ محسوس کرنے لگتا ہے بلکہ اس میں ڈر اور خوف بھی بیٹھ جاتا ہے۔ ادھر چند برسوں میں ملکی اور ریاستی دونوں سطحوں پر اکثر وبیشتر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ فریقین میں اگر مسلم ہے تو سزا کا حقدار وہی سمجھا گیا ہے۔ لیکن جب معاملہ میں فریقین اکثریتی طبقے سے ہوں جن میں سے ایک اعلیٰ ذات کا اور دوسرا دلت ہو تو حکومت وانتظامیہ دونوں کو سانپ سونگھ جاتا ہے، اس طرح کے معاملات میں یا تو خاموشی اختیار لی جاتی ہے یا پھر دلتوں پر دباؤ بنا کر ان کو صلح پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اسی ماہ اتر پردیش میں دو واقعات ہوئے۔ ایک کا تعلق جونپور سے ہے جس میں مسلم اور دلت فریقین تھے اور دوسرے کا تعلق گورکھپور سے ہے جس میں دلت اور ٹھاکر فریقین تھے۔

گورکھپور میں جو معاملہ ہوا اس میں ذات برادری کو دخل تھا، اور اونچی ناک کو ساکھ بنا کر ٹھاکروں نے دلتوں پر حملہ کیا تھا جس میں حاملہ خواتین اور مویشیوں تک کو نہیں بخشا گیا۔ کئی دلت مرد وعوت زخمی ہوئے جن کو علاج کے لئے گورکھپور میڈیکل کالج میں بھرتی کرایا گیا اور عوامی دباؤ میں ٹھاکروں کے خلاف مقدمہ تو درج کرلیا گیا لیکن ان کے خلاف کارروائی ابھی تک نہیں ہوئی ۔ نوجوان انقلابی سبھا نے اس سلسلہ میں جانچ کے بعد میڈیا کو ایک رپورٹ بھی جاری کی، جس کی بنیاد پر ''میڈیا ویجل'' نے مارے پیٹے گئے دلتوں کی تصاویر کے ساتھ اپنے ویب پیج پر اس کی خبر شائع کی، یہ خبر بھی مین اسٹریم کی میڈیا سے غائب ہے۔ چونکہ حملہ آوروں کا تعلق وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کی ذات سے ہے اس لئے انتظامیہ بھی کارروائی نہ کرنے اور خاموش رہنے میں ہی عافیت تصور کرتی ہے جبکہ دلتوں پر دباؤ بنایا جارہا ہے کہ وہ مقدمہ واپس لے لیں اور صلح کرلیں، ان

کو دھمکیاں بھی دی جا رہی ہیں لیکن پولیس، انتظامیہ اور حکومت کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اس لئے اس کو سرد خانے میں ڈال دیا لیکن جونپور میں جب دلتوں کے ساتھ فریق کے طور پر مسلم سامنے آ گئے تو آئی جی اور وزیر اعلی تک اس معاملے میں سرگرم ہو گئے۔ حالانکہ باغ میں آم توڑنے جیسی معمولی بات پر بچوں میں جھگڑا ہوا تھا جس نے تصادم کی شکل اختیار کر لی اور دلتوں کے چھ سات پھوس کے چھپر جلا دیئے گئے۔ اہم بات یہ کہ شوسل میڈیا پر ایک ویڈیو وائرل ہوا ہے جس میں ایک دلت نوجوان خود یہ کہتے ہوئے سنا جا سکتا ہے کہ اس نے مڑھے میں آگ لگا کر غلطی کی ہے۔ اس کو بھی جانچ میں شامل کیا جا چاہئے تھا لیکن مسلمانوں کو تختہ مشق بنا دیا گیا۔ 35 افراد کے خلاف نامزد مقدمہ قائم کر کے ان کو جیل بھیجا جا چکا ہے، ان کے خلاف گنگیسٹر اور این ایس اے کے تحت مقدمے قائم کئے گئے ہیں۔ اتنی سی بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ جب تصادم ہوتا ہے تو غلطی ایک کی نہیں بلکہ جانبین کی ہوتی ہے ایسے میں صرف ایک طبقے کے خلاف کارروائی کیسے کی جا سکتی ہے؟ لیکن پولیس اور انتظامیہ نے کھل کر یہی کیا اور حکومت بھی انصاف کے بجائے صرف ووٹ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ایک ہی طبقے کے 35 افراد کو گرفتار کر کے جیل بھیجا جانا، ان پر گینگیسٹر اور این ایس اے تحت مقدمے قائم کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس خبر نے پوری ریاست کے مسلمانوں میں خوف و دہشت پیدا کر دی ہے۔ حکومت کی اس کارروائی نے واضح کر دیا ہے کہ اس کی نظر قیام امن و انصاف کے بجائے اپنی سیاسی زمین کو مضبوط کرنے پر ہے۔ اس معاملے میں دوسرا طبقہ پولیس کی نظر میں بالکل پاک وصاف ہے، اس کے خلاف کسی طرح کی کوئی ایف آئی آر تک درج نہیں ہوئی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ سب صرف بی جے پی کے دور حکومت ہو رہا ہے، اس سے قبل جب مرکز میں کانگریس تھی تب بھی یہی ہوتا رہا، ریاست میں سماجوادی پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی اور اب بی جے پی کے دور میں یہی ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان سب کی ذہنیت ایک ہی کیوں ہے؟ کیا حکومت کا یہی کام ہے کہ وہ ووٹوں کی سیاست میں مسلموں کا استحصال کرتی رہے جو بھی مسلموں کا زیادہ استحصال کرے اس کو زیادہ ووٹ ملیں۔ کانگریس نے ایک جانچ کمیٹی بنائی تھی جس کو دلتوں اور

مسلمانوں کے مابین تصادم کی جانچ کرنی تھی مگر اس میں ایک بھی مسلم شامل نہیں تھا، جب اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی تب جا کر جانچ ٹیم میں اقلیتی طبقے کے لوگوں کو بھی شامل کیا گیا جس سے اس کی ذہنیت بھی آشکارا ہو جاتی ہے۔ مسلمان جس پارٹی کے لئے کردریاں بچھاتے ہیں اور کرسیاں سیدھی کرتے ہیں ان میں سماج وادی پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی دونوں شامل ہیں۔ بہوجن سماج پارٹی کا خیر کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے بولے یا کم از کم انصاف کی بات کرے سماجوادی پارٹی بھی خاموش بیٹھی ہے اس نے بھی یہ کوشش نہیں کی کہ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کرے۔ اس لئے مسلمانوں کو ان سیاسی پارٹیوں سے تو کوئی امید کرنی ہی نہیں چاہئے کہ وہ ان کی لڑائی لڑیں گی۔ دلت یقیناً ہزاروں برس سے مظلوم و محروم رہے لیکن ان پر مسلمانوں کے بجائے جو ظلم و زیادتی ہوئی اس کے ذمہ دار خود وہ لوگ ہیں جو آج انصاف کے نام پر اقلیتوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ وہ ماضی میں اپنے مظالم کا بدلہ دلتوں کو مسلمانوں پر ظلم کر کے دے رہے ہیں چونکہ دلتوں کا معتد بہ طبقہ ہے جو آج بھی خود کو ہندو نہیں مانتا ہے اور بی جے پی سے چھٹکارہتا ہے اس کو پوری طرح سیا پنی طرف کرنے کے لئے جس پارٹی کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ انصاف کرنے کے بجائے وہ مسلمانوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کر کے ماضی اور حال کی اپنی استحصالی کارروائی کا بدلہ ان دلتوں کو دے دیتے ہیں جس کو مکافات عمل سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔

ایک ہی ریاست میں اور ایک ہی ماہ دو واقعات ہوتے ہیں اور دونوں کا تعلق دلتوں سے ہوتا ہے، ایک معاملے میں پولیس اور انتظامیہ بہت تیزی سے کارروائی کرتے ہوئے دلتوں کو یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ کی حکومت میں ان پر ظلم نہیں ہونے دیا جائے گا اور خود وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ اس معاملے میں ہدایات جاری کرتے ہیں لیکن دوسرے معاملے میں وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ، اور ضلع انتظامیہ کا انصاف کہاں چلا جاتا ہے؟ اس معاملے میں ٹھاکروں پر کارروائی کر کے دلتوں میں تحفظ کا ماحول کیوں نہیں پیدا کیا جاتا؟ دلتوں کو ایک بات یاد رکھنا چاہئے کہ ان کا تصادم جب بھی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں سے ہوگا تو ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا، ان کے ساتھ وہی ویدک کال اور شاستروں کے دور والا رویہ اختیار کیا گا لیکن جب کبھی وہ مسلموں کے

سامنے آجائیں گے تو ان کی پشت پناہی کی جائے گی کیونکہ اس کے پیچھے بھی ایک مقصد چھپا ہوا ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کے بعد اگر کوئی طبقہ مظلوم ہے تو وہ دلتوں کا ہی ہے اور اس لئے بی جے پی ان دونوں کو ایک ساتھ نہیں ہونے دینا چاہتی ہے، منصوبہ بند سیاسی ایجنڈا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ جب دو مظلوم ایک ساتھ آجائیں گے تو مظلوم نہ رہ کر وہ طاقت ور بن جائیں گے، جو ان کی حکومت اور ان کے اقتدار کے لئے خطرہ ہوسکتے ہیں۔ ماضی میں وہ اس کا نمونہ دیکھ چکے ہیں اس لئے ان کی بھرپور کوشش ہے کہ ان دونوں طبقات کو آپس میں لڑا کر دور رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جونپور میں مسلمانوں کے خلاف سخت کارروائی اور گورکھ پور میں ہر طرف سناٹا نہ ہوتا۔ اگر حکومت کو دلتوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی تو وہاں ٹھاکروں کے خلاف کارروائی ہوتی، ان پر مقدمے قائم کئے جاتے اور ان کو بھی جیل بھیجا جاتا۔ حکومت کو معلوم ہونا چاہئے کہ قیام امن و انصاف ہی اس کا اصل کام ہے۔ وہ اقتدار کا سہارا لے کر اگر اپنے سیاسی ایجنڈے پورا کرنا چاہتی ہے تو زیادہ دنوں تو اس کی حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کیونکہ گورکھ پور جیسے واقعات اس کی قلعی کھولنے کے لئے تو ہوتے ہی رہیں گے جہاں مجبوراً اس کو خاموشی اختیار کرنی پڑے گی۔

جہاں تک سوال مسلمانوں کے تحفظ اور ان کے ڈر و خوف کا ہے تو سی اے اے سے قبل اور سی اے اے کے خلاف تحریک اس کا بین ثبوت ہے، مسلمانوں کے ساتھ پورے ہندستان میں خاص طور پر اتر پردیش اور دہلی میں پولیس کا رویہ، لاک ڈاؤن میں مدھیہ پردیش میں صرف داڑھی کی بنیاد پر ایک غیر مسلم کو مسلم سمجھ کر پٹائی، صفورہ زرگر کی گرفتاری اور جیل، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ میں مسلم طلبا کے ساتھ بربریت سے بھرپور پولیس کا رویہ واضح کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ اس وقت تک یہ رویہ اختیار کیا جاتا رہے گا جب تک کہ ان کے پاس مضبوط سیاسی طاقت نہیں ہو جاتی، اس لئے چھوٹے چھوٹے معاملات کے بجائے اس تناظر میں ہندستان کے مسلمانوں کو سوچنے کی ضرورت ہے تاکہ اس درد کا مداوا ہو سکے۔

# جمہوری اوزاروں سے جمہوریت کا قتل

جمہوریت دنیا کا سب سے خوبصورت نظام حکومت ہے، جس میں نہ صرف ہر ایک کو یکساں حقوق حاصل ہیں بلکہ سماج کے نچلے طبقے سے لے کر سب اونچی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کی زندگی کو خوبصورت بنا کر ان کے حقوق کی تحفظ بھی کرتا ہے۔ دنیا کے ہر کونے میں یہ نظام حکومت اسی لئے رائج ہے اور جہاں نہیں ہے وہاں کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہ اس کا خوبصورت اور خوابناک پہلو ہے لیکن اس کا سیاہ پہلو نہایت ڈراؤنا ہے۔ اس ڈراؤنے پہلو سے متعلق وقتاً فوقتاً دانشورون نے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ حال میں 2018 میں شائع اسٹیون لیوسکی اور ڈینیل زیبلٹ کی کتاب How Democracies Dei:What History Reveals about Futre جمہوریتیں کیسے مرتی ہیں اور تاریخ مستقبل کے بارے میں کیا بتا رہی ہے'' نظر سے گزری۔ جس کے تناظر میں اگر ہندستان کا جائزہ لیا جائے تو ایک ایسی بھیانک صورت حال نظر آتی ہے جو رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ یہ کتاب جمہوریتوں کی موت کا ایک الگ بیانیہ قائم کرتی ہے، جس کے مطابق جمہوریت کو جمہوری اوزاروں سے ہی مارا جا رہا ہے۔ جمہوری ممالک پر اب مطلق العنانی کا نفاذ تختہ پلٹ، ایمرجنسی یا ڈکٹیٹرشپ کے ذریعہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس کے لئے آئین کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ جمہوریت کے لئے ایک ایسا میٹھا زہر ہے جو کسی کو دکھائی نہیں دیتا ہے لیکن وہ زہر دھیرے دھیرے جمہوری نظام کو ختم کرتا جا رہا ہے۔ جس میں کوئی آواز نہیں ہوتی، کوئی شور و ہنگامہ نہیں ہوتا۔ یہ کام کرنے والے خود نہ صرف جمہوریت کے علمبردار ہوتے ہیں بلکہ جمہوری طور پر منتخب افراد ہوتے ہیں جو اپنے ایجنڈوں کے نفاذ کے لئے دھیرے دھیرے اس نظام کو اسی نظام کے ساز و سامان اور آلات سے ختم کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ نئی ترمیمات و اصلاحات کو نافذ کرتے ہیں۔ دکھانے کے لئے عوامی فلاح اور ملک کی سالمیت کے لئے یہ عمل ہوتا ہے لیکن درحقیقت ان کے پس پشت

ایک خاص ایجنڈا ہوتا ہے۔اہم بات یہ کہ اس کے لئے جو اوزار استعمال کیا جاتا ہے اس میں سب سے پہلا اوزار عدلیہ ہے۔اس کتاب میں وینز ویلا، روس، ہنگری اور امریکہ کی مثالیں دی گئی ہیں، ہندستان کی مثال اس میں شامل نہیں ہے۔

اس تناظر میں اگر ہندستان کا جائزہ لیا جائے تو بہت صاف صاف نظر آتا ہے کہ ملک میں ایمر جنسی نافذ نہیں ہے، کسی ڈکٹیٹر کی حکومت نہیں ہے، جو بھی حکومت میں ہیں وہ منتخب ہو کر پارلیامنٹ میں آئے ہیں، اس طرح ملک میں جمہوری نظام رائج ہے۔لیکن لوگ جو محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ حکومت صرف دو افراد کی ہے، جو وہ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔وہ کیا چاہتے ہیں اس حوالے سے آئین میں متعدد نئی ترمیمات، سی اے اے، کشمیر معاملہ، بابری مسجد-رام مندر فیصلے کے ساتھ اس طرح کے دیگر فیصلوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔حالیہ تناظر میں اگر اس کو دیکھا جائے تو میڈیا کے ایک طبقے کی آواز بند کرنا اور دوسرے طبقے کو کھلی چھوٹ دینا اسی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔حال میں دو ایسے معاملات رونما ہوئے ہیں جن کا اگر جائزہ لیا جائے تو بات بہت واضح ہو جائے گی۔ایک کا تعلق کشمیر اور دوسرے کا تعلق پورے ملک سے ہے۔

حکومت نے چند دنوں قبل کشمیر میں نئی میڈیا پالیسی کا اعلان کیا ہے۔جس کی رو سے اب میڈیا ہاؤس یا صحافی ہر خبر قارئین و ناظرین تک نہیں پہنچا سکیں گے، بلکہ اس کے لئے اب معیار مقرر کر دئے گئے ہیں۔اس نئی میڈیا پالیسی کے مطابق صحافیوں اور اخبارات وغیرہ کی منظوری کے لئے ان کے بیک گراؤنڈ کی جانچ کی جائے گی، جس کے بعد ہی ان کو اس پیشے سے وابستہ ہونے کی اجازت مل سکے گی۔حکومت نے میڈیا پر پابندیا عائد کرنے کے لئے ایک وسیع پالیسی تیار کی ہے، جس کے لئے 63 صفحات پر مشتمل دستاویز شائع کیا ہے۔بنیاد یہ بنائی گئی ہے کہ حکومت ''اینٹی نیشنل'' خبروں کو شائع کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی ہے، چونکہ اس ریاست کا تعلق سرحد سے ہے، اس لئے سلامتی اور تحفظ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔اس سلسلے میں وہاں پہلے سے موجود اخبارات و چینل کے مدیران سے نہ تو مشورہ کیا گیا اور نہ ہی ان کو مطمئن کیا گیا۔اس وقت

کشمیر سے تعلق رکھنے والے اخبارات و چینل حکومت کی اس پالیسی کے خلاف نہ صرف مظاہرے کررہے ہیں بلکہ اس کو ''میڈیا کی موت'' سے تعبیر کررہے ہیں۔

کشمیر ایک مسلم آبادی والی یونین ٹریٹری ہے، جہاں کشمیر اور انڈیا آزادی کے وقت سے ہی برسر پیکار ہیں۔ یہاں کے میڈیا مالکان، مدیران اور صحافیوں کا سوال ہے کہ کیا مڈبھیڑ میں فوجیوں کی شہادت اور ان سے لڑنے والوں کی اموات کی اطلاع اینٹی نیشنل عمل ہے؟ یا آزادی کے نعرے کی خبر لکھنا اور اس کو ملک کے عوام تک پہنچانا اینٹی نیشنل ہے۔ ان کا کہنا ہے صحافت کوئی جرم نہیں ہے، حکومت ان کو دفاتر کے کلرکوں اور پریس ریلیز کا دست نگر بنا رہی ہے جو ''فریڈم آف اسپیچ'' اور آزادانہ صحافت کے لئے موت ہے۔ وہ آزادانہ صحافت کا مطالبہ کرتے ہوئے حکومت سے اس طرح کے متعدد سوالات کرتے ہیں۔ حکومت نے ان سب کو درکنار کرتے ہوئے نئی میڈیا پالیسی نافذ کردی ہے۔ یہ تو کشمیر کا معاملہ ہے جہاں اعلانیہ طور نئی میڈیا پالیسی کا نفاذ عمل میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ پورے ملک میں اس طرح کی کسی پالیسی کے نافذ کا اعلان تو نہیں ہے اس کے باوجود ایسے صحافیوں کو مستقل نشانہ بنایا جارہا ہے جو حکومت کی ناکامیوں، انتظامیہ کی بدنظمیوں اور غبن سے لے کر مفاد عامہ میں کے لئے آواز اٹھا رہے ہیں۔ مارچ میں لاک ڈاؤن کی ابتدا میں جب اتر پردیش کے وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ ایودھیا میں ایک مذہبی تقریب میں شریک ہوئے تو اس کی خبر پر دی وائر کے ایڈیٹر سدھارتھ وردراجن کے خلاف ایف آئی آر درج کی تھی اور اجودھیا سے دہلی لاک ڈاؤن کے دوران پولیس نوٹس لے کر آئی تھی۔ بنارس میں مارچ میں دو صحافیوں کو اس لئے وجہ بتاؤ نوٹس دی گئی تھی کیونکہ انہوں نے یہ خبر دی تھی موسہر سماج کے لوگ گھاس کھانے پر مجبور ہیں۔ جس سے انتظامیہ کی بدنظمی اور پی ڈی ایس نظام کی ناکامی واضح ہوتی تھی۔ اس سے قبل مرزا پور میں اگست 2019 میں پرائمری اسکول میں بچوں کو نمک روٹی دئے جانے پر صحافی کے خلاف ایف آر درج ہوئی تھی۔ ابھی حال میں بنارس میں ایک خاتون صحافی پر حقائق کے انکشاف کے الزام میں قانون 1989 اور آئی پی سی کی متعدد دفعات مثلا 269 (کسی بیماری کے پھیلانے کے لئے غیر ذمہ داری سے کیا گیا کام جس سے زندگی کو

خطرہ ہو) دفعہ 150 (ایسے مواد کی اشاعت جس سے کسی کی توہین وتحقیر ہوتی ہو) ایس سی ایس ٹی ایکٹ کے تحت ایف آئی آر درج کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں لاک ڈاؤن کے دوران ہونے والی دشواریوں کو گاؤں والوں کے حوالے سے اجاگر کیا تھا۔ یہ موضع ان مواضعات میں سے ایک ہے جسے وزیر اعظم نے گود لیا تھا۔ ایس ٹی ایس سی ایکٹ کے تحت مقدمہ اس لئے ہوا کیونکہ شکایت کرنے والی مالا دیوی نے الزام لگایا ہے کہ رپورٹ سے میرا اور میری ذات کا مذاق اڑایا گیا ہے، جس سے میری عزت ووقار کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اس ایف آئی آر کے پس پشت کون ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب کوئی صحافی مالا دیوی سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ ڈی ایم صاحب سے بات کرلیں۔

اس لاک ڈاؤن میں حکومت وانتظامیہ نے اپنی ذمہ داریاں کس طرح سے ادا کی ہیں وہ جگ ظاہر ہیں۔ جس کی قلعی کھولنے میں سچی صحافت کے علمبردار صحافیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ پورے ملک میں ایسے 55 صحافیوں پر پورے مقدمے ہوئے، آیف آئی آر درج، ہوئی یا وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا گیا۔ جس کا انکشاف رائٹس اینڈ رسکس انالیسس گروپ (راگ) کی ایک رپورٹ سے ہوا ہے۔ حکومت میڈیا پر کنٹرول اس لئے چاہتی ہے کیونکہ یہ وہ گیٹ وے ہے جس کے ذریعہ حکومت کی مطلق العنانی، بدنظمی اور آئین مخالف کاموں پر سوال اٹھائے جاسکتے ہیں۔ آج ملک میں ایمرجنسی یا ڈکٹیٹر شپ تو نہیں ہے لیکن سنسر شپ کا ایسا ماحول بنا دیا گیا ہے کہ سچی خبریں لکھنے اور شائع کرنے سے قبل کئی بار صحافیوں کو سوچنا پڑ رہا ہے۔ اگر ملک کے عوام نے اس جانب توجہ نہیں دی تو یقینا جمہوریت کیسے مرتی ہے اس کا نظارہ اسی طرح کرتے رہنا ہوگا اور تاریخ یہ پیشین گوئی کر رہی ہے کہ جب جمہوریت کو جمہوری اوزاروں سے موت کے گھاٹ اتارا جارہا تھا اس وقت ہندستان کے عوام خاموش تھے۔ جب ہم مردہ جمہوریت آنے والی نسلوں کو سونپ کر جائیں گے تو وہ بھی ہمیں مردوں میں ہی شمار کریں گی۔ اس لئے جمہوریت کے قتل کے آلات کو پہچاننا اور اس کو موت سے بچانے کے لئے میدان میں آنا ضروری ہے۔

# دستاویز

## میڈیا نے مسلمانوں کو دہشت گرد بنا دیا

یہ دور میڈیا کا ہے، جنگیں اب توپوں اور ٹینکوں سے بہت بعد میں لڑی جاتی ہیں، سب سے پہلی جنگ ذرائع ابلاغ کی سطح پر لڑی جاتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ عوامی ذہن کو تیار کرنے کا ذرائع ابلاغ مؤثر ترین آلہ ہے۔ اسی سے ذہن بنائے بھی جاتے اور بگاڑے بھی جاتے ہیں، یہاں تک کہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اپنے مطابق سماج کی نفسیات تشکیل کی جاتی ہے۔ میڈیا پوری طرح سے انسانی دنیا پر حاوی ہو چکا ہے۔ انڈرائڈ موبائل فون کے بعد ذرائع ابلاغ انسانی زندگی کے ہر لحہ میں دخل انداز ہو گیا ہے جس کے ذریعہ ذریعہ جس کے توسط سے سماج کا ذہن تشکیل پایا ہے۔

ذرائع ابلاغ کا ہی سہارا لے کر اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے دہشت گردی اور اسلامی دہشت گردی جیسی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں اور ان کو سماج میں رائج کیا گیا ہے۔ قرآنی تعلیم ”**من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا** (سورۃ: مائدۃ، آیت نمبر 32) یعنی اگر کسی شخص نے بغیر قصاص کے کسی شخص قتل کیا یا روئے زمین پر فساد کی غرض سے کسی کو قتل کیا تو گویا اس نے ایک انسان نہیں بلکہ پوری انسانیت کو قتل کر دیا، اور اگر کسی نے ایک شخص کے ساتھ ایسا عمل کیا جس سے اس کو زندگی مل جائے تو گویا اس نے پوری انسانیت کو زندگی عطا کر دی“ کے برعکس آج جب بھی لفظ ’دہشت گردی‘ بولا، سنا لکھا یا پڑھا جاتا ہے تو اس کا صرف ایک مرکز ہوتا ہے اور وہ ہے مسلمان اور اسلام۔ مذہب اسلام اور دہشت گردی آج لازم ملزوم بنا دیئے گئے ہیں۔ سماج کے اعلیٰ فرد سے لے کر ادنی شخص تک اس لفظ کا ایک ہی مفہوم سمجھتا ہے۔ دہشت پھیلانے والے کا مذہب اگر اسلام نہیں ہے تو وہ خواہ کتنی ہی دہشت پھیلا دے، سماج میں لوگوں

کا جینا دو بھر کر دے مگر وہ دہشت گردی نہیں ہوگی اس کو دوسرے ناموں سے یاد کیا جائے گا۔

سب سے بڑا اور اہم سوال یہ ہے کہ سماج کی اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے یہ ذہنیت کیسے بنی؟ ان کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اسلام دہشت گردی کا مذہب ہے اور مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بہت آسان بھی ہے اور گذشتہ ایک صدی کا سب سے پیچیدہ اور مشکل بھی۔ ہر وہ شخص جو ٹیلی ویژن دیکھتا ہے، اخبار پڑھتا ہے یا پھر سماجی روابط کی ویب سائٹ کا ستعمال کرتا ہے وہ یہی مانتا ہے کہ اسلام دہشت گردی کا مذہب ہے اور مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں۔ یہ سب سے آسان اور درست جواب ہے، ورنہ آپ ان ذرائع سے دور رہنے والے لوگوں سے ملئے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں کیونکہ وہ عملی زندگی میں مل کر ایک ساتھ رہے رہے ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے رویے بخوبی واقف ہوتے ہیں، مذکورہ سوال کا جواب اس معنی نہایت مشکل ہے کہ اس کے پیچھے کس کی کارفرمائی ہے، کس نے اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح استعمال کی، اس کے مقاصد کیا تھے؟

سماج کا ایک بڑا طبقہ اس سے نابلد ہے کہ اسلامی دہشت گردی موجود کہاں سے ہوا، کس نے اور کیوں اپنے مذموم مقاصد کے لئے اس اصطلاح کا استعمال کیا؟۔ اس کے لئے ہمیں ماضی بعید میں جانا ہوگا اور تاریخ کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ سب سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ پوری دنیا کے نظام پر قبضہ کرنے اور پوری دنیا کے عوام پر حکومت کی غرض سے لیگ آف نیشنز جس کو اقوام متحدہ کے نام سے موسوم کیا جاہے کا قیام عمل میں لایا گیا لیکن اس سے قبل عالمی نظام کا ایک خاکہ تیار کر لیا گیا تھا اب سے تقریبا ایک سو پچیس برس قبل سوئٹزرلینڈ کے شہر بازل میں یہودی دانشوروں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی جس نے 19 ابواب کا ایک دستاویز تیار کیا تھا جس کے بارہویں باب میں پریس کو قابو میں کرنے کا بیان ہے۔ اس دستاویز میں واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح پریس کو قابو میں کیا جائیگا اور کیسے عوام کے ذہن کو اپنی ضرورت کے مطابق تیار کیا جائے گا۔ اس کے فائدے اور نقصانات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ٹیلی

ویژن کی اختراع کو محض سترہ برس ہوئے تھے۔لیکن یہ اس کا بالکل ابتدائی دور تھا، اسکاٹش انجینئر جان لوگی برڈ (john Logie Baird) نے 1926 میں پہلا ورکنگ ٹیلی ویژن تیار کیا۔لیکن اس سے قبل ہی یہودی دانشوروں نے پریس کو قابو میں کرنے کے خفیہ دستاویز تیار کر لئے تھے۔اس کانفرنس میں گریٹ اسرائیل کو وجود میں لانے کا لائحہ عمل بھی تیار ہوا تھا۔

اس دستاویز کے بارہویں باب میں پریس کو تین سطح پر تقسیم کیا گیا ہے۔اول ایسے رسائل جو ہمارے مفادات کی نگرانی کریں گے۔دوم وہ رسائل جو نیم سرکاری ہوں گے اور غیر جانبدار لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں گے۔سوم وہ رسالے جو اپنی ہی مخالفت میں نکالے جائیں گے تاکہ کوئی شک نہ کر سکے اور دشمن ان کو اپنا سمجھ کر اپنا باطن کھول سامنے رکھ دیں گے۔جس سے وہ ان پر قابو حاصل کر لیں گے۔اس میں رسائل کی بات کی گئی ہے لیکن مراد ذرائع ابلاغ ہیں۔

منصوبہ بندی کے ساتھ یہودیوں نے اس پر سرمایہ کاری کی اور آج پریس کا پورا عالمی نظام ان کے ہاتھوں میں ہے۔وہ پریس پر پوری طرح سے قابض ہیں۔ایجنسی فرانس پریس یوں تو 1835 میں قائم ہوئی لیکن 1944 میں اس کا نام اے ایف پی رکھا گیا جس کے منشور میں لکھا ہے کہ وہ غیر جانبدار رہے گا اور ملنے والا چندہ ہی اس کا ذریعہ آمدنی ہوگا۔اسی طرح ایسوسی ایٹیڈ پریس 1864 میں قائم ہوا، یونائٹیڈ پریس، 1907 اور انٹرنیشنل نیوز سروس 1909 میں ای وی اسکرپس نے قائم کیا۔1851 میں نے رائٹر کے نام سے عالمی نیوز ایجنسی قائم کی جس کے پوری دنیا میں تقریباً دو ہزار سینٹر ہیں۔یہ بڑی بڑی ایجنسیاں ہیں جو پوری دنیا میں خبریں بھیجتی ہیں۔ہم وہی دیکھتے ہیں جو یہ دکھاتی ہیں ہم وہی پڑھتے ہیں جو یہ پڑھاتی ہیں۔یہ نیوز ایجنسیاں یا تو یہودیوں کی ہیں پھر ان پر ان کا قبضہ ہے۔کمپنیوں میں شیئر کی خرید و فروخت کے بعد سے اس بات کی کوشش کی جانے لگی کی اتنے شیئر خرید لئے جائیں، جس سے کمپنی ان کے زیر اثر رہے اس لئے بہت سی عالمی ایجنسیاں ایسی ہیں جو یہودیوں کے زیر اثر ہیں۔ان ایجنسیوں میں اتنی

طاقت ہے کہ وہ امریکہ اور انگلینڈ جیسے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں۔

دہشت گردی کی اصطلاح کا استعمال گریٹ اسرائیل کے قیام کے منصوبے اور عرب دنیامیں تیل کے ذخائر ملنے سے شروع ہوتا ہے کیونکہ قیام اسرائیل اور تیل کے ذخائر پر قبضہ میں میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمان تھے۔فلسطین میں قبلہ اول ہونے کی وجہ سے ان کو خطرہ تھا کہ پوری دنیا کے مسلمان اس یہودی ریاست کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان کو اپنی قلت کا بھی احساس تھا۔اس لئے یہودیوں نے پوری دنیا کا ذہن بنانے کے لئے سب سے پہلے پریس کو قبضے میں لینے کا فیصلہ کیا جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔قیام اسرائیل پورا ایک الگ قضیہ ہے اسی طرح تیل کے ذخائر کا معاملہ تھا کہ نفسیاتی طور پر ان کو کمزور کر کے ان سے منافع حاصل کیا جائے یہی وجہ ہے کہ اسلامی دہشت گردی جیسی اصطلاح کا تعلق ان دونوں سے بہت گہرا ہے۔قیام اسرائیل کے بعد اس کو ہر طرح سے محفوظ کرنے کے لئے جس طرح امریکہ اور انگلینڈ نے اسلحہ، گولہ و بارود اور رقم صرف کی اسی طرح سے ان دونوں ملکوں نے اپنا ذرائع ابلاغ بھی اس کے لئے پہلے دن سے وقف کر دیا۔جو ہنوز جاری ہے۔

پریس کے زمرے میں اخبارات و رسائل سے لے کر ٹی وی ڈرامے، فلمیں اور خبروں تک میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ کسی بھی طرح سے اسرائیل کو محفوظ کیا جائے جس کے لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو بدنام کیا جائے ،اور تیل کے ذخائر پر قبضہ کے لئے اسلامی ممالک میں خانہ جنگی کرائی جائے۔مغربی ممالک کے ذرائع ابلاغ نے اس میں بھر پور اپنا کردار ادا کیا۔پہلے یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک دوسرے ممالک کے سیریل، ٹیلی ویژن کی خبریں دیکھی جاسکیں لیکن دھیرے دھیرے جب یہ بھی ممکن ہو گیا تو ایسی فلموں اور ڈراموں پر زور دیا جانے لگا جس میں اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ مسخ کی گئی ہو۔ہالی ووڈ سے لے کر بالی ووڈ تک ایسی فلمیں بنائی گئیں جن میں مسلمانوں کو منفی کردار میں پیش کیا گیا۔آج بھی بالی ووڈ میں ڈان یا قصائی کے کردار میں مسلمان ہی نظر آتے ہیں جس سے پورے ملک میں ان کی شبیہ خراب ہوتی ہے،اسی طرح ہالی ووڈ کی

فلموں میں عربوں کو عیاش دکھایا جاتا ہے جو منفی سوچ کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔لارنس آف عربیہ ایک ایسا شخص تھا جس نے خلافت عثمانیہ کی قبا کو چاک کردی اس نے عالم عرب میں علاقائی عصبیت پیدا کر کے یہودی عازئم کو پورا کیا اس کی زندگی پر اس کے نام سے فلم بنائی گئی جس میں عربوں کو عیش پرست اور بے وقوف کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ان فلموں کے ذریعہ عوام کے ذہن میں یہ بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ مسلمان دہشت پسند ہوتا ہے۔وہ قتل و غارت گری پر یقین رکھتے ہے۔ایک طرف ان فلموں نے مسلمانوں کی شبیہ خراب کی تو دوسری جانب یہودی پریس بدنام زمانہ ایجنسی موساد کے قاتلوں اور دہشت پھیلانے والوں کے ذریعہ عرب ممالک کے مسلمانوں کو پوری دنیا کی نظروں میں مشکوک بنایا۔موساد کے ایجنٹ مصر ولبنان اور شام میں دھماکے کرتے تھے لیکن اس کا الزام مسلمانوں اور خاص طور پر اخوانیوں کے سر آتا تھا۔بڑی چابکدستی سے یہودی خبر رساں ایجنسیاں اپنی خبروں میں لکھتی تھیں کہ ابھی حقائق کا تو پتہ نہیں چلا ہے لیکن معتبر ذرائع کے مطابق یہ دھماکہ فنڈامنٹلسٹوں نے کیا ہے۔

اس سلسلے میں مولانا نذرالحفیظ ندوی نے اپنی کتاب مغربی میڈیا اور اس کے اثرات میں متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

29 جنوری 1987 کو جنوبی کوریا کے بوئنگ ایل ایل کو دھماکہ سے اڑا دیا گیا تو مغربی میڈیا نے عربوں کے خلاف زہر افشانی جبکہ ایک برس بعد پتہ چلا کہ جنوبی کوریا کی ہی ایک خاتون نے شمالی کوریا کے اشارہ پر یہ دھماکہ کیا تھا۔

اسی طرح 1963 میں جان ایف کینڈی کے قتل کے بعد مغربی میڈیا نے بشارہ سرحان کو بغیر کسی تحقیق کے ذمہ دار ٹھہرادیا اور پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔یہ تو وہ واقعات ہیں جو ماضی میں رونما ہوئے۔ان کا ذکر میں نے پس منظر کے طور پر کیا ہے کس طرح سے اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح کو میڈیا نے فروغ دے کے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔

آج کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تب بھی وہی بات صادق آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مغربی میڈیا جن خطوط پر سوا سو سال قبل چلا تھا آج بھی ان ہی خطوط پر وہ چل رہا ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں کوئی واقعہ رونما ہو فوراً اسکو مسلمانوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ معاملہ صرف مغربی میڈیا کا نہیں ہے اسی طرز اور روش پر دوسرے ممالک کے ذرائع ابلاغ بھی چل رہے ہیں کیونکہ رول ماڈل تو وہی ہے۔ آج بھی فوراً ٹی وی چینلوں اور اخبارات میں واقعہ رونما ہونے کے بعد یہ خبر دی جاتی ہے کہ اس میں المملکتہ الاسلامیہ، الحرکتہ الجھادالاسلامی جیسی تنظیموں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ نیوز ایجنسیاں مسلمانوں کو اس طرح دہشت گردی سے جوڑتی ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص کو سماجی روابط کی ویب سائٹ پر فالو کر رہا تھا اس لئے وہ اس کے نظریات سے متاثر ہوا اور دہشت گردانہ عمل انجام دیا۔ ڈاکٹر ذاکر نائک کے معاملے میں کیا ہوا؟ کسی نے ان کو شوسل سائٹ پر فالو کیا تو وہ خود دہشت گرد بنا دیئے گئے لیکن جب یہی عمل وزیر اعظم کرتے ہیں یا ان کو فالو کرنے والا کرتا ہے تو سب خاموش ہو جاتے ہیں یہی دوہرا معیار کیوں ہے؟ اسی طرح سے جائے واردات سے اسلامی نام والے کچھ پرچے، کوئی خط، یا اسلامی نام کا کو.جی آئی ڈی کارڈ ان ایجنسیوں کو دستیاب ہونے کی خبر مل جاتی ہے۔ چھاپے میں اسلامی لٹریچر بھی مل جاتا ہے لیکن یہ اسلامی دہشت گردانہ لٹریچر کبھی منظر عام پر نہیں آیا ہے۔

حال میں عراق و شام میں ایک بدنام زمانہ اسلامی نام والی تنظیم اسلامک اسٹیٹ نے خوب قتل و غارت مچائی اس کے نہایت خوفناک ویڈیو منظر عام پر آئے جس میں ٹوپی ،داڑھی، کرتا شلوار اور عربی رومال کے ساتھ اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ بڑی بے رحمی سے لوگوں کو قتل کرتے دکھایا گیا ہے لیکن شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ وہ ویڈیو ہیں جن کی شوٹنگ ہالی ووڈ کے ان فلم سٹیز میں کی گئی ہے جہاں ہارر فلموں کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ بعض ایسی بھی ویڈیو سامنے آئیں ہیں جن کے بارے میں سماجی روابط کی ویب سائٹس پر بتایا گیا کہ وہ فلاں فلم کی شارٹ کلپنگ ہے۔ سب سے آسان سوال ہمیں خود سے کرنا چاہئے کہ اسلامک اسٹیٹ دنیا میں

خلافت کے لئے قتل وغارت مچا رہی ہے تو اس نے شام سے ملحق اسرائیل کو آج تک کبھی نشانہ کیوں نہیں بنایا؟ اس نے امریکہ کو کبھی دھمکی کیوں نہیں دی؟ بس کے جواب سے اس کی حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی۔

مغرب نے ہی نہیں ہندستان کی میڈیا نے بھی دہشت گردی کا دہرا پیمانہ بنا رکھا ہے۔ اگر کسی یہودی، عیسائی یا ہندو نے قتل وغارت گری مچائی ہے تو دہشت گرد نہیں ہے نہ ہی میڈیا اس کے لئے اس طرح کی اصطلاح کا استعمال کرتا ہے اس کے برخلاف کسی مسلم کی گرفتاری کے ساتھ ہی اس کو دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس وطن عزیز میں ہی سیکڑوں ایسے نوجوان ہیں جو دہشت گردی کے الزام میں گرفتار کئے گئے لیکن پندرہ برس اور بیس برس کے بعد وہ باعزت بری ہو گئے۔ جمیت علما ہند نے اس سلسلے میں قابل قدر کام کئے ہیں، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میڈیا گرفتاری کے وقت تو ان کی تصویر کے ساتھ دہشت گرد لکھتی ہے لیکن وہی جب باعزت بری ہوتے ہیں تو ٹی وی پر ایک اسکرول میں خبر دی جاتی اور اخبار میں ایک کالم میں سمیٹ دیا جاتا ہے۔

ابھی 15 مارچ کو نیوزی لینڈ میں دو مساجد میں نماز کے وقت اندھا فائرنگ کر کے پچاس افراد کو ایک دہشت گرد نے موت کی نیند سلا دیا لیکن انٹرنیٹ پر بہت سرچ کرنے کے باوجود مجھے یہ نہیں ملا کہ کسی میڈیا نے اس کو دہشت گرد لکھا ہو، کسی نے اس کے لئے ٹیررسٹ کا لفظ استعمال کیا ہو۔ ہاں عالمی ذرائع ابلاغ نے اس کے لئے نفسیاتی مریض، اسلاموفوبیاں یعنی اسلام سے ڈرا ہوا ضرور قرار دیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک ذہنی مریض کو یہ معلوم ہے جمعہ کے دن نماز کے وقت میں گولی چلانے سے زیادہ لوگ مریں گے۔ اس کو جدید اسلحہ چلانا بھی معلوم ہے۔ شقاوت قلبی اتنی کہ اس کا لائیو ٹیلی کاسٹ بھی کیا اور گرفتاری کے بعد یہ بیان بھی دیا کہ مجھے نشانہ لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ ٹارگٹ اتنے زیادہ تھے۔

اس ویڈیو کو سماجی روابط کی ویب سائٹ اور انٹرنیٹ سے فوراً ہٹانے کی کوششیں بھی شروع ہو

گئی تھیں جبکہ صدام حسین کو پھانسی دیئے جانے کا لائیو ٹیلی کاسٹ ہوا تھا، جس سے اندازہ لگا ی جا سکتا ہے کہ ان کے نظریات میں کس قدر تباین پایا جاتا ہے۔ صدام حسین کی پھانسی کو صرف اس لئے دکھایا گیا تھا کیونکہ وہ مسلمان تھا تا کہ دنیا یہ دیکھے کہ مسلمان کس قدر ظالم ہوتا ہے، کیونکہ پھانسی کے ساتھ ہی ان پر عائد الزامات بھی سنائے اور دکھائے جارہے تھے جبکہ یہ ویڈیو یہ دلیل دے کر ہٹایا گیا کہ ذہنی مریض نے قتل و غارت گری مچائی تھی جس سے لوگوں کے ذہن متاثر ہوں گے اس لئے مناسب نہیں ہے حالانکہ اصل میں نظریہ کی کارفرمائی ہے ایک طرف مسلمان اور اسلام کو بدنام کرنا ہے جبکہ دوسری طرف بدنامی سے بچانا ہے۔

مجموعی طور پر جب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ اسلامی دہشت گردی جیسی اصطلاح میڈیا کی اختراع اور اس کی ایجاد ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں، یہ سازشی ذہن کا نتیجہ ہے جس کے پیچھے یہودی دماغ اور عیسائی پیسہ کے ساتھ ہی ان دونوں کی مشترکہ سوا سو سال کی محنت ہے۔ ان ہی خطوط پر ہمارے ملک کا میڈیا بھی چل رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رہنے والا مسلم تو اچھا ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر اس پر دہشت گرد ہونے کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے۔

# طلاق ثلاثہ بل کے بعد کرنے کے کام

ملک کے قوانین میں ایک اور بل ''طلاق ثلاثہ'' کا اضافہ ہو گیا، جو مسلمانوں کے عائلی قوانین میں دخل ہے۔ گذشتہ دو برسوں میں وضع کئے جانے والے قوانین میں یہ سب سے متنازع قانون ہے، جس کے خلاف سب سے زیادہ احتجاجی جلسے ہوئے تحریکیں چلیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا اور قانون بن گیا تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح اس قانون کی زد سے مسلمان خود کو بچا کر اس کو غیر مؤثر کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی مکتب فکر ایک ساتھ تین طلاق کو مناسب تصور نہیں کرتا ہے اور یوں بھی طلاق کو ''ابغض المباحات'' یعنی سب سے زیادہ ناپسندہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ اگر زن و شو کا ایک ساتھ رہنا محال ہو جائے تو سنت کے مطابق تین طہر میں تین طلاقیں دی جانی چاہئے، اس طرح ایک تو طلاق کا تناسب بھی کم ہو جائے گا کیونکہ اکثر معاملات میں وقتی غصہ ہی کارفرما ہوتا ہے جس کے تین طہر میں فرو ہونے کا غالب امکان ہے دوسرے مسلمان شرعی قانون پر عمل کر کے اس قانون کو غیر مؤثر بھی بنا دیں گے۔

ایوان بالا میں تین طلاق کا بل پاس ہو جانے کے بعد سب سے زیادہ مسلم پرسنل لا اور علما کو موردالزام ٹھہرایا گیا اور ان کے خلاف سماج سے لے کر میڈیا اور سوشل میڈیا تک بڑی دشنام طرازیاں کی گئیں اور موردالزام ٹھہرایا گیا جو نہایت غلط بات ہے، نہ تو کوئی خامی مسلم پرسنل لا میں ہے اور نہ اس میں علما کی غلطیاں ہیں، علما نے ایک مسئلہ بتایا کہ اگر کوئی ایک بیٹھک میں تین طلاق دے دیتا ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی جبکہ مسلم پرسنل لا نے قانون ساز اداروں کے سامنے اس سے متعلق دستاویز رکھے۔ جس طرح نکاح کے وقت دو بول بول دینے سے نکاح ہو جاتا ہے، اسی طرح طلاق کے وقت طلاق کہہ دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اس میں اور نہ کوئی عمل ہوتا ہے نہ ہی منطق، ایسے میں جو لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ مسلمان ایک مرتبہ میں تین طلاق دے کر اپنی بیوی کو خود سے دور کر دیتے ہیں ان سے پوچھا جانا چاہئے کہ کیا شادی میں اس سے زیادہ وقت لگتا ہے یا چار چھ دن کے عمل کے بعد شادی وجود میں آتی ہے؟ لیکن اس عمل کو

مستحسن نہیں قرار دیا گیا ہے۔

موسم باراں سے قبل گھر اور مکان کو درست کرالیا جاتا ہے خاص طور پر جن کے گھر چھپر اور کھپریل کے ہوتے ہیں وہ تو ترجیحی بنیاد پر ایسا کرتے ہیں تاکہ جب بارش ہو تو چین وسکون کی نیند سوسکیں۔ مرکز میں قائم حکومت کسی طوفانی بارش سے کم بالکل نہیں ہے جو اپنے نظریات پر عمل میں سب کو بہالے جانا چاہتی ہے۔ وہ ہندستان میں مذاہب کا تنوع نہیں دیکھنا چاہتی ہے بلکہ اس کی خواہش ہے کہ اس ملک کے قوانین میں چھیڑ چھاڑ کر کے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا جائے جو بھگوا رنگ ہوگا۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم پرسنل بورڈ اپنے عائلی قوانین کا جائزہ لے اور جو روایتیں ایسی قائم ہوئی گئیں ہیں جن کا تعلق دین کے بجائے تہذیب وثقافت یا غلط روایت سے ہے ان پر غور کرے۔

طلاق ثلاثہ کی طرح عائلی قوانین میں حلالہ کا مسئلہ بھی وقتاً فوقتاً زیر بحث آتا رہتا ہے، جس پر مسلمانوں اور اسلامی شریعت کو گھیرنے اور بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو سب سے پہلے واضح کردوں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے افراد پر لعنت بھیجی ہے اور فرمایا 'لعن اللہ علی الحلل و المحلل'' بدقسمتی سے حلالہ رائج ہے۔ سماج میں رائج حلالہ یقیناً لائق نفریں ہے کہ عورت اور مرد دونوں جانتے ہیں کہ جو شادی ہو رہی ہے وہ صرف ایک رات کی ہے، ایسا نکاح کرانے والے علما کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک رات کے لئے ہی ہیجو نہایت غلط عمل ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا نکاح ہی وجود میں نہیں آتا کیونکہ نکاح مؤقت حرام ہے۔ مسئلہ دراصل یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے میاں بیوی کے مابین تفریق ہوجائے اور وہ عورت دوسرے مرد سے شادی کرلے اور پھر اس نئے شوہر کا انتقال ہوجائے یا کسی وجہ سے وہ طلاق دے دے تو اب پہلا شوہر اس عورت سے نکاح کرسکتا ہے، جس کا شارٹ کٹ حلالہ رائج کردیا گیا۔

اس مسئلہ کو اگر وقت رہتے نہ سلجھایا گیا تو طلاق ثلاثہ کی طرح اس مسئلے کو بھی عورت کی عزت و عصمت سے جوڑ کر اس سے متعلق بل لایا جائے گا جس کے بعد مسلمانوں کا میڈیا ٹرائل شروع

ہو جائے گا، جو جگ ہنسائی کا باعث ہوگا، اس لئے مسلم پرسنل لا بورڈ کو بہت سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور وخوض کر کے سماج کو حقیقت سے روشناس کرانا چاہئے اور بتانا چاہئے کہ ایسی شادی جو ٹائم باؤنڈ/ مؤقت ہو اسلام میں جائز نہیں ہے اور وہ حرام کاری کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ابھی بہت زیادہ دن نہیں گذرے ہیں جب سپریم کورٹ نے سبری مالا میں خواتین کے داخلہ کی اجازت دی، یہ اور بات ہے کہ ہندوتو کے ٹھیکیداروں نے اس کو نہیں مانا لیکن قانون تو بن گیا کہ ان کو وہاں جانے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے جس کے بعد 15 اپریل 2019 کو مساجد میں خواتین کے داخلہ سے متعلق پونا کے زبیر حمد اور یاسمین نے ایک پٹیشن سپریم کورٹ میں داخل کر کے کہا کہ مساجد میں خواتین کو داخلہ کی اجازت نہ دیتے ہوئے ان سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے جو دستور کے آرٹیکل 14 اور 21 کی خلاف ورزی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کعبۃ اللہ میں ایک ساتھ طواف کر سکتے ہیں مگر مساجد میں نماز نہیں ادا کر سکتے جو آئین کی خلاف ورزی ہے۔ اس مسئلے پر سپریم کورٹ نے مسلم پرسنل لا سے اپنا موقف پیش کرنے کو کہا ہے۔ اس سے قبل کہ عدلیہ اس معاملے میں دخل دے مسلم پرسنل لا خود خواتین کے لئے مساجد میں ایسا انتظام کرنے کا عمل شروع کر دے جس سے اختلاط نہ ہو اور اختلاف بھی ختم ہو جائے۔۔

اسی طرح نقاب کا مسئلہ ہے، اسلامی شریعت کی رو سے چہرہ چھپانے کا حکم نہیں دیا گیا ہے 'جلباب' کا حکم ہے جسے ہم گھونگھٹ کہہ سکتے ہیں۔ جب بھی نقاب پر کوئی بات آتی ہے تو فتنہ پروروں کی طرف سے قومی تحفظ کی دہائی دی جاتی ہے، کیوں نہ ہم اس میں ان کا ساتھ دے کر ان ہی کی چال سے ان کو مات دے دیں، اس میں اسلامی شریعت پر کوئی ضرب نہیں آتی ہے بلکہ نقاب سے چہرے کو ڈھکنا محض تہذیبی وثقافتی مسئلہ ہے۔ اس کو اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ جہاں قومی تحفظ کا مسئلہ ہو چہرہ کھول لیا جائے اور جہاں ایسا نہ ہو تو مرضی کے مطابق ڈھکے رکھا جائے ان دونوں میں کوئی نہ تو قباحت ہے اور نہ ہی یہ شریعت اسلامیہ سے متصادم ہے۔

حلالہ، خواتین کا مساجد میں عدم داخلہ اور ان کو چہرہ ڈھانپنے پر مجبور کرنا اسلامی شریعت کے

عین مطابق نہیں ہے بلکہ حلالہ کا تعلق سماجی برائی اور اسلامی شریعت سے عدم واقفیت سے ہے جس میں غلطیکسی کی بھی ہومگر سزا عورت کو ملتی ہے جو اس کی عزت اور عزت نفس کے ساتھ کھلواڑ ہے جبکہ دوسرے اور تیسرے کا تعلق خواتین کے تحفظ سے ہے لیکن ایسا کرنا عین اسلام نہیں ہے ،اس لئے ہندستان میں بھگوائی فکر کے سیلاب میں اسلام اور مسلمانوں کو میڈیائی ٹرائل سے بچانے کے لئے جہاں ایک طرف خواتین کو چہرہ کھولنے کی اجازت اور خاص طور پر ان مواقع پر جس کو فتنہ پرور قومی سلامتی سے جوڑ کر دیکھتے ہیں اجازت دی جانی چاہئے وہیں دوسری جانب مساجد میں خواتین کیلئے الگ سے انتظام ہونا چاہئے جس سے ہمارے بچے مساجد تک جوانے والے بنیں۔ایسا کر کے کئی بڑے فتنوں کوٹالا جاسکتا ہے۔

# یہ جمہوریت نہیں آمریت ہے

کشمیر کو مرکز کے زیر انتظام لانے اور اس کی تقسیم کے پس پشت ملک وقوم کے مفاد کے بجائے زعفرانی ذہنیت، طاقت کا نشہ اور آمریت زیادہ کارفرما ہے، حالانکہ اس کو حب الوطنی میں لپیٹ کر پیش کیا گیا ہے تاکہ کوئی ان کے اس عمل کے خلاف آواز نہ بلند کر سکے۔ حب الوطنی کا غلاف کوئی پہلی بار نہیں چڑھایا گیا ہے بلکہ جب سے بھاجپا اقتدار میں آئی ہے اس نے اپنے سبھی مفادات پر یہی غلاف چڑھا دیا ہے۔ ملک کا ہر فرد یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ کشمیر ہندستان کا اٹوٹ حصہ ہے لیکن آمرانہ رویہ سے انصاف پسند طبقہ نہ صرف ناخوش ہے بلکہ ببانگ دہل حکومت کے موقف سے انحراف کر رہا ہے۔ اگر حکومت نے جمہوری طریقہ اختیار کیا ہوتا تو کشمیریوں کے ساتھ یقیناً ملک کا ہر طبقہ خوش ہوتا۔ یہ واحد ریاست نہیں تھی جسے خصوصی اختیارات حاصل تھے بلکہ اتراکھنڈ، سکم، میزورم، ناگالینڈ اور ہماچل پردیش وغیرہ بھی ہیں جن کو آج بھی اسی طرح کے خصوصی اختیارات حاصل ہیں لیکن ان ریاستوں کے ساتھ مرکز نے یہ سلوک نہیں کیا کیونکہ ان ریاستوں میں اس مسئلے سے بی جے پی کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے۔ وزیر داخلہ امیت شاہ نے جس طرح سے پارلیمنٹ میں شیاما پرساد مکھرجی کو خراج عقیدت پیش کیا اور بتایا کہ یہ ان کے خوابوں کی تعبیر ہے اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پس پشت کیسی ذہنیت کارفرما ہے۔

وزیر داخلہ کے مطابق دفعہ 370 اور 35 اے کے خاتمہ سے کشمیریوں کو حقیقی آزادی ملی ہے جس سے وہاں کے عوام خوش ہیں تو پھر کیا وہ یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ آخر فوج کی ٹکڑیاں وہاں کیوں بھیجی گئی ہیں؟ اگر یہ آزادی ہے تو پھر کشمیری عوام کی آنکھوں نے کیا گناہ کیا ہے جو ان کو اپنی آزادی دیکھنے تک کا حق نہیں؟ ان کو جشن منانے کے حق سے کیوں محروم کر دیا گیا ہے، کیوں ان کو گھروں میں محصور کر دیا گیا ہے؟ ملک کے عوام اگر خوش ہیں تو پھر وہاں کی گلیوں کی تصاویر کیوں جاری نہیں کی جاتی ہیں؟ دراصل آمرانہ رویہ ہے جمہوری تو قطعی نہیں ہے جس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے اور پوری دنیا میں ہندستان بدنام ہوگا جس کے ذمہ دار وزیر اعظم اور

وزیر داخلہ ہوں گے۔

مرکزی حکومت نے کشمیر کو اپنے زیر انتظام لے کر اور وہاں کی اسمبلی کو ختم کر کے بھگوا ٹولہ کو خوش کرنے کا کام کیا ہے کیونکہ کشمیری عوام تو بالکل خوش نہیں، جن کا یہ اصل مسئلہ ہے۔ 2014 پارلیمانی الیکشن کے انتخابی منشور میں بی جے پی دفعہ 370 اور 35 اے کو ہٹانے کا وعدہ کیا تھا، جسے اب پورا کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ بھاجپا کو اپنے وہ دوسرے وعدے یاد نہیں رہے جو اس نے نوجوانوں سے کئے تھے جن سے ملک وقوم کی ترقی وابستہ ہے، اس کو یہی وعدہ کیوں یاد رہا ؟ کشمیری پنڈتوں کی بازآبادکاری پر آج تک سرکار نے کوئی قدم نہیں اٹھایا لیکن کشمیر کو تقسیم کر کے اس نے ایک تیر سے دو شکار بلکہ کئی شکار کر لئے۔ مرکز جموں وکشمیر کو ایک ساتھ اپنے زیر انتظام لے سکتا تھا لیکن ایسی صورت میں ان لوگوں کو بھی بعض اوقات دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا جو اس کا ووٹ بینک ہیں، اس لئے لداخ کو الگ کر دیا تا کہ دونوں ریاستوں کی حد بندی کے بعد کشمیریوں کے ساتھ من مانا رویہ اختیار کیا جا سکے کیونکہ یہی اس کا مقصد بھی ہے۔ کئی بار آر ایس سے وابستہ بھاجپا لیڈر اعلان کر چکے ہیں کہ وہ آئین بدلنے آئے ہیں جس کی طرف اب انہوں نے قدم بڑھا دیا ہے، کشمیر کو اس لئے پہلا شکار بنایا ہے تا کہ حب الوطنی میں لپیٹ دیا جائے۔

اس قدم سے کشمیر میں امن وامان بالکل بحال نہیں ہوگا بلکہ اس سے خون خرابے میں اضافہ ہی ہوگا، کیونکہ وہ لوگ جو ہندستان کے حامی تھے اور کشمیری عوام کو ہندستان سے جوڑے رکھنے میں بھرپور تعاون کر سکتے تھے اب بھلا وہ کس منھ سے عوام کے درمیان جائیں گے۔ مرکز نے تو پیغام دے دیا کہ اگر کشمیری نہیں مانتے تو طاقت سے ان کی آواز دبا دی جائے گی ۔ نیویارک ٹائمس نے 6 اگست کے اپنے اداریے میں اسی بات کا خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ہندستان کے اس قدم سے کشمیر میں امن کے بجائے خون خرابے میں اضافہ ہوگا۔

جموں وکشمیر میں مرکز کے قوانین کا نفاذ وہاں کی اسمبلی کی منظوری کے بعد ہی نفاذ ہوتا تھا۔ یہ حق اس کو الحاق کے وقت ہی دے دیا گیا تھا، کشمیریوں کے اس حق کو مرکز نے نہ صرف سلب کیا

ہیجس کو معروف تاریخ داں عرفان حبیب نے اسے دھوکہ دہی سے تعبیر کیا ہے جبکہ رام چندر گوہا نے کہا کہ یہ جمہوریت نہیں آمریت ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے مل کر جو کھیل کھیلا ہے وہ آمریت ہی کا ہے۔سب سے پہلے ان دونوں لیڈران نے ملک وقوم کو گمراہ کیا کہ امرناتھ یاترا پر دہشت گردانہ حملے کے خطرات منڈلا رہے ہیں۔لیکن جب بلی تھیلے سے باہر آئی تو کشمیر کی تقسیم کا اس کے ساتھ پروانہ تھا۔

بھاجپا اور اسرائیل کے رشتے کبھی ڈھکے چھپے نہیں رہے ہیں اسرائیل نے جو عمل فلسطینیوں کے ساتھ کیا ہے وہی عمل دہرا کر کشمیر کو فلسطین بنانے کی راہ پر ڈال دیا گیا ہے،اسرائیلیوں کی طرح اڈانی اور امبانی اب زمینیں خرید کر ہوٹل اور ریزارٹ کے ذریعہ دولت کمائیں گے اور کشمیری ان کی غلامی پر مجبور ہوں گے،اسی لئے کشمیری نالاں ہیں۔وہ دن بعید نہیں جب نئے فلسطین سے بہنے والے خون سے ہندستان کی پیشانی رنگی ہوگی اور اس چہرے پر خون کی لکیریں اپنا درد بیان کر رہی ہوں گی

وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو یاد رکھنا چاہئے کہ طاقت کے زور پر حکومت نہیں کی جا سکتی ہے اس لئے اگر وہ کشمیر کو فلسطین بننے سے بچانا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ کشمیر ہندستان کا اٹوٹ حصہ رہے تو آمریت کو بالائے طاق رکھ کر کشمیری عوام سے گفت وشنید کریں۔ورنہ صرف کشمیری عوام ہی نہیں مریں گے بلکہ ہماری ماؤں کے وہ لال بھی آمریت کی بھینٹ چڑھ جائیں گے جو ملک وقوم کی حفاظت کی قسم کھا کر فوج میں بھرتی ہوتے ہیں،ان کی جانیں اتنی سستی نہیں ہیں کہ کسی آمر کے ایجنڈے کے نفاذ کے لئے ان کو قربان کر دیا جائے۔

# حب الوطنی کا منبع و مصدر ہے دارالعلوم دیوبند

یوں تو وطن سے محبت اسلامی تعلیمات میں داخل ہے لیکن اگر ہندستان کے پس منظر میں دیکھا جائے تو دارالعلوم دیوبند حب الوطنی کا منبع و مصدر بن کر سامنے آتا ہے۔ یہ صرف ایک عمارت یا مقام کا نہیں ہے بلکہ ہندستان کے ناخواندہ عوام کی رگوں میں حب الوطنی کو رگوں میں خون کی طرح بہایا ہے، یہ ایک صالح فکر کا نام ہے جو اپنے مذہب پر راسخ العقیدگی کے ساتھ کاربند ہونے کے ساتھ ہی حب الوطنی سکھاتا ہے۔ مسلمانوں اور خصوصا دیوبند سے پھوٹنے والے سوتے سے وابستگی رکھنے والوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ وہ شدت پسند ہوتے ہیں، بعض مرتبہ تو غیر تو غیر ہیں اپنوں نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ شدت پسندی کا دارالعلوم منبع و مصدر ہے اور اس فکر کے حامل افراد میں شدت ہوتی ہے لیکن وہ یہ نکتہ بھول گئے کہ دارالعلوم دیوبند اپنے عقیدے پر عمل میں راسخ بناتا ہے جو وحدانیت کا عقیدہ ہے، اسی طرح وہ اپنے آغوش میں پلنے والے نونہالوں کو وطن سے محبت کرنا سکھاتا ہے، ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ہی اسی بنا پر ڈالی گئی تھی کہ ہندستان میں اپنے عقیدے میں راسخیت کے ساتھ وطن کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانا ہے۔ تحریک ریشمی رومال آزادی کی اولین تحریکات میں سے ہے جس کے سرخیل مولانا محمود حسن دیوبندی تھے۔ 1915 میں یہ تحریک شروع کی گئی۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے کتنی راتیں ریگستان اور افغانستان کی پہاڑیوں میں گذار دیں تا کہ ہندستان کی آزادی کے لئے فوجی امداد مہیا کرا سکیں۔ چونکہ ریشمی کپڑے میں لکھے ہوئے تین خطوط انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اس لئے اس کا نام تحریک ریشمی رومال پڑا۔ یہ وہ تحریک ہے جس نے برادران وطن کو جد و جہد آزادی میں شرکت کی دعوت دی ورنہ اس سے قبل آزادی کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا تھا اور نہ ہی منظم طور پر اس کی کوشش شروع کی گئی تھی۔ تحریک ریشمی رومال کے منصوبے کے مطابق ہی مولانا عبیداللہ سندھی انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہوئے اور اس کے ساتھ مل کر آزادی کی راہیں ہموار کیں۔

تاریخ کے طالب علم اس تحریک کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ آج ان مجاہدین آزادی کا ذکر نہ تو ان نصابی کتابوں میں ہے۔جو بچوں کو پڑھائی جاتی ہےاور نہ ہی حکومت کی جانب سے کوئی ایسے انتظامات کئے گئے جس سے نئی نسل اپنے ان بزرگوں کی ملک کے لئے دی گئی قربانیوں سے واقف ہوسکیں۔اس میں صرف غیروں کی ریشہ دوانیوں کی کارفرمائیاں ہی نہیں رہی ہیں اپنے بھی کم مجرم نہیں ہیں۔مدارس کے نصاب میں بھی کوئی ایسی کتاب نہیں داخل ہے جس سے کم ازکم اپنے طلبا یہ جان سکیں کہ ہمارے بزرگوں نے ملک کے لئے کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔اپنے ذوق وشوق اور مطالعے سے طلبا اس طرح کی معلومات حاصل کرتے ہیں۔اس لئے جانب توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے متعلق غلط فہمیوں کا ہی نتیجہ تھا کہ سازشی افراد نے ضلع کلکٹر کے یہاں اس بات کی شکایت کی کہ دارالعلوم میں ایک عمارت پر ہیلی پیڈ تعمیر کیا جارہا ہے، بنیاد یہ بنائی گئی کہ دوکلومیٹر دور واقع فلائی اوور سے وہ تعمیر دکھائی دے رہی تھی جس پر ضلع کلکٹر اپنی پوری ٹیم کے ساتھ جانچ کے لئے دارالعلوم پہنچ گئےلیکن نتیجہ صفر نکلا کیونکہ وہاں توطرز قدیم کی طرح ملک کے نونہالوں کے لئے ایک کتب خانہ (لائبریری) کی تعمیر ہورہی تھی۔لیکن یہ تو طے ہوگیا کہ آج بھی دارلعلوم دیوبند ایسے سازشی افراد کے نشانے پر ہے جن کی آنکھوں میں یہ تعلیمی ادارہ کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔حالانکہ دارالعلوم نے یہ ثابت کردیا کہ وہ کسی بھی سرکاری ادارے سے کم محب وطن نہیں ہے۔جس طرح سرکاری اداروں میں جوش وخروش کے ساتھ یہ قومی تہوار منایا گیا اسی طرح دارالعلوم کے احاطے میں بھی یوم آزادی کی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ایک بات کی طرف اوراشارہ کرنا ضروری ہے کہ اخبارات میں دارالعلوم کی اس تقریب کو ان الفاظ میں شائع کیا گیا گویاوہاں پہلی باراس طرح کا پروگرام ہورہا ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ موسم اور بارش کی وجہ سے دو برس سے احاطے میں یہ پروگرام ممکن نہیں ہورہا تھا۔

کسی بھی ادارے سے متعلق محض سنی سنائی باتوں رائے نہیں قائم کرنا چاہئے کیونکہ ایسی باتیں

اس لئے بھی پھیلا دی جاتی ہیں تا کہ اس سے وابستہ افراد کو بدنام کیا جا سکے، اس لئے ضروری ہے کہ اس ادارے کی تاریخ اور روایت کا مطالعہ کیا جائے، وہاں عملی حرکتوں کا مشاہدہ کیا جائے اس کے بعد کوئی رائے قائم کی جائے۔ یہ معاملہ صرف دارلعلوم دیوبند سے متعلق ہی نہیں ہے بلکہ اگر آج ہم دیکھیں تو ہماری قومی میڈیا نے مدارس و مساجد اور مسلمانوں کو اپنی یک رخی رپورٹنگ کے ذریعہ مشتبہ بنا دیا ہے۔ سماج میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ اگر کسی کا تعلق مدرسے سے ہے تو وہ محب وطن نہیں ہوگا حالانکہ یہ خام خیالی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پورے ہندستان میں کسی ایک ایسے مدرسے کا وجود نہیں ہے جو وطن سے غداری سکھاتا ہو، کوئی ایک مسجد ایسی نہیں ہے جس میں یہ تقریر کی جاتی ہو کہ اپنے وطن سے محبت نہ کریں بلکہ ہر مدرسہ اور مسجد میں امن وامان کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کے باوجود مساجد و مدارس کو بدنام کیا جاتا ہے۔ جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہی وہ مقامات ہیں جہاں سے مسلمانوں کو مذہبی تعلیمات ملتی ہیں اور ان کو زندگی جینے کے درست راستے کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے، اس لئے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے ان کو بدنام کیا جاتا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ سماج میں کبھی بھی اور کہیں بھی کسی ہندو اور مسلم پڑوسی میں اس بات پر جھگڑا نہیں ہوتا کہ وہ مسلمان ہے، یعنی وہ پڑوسی کے طور پر تو ٹھیک ہوتا ہے لیکن ملک کے باشندے کے طور پر اس کو سماج میں ولن کی طرح دیکھا اور دکھایا جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ ذہنی سطح پر ان دونوں کو الگ الگ کر کے کرسی حاصل کی جائے۔ اس بات کو برادران وطن کو بھی سمجھنا ہوگا اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ذہنی کشمکش کبھی ختم نہیں ہو سکتی ہے۔

حال ہی میں لکھنؤ کے سفر میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، جب میں باہر نکلا تو اس کے محرابی دروازے پر ترنگا لہرا رہا تھا۔ حب الوطنی کی یہ کوئی چھوٹی دلیل نہیں ہے کیونکہ مساجد و معابد میں عموما اس طرح کے جھنڈے نہیں لگائے جاتے خواہ وہ کسی بھی مذہب کے ہوں لیکن ہندستانی مسلمانوں کی رگوں میں حب الوطنی خون کی بہہ رہی ہے اس لئے انہوں نے اس خاص

مقام کو بھی حب الوطنی کی علامت بنا دیا۔ یہ سبق ہمیں کسی اسکول یا کالج سے نہیں ملا ہے بلکہ یہ سبق دارالعلوم دیوبند اور اس سے پھوٹنے والے نور سے روشن ہونے والے مدارس سے ملی ہے۔ جہاں وطن سے محبت سکھائی جاتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی مسجد کا امام ان ہی مدارس سے فارغ التحصیل ہوتا ہے۔

ہندستان میں دارالعلوم دیوبند کو وہ مرکزیت حاصل ہے جو کسی بھی تعلیمی ادارے کو حاصل نہیں، اس ادارے کے بانیوں کے پیش نظر یہی تھا کہ یہاں کے عوام کو تعلیم سے لیس کیا جائے ان میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کیا جائے، ان کو بتایا جائے کہ وطن کو آزاد کرانا ہمارا فریضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اولین فارغین نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور حب الوطنی کی ایک ایسی شمع روشن کی جس نے پورے ملک کو نور کا ہالہ بنا دیا۔ یہ دارالعلوم دیوبند سے ملنے والی تعلیم کا ہی نتیجہ تھا کہ آزادی سے قبل مسلمانوں نے اس کے لئے جد وجہد کی اور آزادی کے بعد اسی کی مٹی میں مل جانے کا فیصلہ کیا۔ ہندستان میں رہنے اور بسنے والے مسلمانوں کو اس بات کا کوئی افسوس نہیں ہے کہ وہ آزادی کے بعد پاکستان کیوں نہیں گئے بلکہ ان کو فخر ہے کہ جس کی آزادی کے لئے ان کے بزرگوں نے جانیں دی تھیں ہم بھی مر کر، اسی کی مٹی میں سما کر، اس کا ذرہ بن کر چمکیں گے۔ ہم نہیں ہوں گے لیکن ہمارا یہ جسم اسی مٹی کا حصہ بن کر موجود رہے گا۔

# صدر راج کا خطرناک پہلو

جمہوریت وہ شجر سایہ دار ہے جس نے سب کو برابری کا حق دیا ہے، اسی لیے دنیا میں جمہوری طرز حکومت کو رواج اور قبول عام نصیب ہوا، ہم ہندوستانی بھی اسی شجر سایہ دار کے ثمر سے خود کو بہرہ مند کر رہے ہیں، جمہوریت میں عوام کی حکومت عوام کے لیے ہوتی ہے، چونکہ یہاں دو سطحی ریاستی/مرکزی حکومت ہے، اس لیے دونوں سطح کی حکومتوں کا انتخاب عوام کرتے ہیں، مرکزی حکومت کے انتخاب میں پورے ملک کے عوام کی شمولیت ہوتی ہے جبکہ ریاستی حکومت کے انتخاب میں صرف متعلقہ ریاست کے عوام ہی شامل ہوتے ہیں۔ یہ حکومت ریاستی عوام کی خواہشات کے مطابق تشکیک پاتی ہے اوران کی ضروریات کے مدنظر کام کرتی ہے، اس طرح ہر ریاست کے عوام کی اپنی الگ منتخبہ حکومت بھی ہوتی ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ریاست کے عوام کی منتخب حکومت کے بجائے ریاست میں کوئی دوسرا حکومت کرتا ہے، جو عوامی خواہشات کے مطابق نہیں ہوتا اسی کو اصطلاح میں ''صدر راج'' کہتے ہیں۔

ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک مثبت اور ایک منفی، صدر راج کا مثبت پہلو تو بہت اچھا ہے کہ جب ریاست میں آئینی بحران پیدا ہوجایے تو ریاست صدر جمہوریہ کے ماتحت ہوجاتی ہے کیونکہ وہی سپریم پاور ہوتا ہے لیکن اس کا منفی پہلو اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے کہ اس میں عوام کی رائے صفر ہوجاتی ہے۔

صدر راج میں اسمبلی معلق ہوجاتی ہے، منتخب مقننہ کا عمل دخل ختم ہوجاتا ہے، یعنی عوام کے منتخب کیے ہویے نمائندے بے دست و پا ہوجاتے ہیں اور ریاستی حکومت صدر مملکت کے زیر نگیں آجاتی ہے۔ ضابطے کے مطابق صدر راج میں گورنر کے ذریعہ ملک کا صدر جمہوریہ حکومتی انتظام و انصرام کرتا ہے، جس کے لیے گورنر مشیروں کی تقرری کرتا ہے اور وہی ریاستی سطح کے انتظام و انصرام کا سربراہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر اس کے مشورے سے قانون سازی بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، صدر راج میں حکومت صدر جمہوریہ کے

بجائے اس پارٹی کی ہوتی ہے جس کی حکومت مرکز میں ہو، چونکہ ریاست کا گورنر کسی بھی ریاست میں ہوتا تو صدر جمہوریہ کا نمایندہ ہے لیکن حقیقت میں وہ مرکزی حکومت کی سفارش پر بنایا گیا گورنر ہوتا ہے اس لیے مانا جاتا ہے کہ وہ وہ مرکزی حکومت کی گائڈ لائن کے مطابق ہی کام کرے گا۔ اور یہ اظہر من الشمس بھی ہے، بعض گورنروں پر مرکزی حکومت کے ایجنڈے کے نفاذ کے الزامات بھی لگائے جا چکے ہیں جن کا انہوں نے کوئی مسکت جواب بھی نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے وقتا فوقتا صدر راج کے نفاذ کی دفعہ 356 پر سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں، ماہرین کا ماننا ہے کہ مرکزی حکومتیں اس دفعہ کے ذریعہ اپنی بالادستی کا نہ صرف مظاہرہ کرتی رہی ہیں بلکہ ان کا استعمال بھی انہوں نے اپنے مطابق کیا ہے۔ واضح رہے کہ ملک کی متعدد ریاستوں میں اب تک 125 سے زیادہ مرتبہ صدر راج کا نفاذ ہو چکا ہے۔ صدر راج پر ماہرین کے سوالات اور ان کا یہ کہنا کہ گورنر کے پردے میں مرکز حکومت کرتا ہے یا پھر گورنر پر ہی سوال اٹھانا یونہی نہیں ہے اس کی ایک مثال مہاراشٹر آپ کے سامنے ہے۔

مہاراشٹر کے گورنر بھگت سنگھ کو یاری کی سفارش پر وہاں صدر راج نافذ ہو گیا ہے۔ جن پر غیر بھاجپائی لیڈروں نے متعدد الزامات عائد کیے ہیں، ان کا یک بھی کہنا ہے کہ مرکز کے ایجنڈے کو وہ مہاراشٹر میں نافذ کر رہے ہیں، چونکہ مرکز میں بھاجپا کی حکومت ہے اور وہ بھاجپا مہاراشٹر میں حکومت سازی کی پوزیشن میں نہیں ہے ایسے میں گورنر نے کسی دوسری پارٹی کو حکومت سازی کا مناسب موقع نہیں دیا۔ ان پر جانبداری کا بھی الزام ہے کہ بھاجپا کو 48 گھنٹے دیے، شیوسینا کو 24 اور این سی پی کو دیا گیا وقت پورا ہونے سے پہلے ہی انہوں نے صدر راج کی سفارش کر دی دوسری طرف مرکز کی بھاجپا کو موقع مل گیا اور اس نے بغیر وقت گنوائے میٹنگ کر کے صدر جمہوریہ سے سفارش کر دی اور وہاں صدر راج نافذ ہو گیا۔ جس سے وہاں کے عوام کی رائے صفر ہو گئی جبکہ جمہوریت میں اسی کی رائے سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے اور وہ پارٹی پردے کے پیچھے سے حکومت میں آ گئی جس کو عوام نے موقع ہی نہیں دیا اس طرح صدر راج کے نفاذ کا سب سے

خطرناک پہلو یہ سامنے آیا کہ مرکز میں حکومت کرنے والی پارٹی اگرچہ اس متعلقہ ریاست میں کامیاب نہیں ہوئی تب بھی اپنا سکہ چلا سکتی ہے۔ دفعہ 356 کے تحت ہر چھ ماہ بعد، چھ ماہ کی مدت کی توسیع کی جا سکتی ہے، اس طرح تین برس تک صدر راج کے ذریعہ مرکز اس ریاست کو اپنے ماتحت رکھ سکتی ہے، ایسے عوام کے ان جذبات کا کیا ہوگا جن کے تحت انہوں نے ووٹنگ کی تھی اور خواب دیکھے تھے کہ ان کی اپنی منتخب کردہ حکومت ہوگی۔ ایک طرف مثبت پہلو کے تحت تو اس دفعہ کے فوائد انتظامی سطح تک ہیں اس سے ریاست میں بدنظمی اور انارکی نہیں پھیلتی لیکن دوسری طرف اس کا نقصان یہ ہے کہ جمہوریت کی روح ہی کچل جاتی ہے، اس لیے اس کو بہتر قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ ایک جمہوری حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے آخری درجے میں صدر راج کے نفاذ کی سفارش کرے اور جتنی جلد ہو سکے ریاست کو اس سے باہر نکال کر عوام کو ان کی امیدوں اور امنگوں کے مطابق ان کے منتخب کردہ افراد کو حکومت کا موقع دے کیونکہ وہی اس کے جذبات کا خیال رکھ ان کی ضروریات کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہمہ جہت شخصیت سازی

ہر ادارے کی اپنی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، جن کی بنیاد پر وہ دنیا میں جانا جاتا ہے، یہ خصوصیات کئی سطح پر ہو سکتی ہیں مثلاً کسی خاص موضوع میں مہارت، کسی خاص شعبے کا بہت اچھا ہونا، کسی خاص کورس کے ماہر اساتذہ کا پایا جانا وغیرہ۔ یوں تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شہرت کے کئی حوالے ہیں لیکن ثقافتی سطح پر جو درجہ اس یونیورسٹی کو حاصل ہے وہ کسی دوسری یونیورسٹی کو نہیں، یہ قدیم وجدید کا سنگم ہے، یہاں جہاں آپ کو قدیم تہذیب کے شیدائی قدم قدم پر ملیں گے جو ہماری شاندار ماضی کے امین ہیں وہیں جدید تہذیب کے خوشہ چیں بھی آپ کو ہر گام پر دکھائی دیں گے جو اس بات کی علامت ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جہاں تہذیبی جڑیں اپنے ماضی میں پیوست ہیں وہیں اس کی شاخیں نئے آسمان کو بھی چھو رہی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے طلبا کی ہمہ جہت صلاحیتوں کے فروغ کے لئے ''کلچرل ایجوکیشن سینٹر'' قائم کر رکھا ہے ، جہاں ان کو جدید تقاضوں کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، پہلے یہ جنرل ایجوکیشن سینٹر کے نام سے معروف تھا لیکن اعلی تعلیم میں فنڈنگ کے لئے قائم سرکاری ایجنسی یو.جی سی سے جی ای سی کو منظوری نہیں مل سکتی تھی اس لئے اس کا نام بدل کر سی ای سی کرنا پڑا۔ اس ادارے کے تحت کئی کلب قائم ہیں جہاں طلبا اپنی اپنی پسند کے مطابق داخلے لے کر درس وتدریس سے کچھ الگ سیکھتے ہیں جس کے لئے باقاعدہ اساتذہ کا انتظام ہے۔ سی ای سی کے تحت ڈراما کلب، فلم کلب، فائن آرٹ کلب، فیشن میوزک کلب ، ہندستانی میوزک کلب ،لٹریری کلب، ویسٹرن میوزک کلب اور ایکو کلب جیسے کلب قائم ہیں۔ ان کے ناموں سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کلب ہمہ جہت صلاحیتوں میں نکھار کے لئے کتنے اہم ہیں۔

کلچرل ایجوکیشن سینٹر کا قیام 1964 میں عمل میں آیا تھا جس میں پروفیسر مونس رضا اور پروفیسر اے کے نظامی نے اہم کردار ادا کیا تھا، دراصل یہ سینٹر اس لئے قائم کیا گیا تھا تاکہ طلبا کو ان کے سبجیکٹ اور موضوعات سے الگ بھی تعلیم دی جا سکے اور وہ کسی بھی شعبے میں پیچھے نہ

رہیں۔ بحث ومباحثہ، تقریری مقابلے کے ساتھ متعدد شارٹ ایوننگ کورسیز اس تحت چلتے ہیں ،جن کے ذریعہ طلباوطالبات دیر رات تک یہاں سیکھتے سکھاتے ہیں۔ ڈاکٹر ایف ایس شیرانی اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی جیسے نابغہ اس کے سربراہ رہ چکے ہیں اس وقت اس کے سرابراہ پروفیسر سراج اجملی ہیں جوایک معروف شاعر بھی ہیں۔

کلچرل ایجوکیشن سینٹر کے ذریعہ جہاں ایک طرف مغربی موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے تو وہیں دوسری جانب ہندستانی موسیقی کے تحفظ اوراس لے فروغ کے لیے ہندستانی میوزک کلب بھی قائم ہے،اس طرح ثقافتی فروغ کے اس مرکز نے تہذیبی توازن کو برقرار رکھا ہے۔آج کی تیز رفتار دنیا میں ڈراما اپنی اہمیت کھوجا تا رہا ہے، سنجیدہ ناظرین ہی ڈرامے جیسی ثروت مند صنف کو پسند کرتے ہیں لیکن سی ای سی میں باقاعدہ اس کے لئے ایک کلب قائم ہے تا کہ اس صنف کو نہ صرف بچایا جاسکے بلکہ عملی سطح پر بچوں می اس سے دلچسپی پیدا کیا جائے اوران کواس صنف کی جانب راغب کیا جائے۔

جدید دور کی ضروریات کے لئے فلم کلب بھی قائم ہیں، جہاں طلبا کو فلم کی باریکیوں سے آگاہ کیا جاتا ہے ان کو بتایا جاتا ہے کہ فلم کیسے بنتی ہے،اس کے موضوعات کے انتخاب میں کس طرح کی باتوں کا خیال رکھا جانا چاہئے ،اسکرین پلےاور مکالمے کیسے لکھے جاتے ہیں، فلم کی شوٹنگ اور اس کی ایڈیٹنگ کیسے کی جاتی ہے۔ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی اس وقت فلم کلب کے سربراہ ہیں، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سو برس پورے ہونے پر ایک ڈاکیومنٹری فلم بنا رہے ہیں جس کے ذریعہ یونیورسٹی کے سوسالہ سفر کے ساتھ ہی محمڈن اینگلو عربک کالج کو بھی عوام کے سامنے پیش کریں گے۔اسی طرح سے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور کی سربراہی اور شعبہ رابطہ عامہ کے چیئر مین پروفیسر شافع قدوائی کی نگرانی میں یونیورسٹی کی حصولیابیوں پر بھی ایک فلم بنائی جارہی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وہ ادارہ ہے جس نے بڑے بڑے فلم رائٹر اورا یکٹر دیئے ہیں۔خواجہ احمد عباس نہ صرف فلم رائٹر تھے بلکہ وہ فلم کریٹک بھی تھے،جن کی رائے کی بڑی اہمیت تھی،ان ہی

جیسے فلم کریٹک کی رہنمائی میں ہندستانی سینما آج یہاں تک پہنچ سکا ہے،سعادت حسن منٹواور عصمت چغتائی نے بھی اچھی فلمیں لکھیں اور فلم فیئر ایوارڈ جیتے،نصیرالدین شاہ سے کون واقف نہیں ہے،ان کا تعلق بی اسی یونیورسٹی سے رہا ہے،جاوید اختر اس وقت فلمی دنیا کا بڑا نام ہے جونغمہ نگار ہونے کے ساتھ ہی اسکرپٹ رائٹر بھی ہیں ،راہی معصوم رضا نے بھی اسکرپٹ لکھی مہابھارت جیسا سیریل ان کا ہی لکھا ہوا ہے، پروفیسر شہر یار کے امراؤ جان کے نغمے بھلا کون بھول سکتا ہے،انہوں نے گمن کے لئے بھی نغمے لکھے ۔دلیپ تاہل اور حبیب تنویر فلم اور ڈرامے کی دنیا کے بہت بڑے نام ہیں ان کا تعلق بھی اسی یونیورسٹی سے تھا۔فنون لطیفہ میں فائن آرٹ اور کلے آرٹ کی بڑی اہمیت ہے، فائن آرٹ کا تو پورا ایک شعبہ ہی ہے لیکن ہندستانی صنمیاتی فن کا تحفظ کلے آرٹ/ اسکلپچر کلب کے ذریعہ کیا جارہا ہے۔

سی ای سی کے تحت ایکو کلب ماحولیات سے متعلق بیداری کے لئے قائم کیا گیا ہے،آج کے دور میں سب سے زیادہ ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ درپیش ہے جس میں صوتی اور آبی آلودگی بھی شامل ہے،اس کلب کا کام ہی یہ ہے کہ طلبا کو وہ بتائے کہ ہم انسانی دنیا کے لئے فضا کو کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں،جس کے لئے طرح طرح سے نہ صرف بیداری پروگرام چلائے جاتے ہیں بلکہ طلبا کو سکھایا جاتا ہے کہ ان کو عوام کو کیسے بیدار کرنا اور آلودگی کے پھیلنے سے کیسے ان کو روکنا ہے یہ اپنی نوعیت کا واحد کلب ہے جو ہمارے ایکو سسٹم کو بچانے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

سائنس،جغرافیہ اور دیگر شعبہ جات کے بچوں کے لئے لٹریری کلب ہے تاکہ ان میں بھی ادبی اور فنی بیداری پیدا ہو،وہ بھی فنون لطیفہ کے ذریعہ نہ صرف لطف اندوز ہوسکیں بلکہ وہ فنون لطیفہ کے تحفظ میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔اس طرح اگر دیکھا جائے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے روز بروز اپنا دائرہ وسیع کیا اور طلبا وطالبات کو کو ہر طرح کے موضوعات سے واقف کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں یہ سینٹر عمومی سطح پر کام کرتا ہے جب کہ ہر ہاسٹل میں ایک لٹریری سوسائٹی ہوتی ہے جو اپنے یہاں رہنے والے طلبا و طالبات میں فنون لطیفہ

سے متعلق کام کرتی ہے اور سالانہ انعامی تقریبات کا اہتمام کرتی ہے، ہوسکتا ہے دیکھنے میں اس طرح کی چیزیں چھوٹی محسوس ہوتی ہوں لیکن حقیقت میں یہی سب اس ادارے کو دوسرے اداروں سے ممتاز کرتی ہیں کیونکہ دوسرے اداروں میں صرف درس وتدریس کو ہی اہمیت دی جاتی ہے جبکہ علی گڑھ مسلم یویورسٹی میں تہذیب وثقافت کے ساتھ ہی صرف اپنے گرد وپیش سے باخبری ہی نہیں سکھائی جاتی ہے بلکہ ہمہ جہت شخصیت کی تشکیل کی جاتی ہے۔طبیہ کالج کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد ڈار پیشہ سے استاد اور طب یونانی کے ڈاکٹر ہیں لیکن وہ فلم کے بارے میں نہ صرف ماہرانہ رائے رکھتے ہیں بلکہ عملی سطح پر اس سے وابستہ بھی رہتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنے طلبا کو کسی ایک سبجیکٹ میں قید نہیں رکھتی ہے بلکہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ یہاں کے طلبا ہرفن مولا اور ہر سبجیکٹ میں ماہر ہوں۔یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم ضرورت کے مطابق خود کو ڈھال لیتا ہے اور سماج کے کے لئے دوسروں سے زیادہ مفید بن جاتا ہے۔

آج جدید ہندوستان کا ایک ایسا خواب دکھایا جا رہا ہے جس میں سب کے لیے جگہ نہیں ہے بلکہ پورے ملک، سماج، علاقوں اور آبادیوں کو خانوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اور افسوس اس بات پر ہے کہ اس کا نام ہم جمہوریت بتاتے ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ جمہوریت کا مطلب آج کچھ اور ہو گیا ہے۔ جسے آج کا صحافی بہت کم محسوس کر رہا ہے اور خاص طور پر میڈیا کا ایک بڑا طبقہ مذکورہ نظریات کے سلسلے میں بغلیں بجا رہا ہے۔ ایسے ماحول میں نوجوان صحافی اور افسانہ نگار محمد حنیف خاں کی حسیت بغاوت کر جاتی ہے اور وہ جمہوریت کے اصلی معنی عوام کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج ملک کا ذرائع ابلاغ خصوصاً اردو میڈیا جن باتوں کو اپنا موضوع بناتا ہے حنیف خاں اس لیک سے ہٹ کر ایک وسیع ترافق کی تلاش میں نئی راہ نکالنے کی کوشش میں سرکردہ نظر آتے ہیں۔ کسی بھی جمہوری ملک میں پہلا حق شہریوں کو ان کی تعلیم، صحت اور پیٹ بھر روٹی کا ہوتا ہے۔ ہمارے بوسیدہ اور سڑے گلے روایتی تعلیمی نظام اور سرکار کی غیر منصفانہ پالیسیوں کے خلاف محمد حنیف خاں کے قلم سے بڑے کڑوے کسیلے جملے نکلتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حنیف خاں کسی بغاوت کے علمبردار ہیں لیکن ان کا قلم سچائی سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ وہ صحافت کے قدیم روایات کو توڑ کر جدید دنیا کی ڈگر پر سماج کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ بہرحال صحافت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں حنیف خاں نے ایک کنکری پھینکی ہے جس سے اتنی لہریں اٹھ رہی ہیں جن میں کوئی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے اور یہی نوجوان صحافی کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی میں ان کی اس کاوش کے لیے مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ......... اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

**قطب اللہ**

سابق ریزیڈنٹ انچارج روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو (لکھنؤ، گورکھپور، پٹنہ، کلکتہ)
چیف ایڈیٹر روزنامہ عوامی سالار، سابق چیف سب ایڈیٹر روزنامہ قومی آواز

صحافت کا مقصد انسانی معاشرے کو زندگی کے حقائق سے روبرو کرانا ہے۔ آج کل صحافت اپنے اس فریضے سے منحرف ہوتی نظر آ رہی ہے۔ صحافی خود کو بھی صحافت نگاری میں جذباتی طور پر شامل کرتے نظر آ رہے ہیں خصوصاً نوجوان صحافی اس برائی سے اپنا دامن بچانے میں قاصر نظر آ رہے ہیں لیکن مقام شکر ہے کہ کچھ جواں سال صحافی بڑی ایمانداری سے فریضہ صحافت انجام دے رہے ہیں، انھی نوجوان صحافیوں میں محمد حنیف خان نمایاں ہیں، یہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے ملک کے اہم اخبارات میں کالم نویسی کے ذریعے انسانی معاشرے کو باخبر کرانے کے ساتھ مستقبل کا لائحہ پیش کرنے کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں۔ میں بارگاہ خداوندی میں ملتجی ہوں کہ ان کا قلم اسی توانائی سے اپنا فریضہ انجام دیتا رہے۔ میں نئی کتاب ''خاموشی جرم ہے'' کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''مجسموں کا شہر'' کی طرح سیاسی وسماجی مضامین پر مشتمل اس مجموعے کی بھی پذیرائی ہوگی۔

**ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی**

ایڈیٹر روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ

# KHAMOSHI JURM HAI

by

**Mohd. Haneef Khan**

صحافت آسان نہیں، اورسب کے بس کا روگ بھی نہیں۔ جب آپ صحافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں، آپ کو سیاسی پارٹی، مذہب، اخلاق سے بلند ہو کر صرف ضمیر کی آواز کو سننا ہوتا ہے۔ صحافت کٹنگ پیسٹنگ نہیں۔ صحافت میں مذہب کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے، رام ناتھ گوئنکا جب زندہ تھے، ایک مرکزی وزیر نے ان سے ایک صحافی کی تعریف کی، جوان کے اخبار کا ایک اہم حصہ تھا۔ گوئنکا نے فوری طور پر اس صحافی کو نکال باہر کیا کیونکہ صحافی سسٹم کے خلاف ہوتا ہے۔ کوئی وزیر اس کی تعریف کیسے کر سکتا ہے؟ اب حالات تبدیل ہو چکے ہیں، موجودہ صحافت کو گودی میڈیا کہا جاتا ہے۔ 2019 میں سہارا اردو کا گروپ ایڈیٹر تھا، مجھے ایسے نوجوانوں کی ضرورت تھی، جو معیاری صحافت کی مثال بن سکیں۔ میری توجہ کا مرکز حنیف خان تھے، جوان دنوں عمدہ کہانیاں لکھ رہے تھے اور بین الاقوامی سیاست کی اچھی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ سہارا میں محمد حنیف خاں کا کالم شایع ہونے لگا۔ اب ایک برس گزر چکے ہیں۔ کالم نگار صحافی کی حیثیت سے وہ اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں، لیکن یہ راستہ پر خطر ہے۔ اب قدم قدم پر آزمائشیں ہیں۔ خشونت سنگھ سے لے کر رویش کمار تک ان کی تیاری ایک آئیڈیل بننے کی ہونی چاہیے۔ ایک ایسا صحافی جو آگ کے شعلوں، بارود کے طوفان اور سیاست کی سنامی سے گزر جانے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ جو حقیقت بیانی سے پیچھے نہ ہٹتا ہو، جو بے خوف وخطر سچ بولنے کی جرات رکھتا ہو۔ مجھے یقین ہے، محمد حنیف خان میں یہ اوصاف موجود ہیں۔ وہ آنے والے وقت میں بھی ان باتوں کا خیال رکھیں گے۔ میں ان کی نئی کتاب کے لئے ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

**مشرف عالم ذوقی**

**EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE**
New Delhi , INDIA
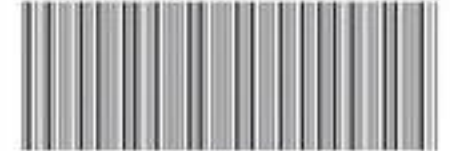
ISBN 978-93-90100-45-3
978-93-90100-45-3
www.ephbooks.com